پریم چند کی آپ بیتی

مدن گوپال

www.taemeernews.com

''میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے۔ جس میں کہیں کہیں گڈھے تو ہیں لیکن ٹیلوں، پہاڑوں، گہری گھاٹیوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہو انھیں یہاں مایوسی ہوگی۔
تاریخ پیدائش سمبت ۱۹۳۷، باپ کا نام منشی عجائب لال، سکونت موضع مڑھوا لمہی، متصل پانڈے پور، بنارس۔ والد ڈاک خانہ میں کلرک تھے۔ والد کا انتقال پندرہ سال کی عمر میں ہو گیا۔ والدہ ساتویں سال گزر چکی تھیں۔ بچپن کے تاثرات معمولی نوعیت کے ہیں۔ نہ زیادہ خوشگوار نہ زیادہ دلشکن۔''

پریم چند کی آپ بیتی

تحقیق و تدوین: مدن گوپال

www.taemeernews.com

Modern Publishing House
9, Gola Market, Darya Ganj.
New Delhi-110002
Phone: 011-3278869

PREM CHAND KI AAP BITI (Biography)

Arranged & Compiled By :- Madan Gopal

Rs. 200 /- **September, 2001**

www.taemeernews.com

پریم چند کی آپ بیتی

تحقیق وتدوین:
مدن گوپال

ناشر
موڈرن پبلشنگ هاؤس
۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
فون:011-3278869

www.taemeernews.com

پہلی اشاعت : ستمبر ۲۰۰۱ء
قیمت : دوسو روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق : وجے گرافکس، نئی دہلی
مطبع : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متّل

ناشر:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

www.taemeernews.com

حرفِ چند

پریم چند کی آپ بیتی منشی پریم چند کی حیات وفن اور ان کے زمانے کی کہانی ہے۔ یہ ان کے ہی لفظوں میں ان کی داستانِ حیات ہے۔ اس کی بنیاد ان کا ایک مضمون ہے جو اُن کے ہندی ماہنامہ ''ہنس'' میں فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ان کی زندگی کے پچاس سالوں کی تفصیل دیتا ہے۔ وفات کے آٹھ دس سال پہلے پریم چند نے کچھ مضامین یا افسانہ لکھے۔ جیسے ''قزاقی''، ''رام لیلا''، ''گلی ڈنڈا''، ''لاٹری'' جس کے وہ خود کردار ہیں، اس کی تائید خود محترم پریم چند کی بیگم شریمتی شورانی دیوی نے اپنی کتاب ''پریم چند گھر میں'' میں کی ہے۔

آخری دَور میں پریم چند کے بہت نزدیکی دوست ادیب، جینند رکمار نے لکھا ہے:
''پریم چند نے خود اپنے بارے میں ایک بڑی دلچسپ سرگذشت سنائی۔ ایک دبنگ نوجوان نے کس طرح انھیں ٹھگا اور کتنی آسانی سے وہ اس کی ٹھگائی میں آتے رہے۔ اس چالاک نوجوان نے انھیں ایسا مونڈا کہ کہنے کی بات نہیں۔ سیدھے سادے پریم چند کی کمائی کی بنا پر انھیں کی آنکھوں کے نیچے اس نوجوان نے ایسے عیش کیے کہ آنکھ کھلنے پر خود پریم چند یقین نہیں کر سکے تھے۔ پریم چند سے اس نے اپنی شادی کرائی۔ بیوی کے لیے زیور اور کپڑے لتے بنوائے ـــــ اور پریم چند سیدھے طور پر سب کچھ کرتے گئے: ''بھئی جینند ر صراف کو ابھی پیسے دینے باقی ہیں۔ اس نے سونے کی چوڑیاں بہو کے لیے دلائی تھیں، ان کا پتہ تو میری بیوی کو بھی نہیں ہے۔ اب پتہ دے کر اپنی شامت مول لینا ہے، مگر دیکھو؛ جینند ر وہ سب فریب تھا۔ وہ لڑکا ٹھگ نکلا۔ اب یوں ہی دیکھ لو، کہانیوں کے پیسے آتے ہیں، اس سے صراف کا دینا چکتا کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا کہیں گھر میں نہ کہہ دینا، مفت کی آفت مول لینی ہوگی، بے وقوف بنے تو بے وقوفی کی سزا بھی ہمیں

www.taemeernews.com

بھرنا ہے۔"

پریم چند کی یہ داستان ادب میں ایک نئی طرح کی کتاب ہے۔اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔لگ بھگ چالیس برس پہلے میں نے جواہر لال نہرو کے مختلف مضامین اور ان کے بیانات کی بنیاد پر ان کی ایک سوانح عمری تیار کی تھی۔۱۹۷۲ء میں اندرا گاندھی نے اس کی اشاعت پر روک لگادی۔دس سال بعد میں نے سبھاش چندر بوس کی لکھی تین کتابوں اور ان کی تقریروں اور پھر "آرڈر آف دے ڈے" کی بنیاد پر ان کی سوانح عمری کی طرح کی کتاب تیار کی، یہ بہت مقبول ہوئی۔پھر میں نے پریم چند کی ۱۰۰ ویں سالگرہ پر سوچا پریم چند کی سوانح عمری کیوں نہ تیار کی جائے۔مصروفیات کی وجہ سے یہ کام آگے نہیں بڑھا۔وقت ملا تو میں نے ہندی میں یہ کتاب تیار کی، یہ شائع ہوئی۔اس میں میں نے پریم چند کے مضامین یا افسانوں کی شکل میں پیش کی گئی یادداشتوں یا خطوط کے اقتباس کو اس طرح سے ایک مالا میں پرودیا ہے کہ "پریم چند کی آپ بیتی" بن گئی ہے۔

—— مدن گوپال

www.taemeernews.com

پیش گفتار

شری مدن گوپال ادبیات پریم چند کے پہلے باقاعدہ محقق ہیں۔ اُنھوں نے پریم چند کو انگریزی کے علمی وادبی حلقوں سے متعارف کرانے کے لیے پہلے ایک سو صفحے کا کتابچہ ۱۹۴۴ء میں شائع کرایا، پھر انگریزی ہی میں ایک ضخیم کتاب تصنیف فرمائی۔ اس میں اُنھوں نے پریم چند کی مشہور کہانیوں اور ناولوں کی تلخیص بھی پیش کی تاکہ انگریزی داں حلقوں کو پریم چند کے جوہر سے بھی رُوشناس کرایا جاسکے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پریم چند پر اُن کی اِس کاوش کا انگریزی کے ملکی وغیر ملکی علمی اور ادبی حلقوں میں ان کی اُمید وں سے بڑھ کر خیر مقدم کیا گیا۔ ہندی میں پریم چند کی زندگی اور ادب پر ان کی تحقیقی کتاب ''قلم کا مزدور پریم چند'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوکر مقبولِ عام ہوئی۔

پریم چند میں دلچسپی رکھنے والے اُردو کے محققین وقارئین کے لیے مدن گوپال صاحب کا نام غیر مانوس نہیں ہے۔ اُردو میں ان کی دو کتابیں ''قلم کا مزدور پریم چند'' (مئی ۱۹۶۶ء) اور ''پریم چند کے خطوط'' (جون ۱۹۶۸ء) میں شائع ہوئیں اور مدن گوپال صاحب نے اُردو کے علمی وادبی حلقوں میں بھی شہرت اور ناموری حاصل کی۔

پریم چند کی تحقیق میں مدن گوپال صاحب کو دلچسپی کیسے پیدا ہوئی — ؟ ۱۹۳۸ء میں گریجویشن کے امتحان کے بعد دو سال کی بیکاری کے زمانے میں دہلی یونیورسٹی اور برلا اسکول لائبریری میں اُردو اور ہندی کا سارا ادب پڑھ ڈالا۔ پھر اُنھوں نے مختلف ادبا اور مشاہیر کے نام لکھے گئے پریم چند کے خطوط جمع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اِن خطوط کو حاصل کرکے یکجا کرنے کا معاملہ ایک ٹیڑھی کھیر تھی، لیکن مدن گوپال صاحب نے اپنی مختلف ملازمتوں اور علمی وادبی مصروفیات کے دوران وقت نکال کر دُور دراز کے سفر کیے اور مختلف مکتوب الیہ حضرات سے مل کر اصل خطوط یا اُن کی نقلیں حاصل کرکے اُنھیں سلسلہ وار مرتب کیا۔ اِن خطوط کو حاصل کرنے میں انھیں کیا کیا دُشواریاں پیش آئیں یہ ایک طویل قصہ ہے جو دلچسپ بھی ہے اور عبرتناک

www.taemeernews.com

بھی۔تاہم یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔بہر حال اگر یہ خطوط شائع نہ ہوئے ہوتے تو پریم چند کی زندگی اور ادب کے کئی اہم مقامات پر ہمیشہ سوالیہ نشان لگے رہتے اور پریم چند کے محقق غلط نتیجے اخذ کرتے رہتے۔

لگ بھگ بیس برس پہلے پریم چند پر تحقیقی کام شروع کرنے سے پیشتر اُردو کے ادبی حلقوں میں مجھے بطور ایک افسانہ نگار تھوڑی بہت مقبولیت حاصل تھی۔میں نے جب پریم چند پر تحقیق کا کام شروع کیا تو اُردو، ہندی کے محققوں کی کتابوں کے ساتھ مدن گوپال صاحب کی کتابیں بھی میرے پیشِ نظر تھیں۔بعض اہم مقامات پر کچھ شکوک نے سر اُبھارا تو میں نے مدن گوپال صاحب سے بھی رجوع کیا۔اُنھوں نے بڑی شفقت سے میرے ہر سوال کا جواب تفصیل سے دیا۔

مدن گوپال صاحب کی زندگی بھی پریم چند کی طرح شہد کی مکھی کی مانند ہمہ تن مصروف زندگی ہے۔پریم چند پر تحقیقی کتابوں کے علاوہ موصوف کی دیگر گوناگوں موضوعات پر لگ بھگ ساٹھ کتابیں انگریزی، ہندی اور اُردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

شری مدن گوپال کی پیدائش ایک برگزیدہ برہمن خاندان میں (غیر منقسم پنجاب اور موجودہ ہریانہ) کے ایک چھوٹے سے شہر ہانسی میں (اُن کی جنم پتری کے مطابق) ۶/اکتوبر ۱۹۱۷ء کے روز ہوئی۔اُن کے والد پٹواری تھے۔نوکری کے سلسلے میں اُن کا تبادلہ مختلف جگہوں پر ہوتا رہتا تھا۔ہر جگہ بچّوں کو ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔مدن گوپال صاحب کی صغرسنی ہی میں اُن کی والدہ داغِ مفارقت دے گئیں۔چنانچہ بچپن ہی سے اُنھیں جدّوجہد کی زندگی گزارنا پڑی۔مڈل پاس کرتے کرتے اُن کے والد بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور وہ بمشکل گریجویشن کر سکے۔دو سال کی بیکاری کے بعد مختلف ملازمتوں کی مصروفیات کے باوجود وہ علمی اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔اس کبرسنی کے زمانے میں بھی وہ علم وادب کی خدمات میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کی طرف سے اُنھیں ''کلیاتِ پریم چند'' مرتب کرنے کا کام تفویض کیا گیا تھا۔موصوف نے بائیس جلدوں میں پریم چند کی مختلف تحریروں، کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں کو اپنے عالمانہ مقدموں کے ساتھ مرتب کر کے اُنھیں کونسل کو سونپ دیا ہے۔کونسل نے اُنھیں شائع کرنے کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔کچھ کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں، باقی کتابیں اشاعت کے مختلف مرحلوں سے گزر رہی ہیں۔

پریم چند نے اپنی سوانح حیات نہیں لکھی تھی، البتہ ماہنامہ ''ہنس'' کے ''آتم کتھا نمبر''

www.taemeernews.com

(۱۹۳۲ء) میں اُنھوں نے اپنی کشمکشِ حیات کی کچھ جھلکیاں اپنے مضمون ''جیون سار'' میں پیش کی تھیں۔

مدن گوپال صاحب نے ایک جدّت پیدا کر کے پریم چند کی ''خودنوشت سوانح'' ہندی میں ''پریم چند کی آتم کتھا'' کے نام سے ۲۰۰۰ء میں شائع کرائی — پریم چند کی بہت سی کہانیوں اور ناولوں میں اُن کے بچپن سے لے کر آخری عمر تک کے واقعات کی کہیں نہ کہیں جھلکیاں ملتی ہیں۔ اُن کے خطوط میں بھی اُن کی زندگی سے وابستہ بہت سے حالات و حادثات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی شریکۂ حیات شریمتی شورانی دیوی کی کتاب ''پریم چند گھر میں'' میں بھی کچھ ایسے واقعات ملتے ہیں جن کا عام قاری کو قطعی علم نہیں تھا۔

شری مدن گوپال نے ان بھی واقعات و حقائق کو شروع سے آخر تک سلسلہ وار ایک کڑی میں پرو کر پریم چند کی آتم کتھا یعنی خودنوشت تیار کی ہے۔ اس کتاب کی ہندی میں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔ اب وہ پریم چند کی اس خودنوشت سوانح کو اُردو میں پیش کرنے جا رہے ہیں اور میں اُمید کرتا ہوں کہ اُردو میں بھی اس کا اسی طرح سواگت ہوگا جس طرح ہندی میں ہوا ہے۔

—— مانک ٹالا

O

میری بچپن کی یادداشتوں میں قزاقی ایک نہ فراموش ہونے والا شخص ہے۔ تیس برس گزر گئے مگر قزاقی کا تصور ابھی تک آنکھوں میں ہے۔ میں ان دِنوں والد کے ساتھ ضلع اعظم گڑھ کی ایک تحصیل میں تھا۔ قزاقی ذات کا پاسی تھا۔ ہنس مکھ، بڑا ہی ہمت ور، بڑا ہی زندہ دل۔ وہ روزانہ ڈاک کا تھیلا لے کر آتا، رات بھر رہتا، اور سویرے ڈاک لے کر جاتا۔ شام کو پھر ادھر سے ڈاک خانے آجاتا۔ میں تمام دن بے صبری سے اس کا منتظر رہتا۔ جونہی چار بجتے، سڑک پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور تھوڑی دیر میں قزاقی کندھے پر بلم رکھے اُس کے گھونگھرو بجاتا دُور سے دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ وہ سانولے رنگ کا مضبوط اور لمبے قد کا جوان تھا۔ اس کا جسم سانچے میں ایسا ڈھلا ہوا کہ چابک دست مصور بھی اس میں کوئی عیب نہ نکال سکتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اس کے سڈول جسم پر بہت ہی بھلی لگتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ اور تیز دوڑنے لگتا۔ اس کے بلم کے گھونگھرو اور زور سے بجنے لگتے اور میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اُچھلنے لگتا۔ خوشی کی اُمنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہوگا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دُنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی، اور جب قزاقی مجھے اپنے کندھے پر لیے ہوئے دوڑنے لگتا تب تو ایسا معلوم ہوتا گویا میں ہوا کے گھوڑے پر اُڑا چلا جا رہا ہوں۔

قزاقی ڈاک خانہ میں پہنچتا تو پسینہ سے تر ہو جاتا لیکن آرام کرنے کی عادت نہ تھی۔ تھیلا رکھتے ہی وہ ہم لوگوں کو لے کر کسی میدان میں نکل جاتا۔ کبھی ہمارے ساتھ کھیلتا، کبھی برہے گا کر سناتا اور کبھی کہانیاں کہتا۔ اسے چوری ڈاکہ، مار پیٹ، بھوت پریت کے صدہا قصے یاد تھے۔ میں یہ قصے سن کر حیرت آمیز سرور میں محو ہو جاتا، اس کے قصوں کے چور ڈاکو سچے بہادر ہوتے تھے جو امرا کو لوٹ کر غربا و مساکین کی پرورش کرتے تھے، مجھے ان سے نفرت کے بجائے عقیدت ہوتی تھی؟

ایک روز قزاقی کو ڈاک کا تھیلا لے کر آنے میں دیر ہوگئی، آفتاب غروب ہو گیا اور وہ

نظر نہ آیا، میں کھویا ہوا سڑک پر دُور دُور تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا مگر وہ مانوس صورت نہ نظر آتی تھی، کان لگا کر سنتا تھا مگر "جھن جھن" کی وہ مسرّت افزا آواز نہ سنائی دیتی تھی، روشنی کے ساتھ میری امید بھی غائب ہو جاتی تھی۔ ادھر سے کسی کو آتے دیکھتا تو پوچھتا۔ قزاقی آتا ہے؟ مگر یا تو کوئی سنتا ہی نہ تھا یا صرف سر ہلا دیتا تھا۔

دفعتاً "جھن جھن" کی آواز کانوں میں آئی، مجھے اندھیرے میں چاروں طرف بھوت ہی بھوت نظر آتے تھے، حتیٰ کہ والدہ کے کمرے میں طاق پر رکھی ہوئی مٹھائی بھی اندھیرا ہونے پر میرے لیے قابلِ ترک ہو جاتی تھی، مگر وہ آواز سنتے ہی میں اس طرف زور سے دوڑا، ہاں وہ قزاقی ہی تھا! اسے دیکھتے ہی میری بیقراری غصہ میں تبدیل ہو گئی۔ میں اسے مارنے لگا پھر روٹھ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

قزاقی نے ہنس کر کہا: "مارو گے تو ایک چیز لایا ہوں وہ نہ دوں گا۔"

میں نے ہمت کر کے کہا: "جاؤ نہ دینا، میں لوں گا ہی نہیں۔"

قزاقی: "ابھی دکھا دوں تو دوڑ کر گودی میں اٹھا لو گے۔"

میں نے پگھل کر کہا: "اچھا دکھا دو۔"

قزاقی: "تو آ کر میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ، بھاگ چلوں، آج بہت دیر ہو گئی۔ بابو جی بگڑ رہے ہوں گے۔"

میں نے اکڑ کر کہا: "پہلے دکھا دو۔"

میری فتح ہوئی۔ اگر قزاقی کو دیر کا خوف نہ ہوتا اور ایک منٹ بھی زیادہ ٹھہر سکتا تو شاید پانسہ پلٹ جاتا، اس نے کوئی چیز دِکھلائی جسے وہ ایک ہاتھ سے سینہ سے چمٹائے ہوئے تھا ،اا مبا منہ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

میں نے دوڑ کر اسے قزاقی کی گود سے لے لیا وہ ہرن کا بچّہ تھا۔ آہ! میری اس خوشی کا کون اندازہ کرے؟ اس وقت سے مشکل امتحانات پاس کیے، بڑا عہدہ بھی پایا۔ رائے بہادر بھی ہوا مگر ویسی خوشی پھر نہ نصیب ہوئی، میں اسے گود میں لیے، اس کے نرم و نازک مس سے لطف اندوز ہوتا ہوا مکان کی طرف دوڑا۔ قزاقی کو آنے میں اتنی دیر ہوئی اس کا خیال ہی نہ رہا۔

میں نے پوچھا: "یہ کہاں مارا قزاقی؟"

قزاقی: "بھیا یہاں سے تھوڑی دُور پر ایک چھوٹا سا جنگل ہے، اس میں بہت سے ہرن ہیں، میرا جی چاہتا تھا کہ کوئی بچّہ مل جائے تو تمھیں دوں، آج یہ بچّہ بھی ہرنوں کے جھنڈ کے ساتھ دکھائی دیا، میں جھنڈ کی طرف دوڑا تو سب کے سب بھاگے۔ یہ بچّہ بھی بھاگا پر میں نے

پیچھا نہ چھوڑا اور ہرن تو بہت دُور نکل گئے پر یہی بچہ پیچھے رہ گیا، میں نے اسے پکڑ لیا اسی سے تو اتنی دیر ہوئی۔"

اس طرح باتیں کرتے ہم دونوں ڈاک خانے پہنچے، بابو جی نے مجھے نہ دیکھا، ہرن کے بچے کو بھی نہ دیکھا، قزاقی ہی پر ان کی نگاہ پڑی، بگڑ کر بولے: "آج اتنی دیر کہاں لگائی؟ اب تھیلا لے کر آیا ہے، اسے لے کر کیا کروں؟ ڈاک تو چلی گئی، بتا تو نے اتنی دیر کہاں لگائی۔"

قزاقی کی منہ سے آواز نہ نکلی۔

بابو جی نے کہا: "تجھے شاید اب نوکری نہیں کرنی ہے، رذیل ہے نہ، پیٹ بھرا تو موٹا ہو گیا۔ جب بھوکوں مرنے لگے گا تب آنکھیں کھلیں گی۔"

قزاقی خاموش کھڑا رہا۔

بابو جی کا غصہ اور بڑھا، بولے: "اچھا تھیلا رکھ دے اور اپنے گھر کی راہ لے۔ سؤر، اب ڈاک لے کر آیا ہے، تیرا کیا بگڑے گا جہاں چاہے گا مزدوری کر لے گا۔ ماتھے تو میرے جائے گی، جواب تو مجھ سے طلب ہوگا۔"

بابو — "آج کیوں دیر کی اس کا جواب دے۔"

قزاقی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ تعجب تو یہ تھا کہ میری زبان بھی بند ہو گئی، بابو جی بڑے غصہ ور تھے انھیں کام بہت کرنا پڑتا تھا، اسی وجہ سے بات بات پر جھنجھلا پڑتے تھے، میں تو ان کے سامنے کبھی جاتا ہی نہ تھا، وہ بھی مجھے کبھی پیار نہ کرتے تھے، دن میں صرف دو بار ایک ایک گھنٹہ کے لیے کھانا کھانے گھر جاتے تھے، باقی تمام دن دفتر میں لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے بار بار ایک اسسٹنٹ کے لیے افسروں سے درخواست کی تھی، مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا تھا، حتیٰ کہ تعطیل کے دن بھی بابو جی دفتر ہی میں رہتے تھے، صرف والدہ ان کے غصّے کو فرو کرنا جانتی تھیں مگر وہ دفتر میں کیسے آئیں؟ بیچارہ قزاقی اسی وقت میرے دیکھتے دیکھتے نکال دیا گیا ، اس کا بلم، چپراس اور صافہ چھین لیا گیا اور اسے ڈاک خانے سے نکل جانے کا نادر شاہی حکم سنا دیا گیا، آہ! اس وقت میرا ایسا جی چاہتا تھا کہ میرے پاس سونے کی لنکا ہوتی تو قزاقی کو دے دیتا اور بابو جی کو دکھلا دیتا کہ آپ کے نکال دینے سے قزاقی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ کسی سپاہی کو اپنی تلوار پر جتنا غرور ہوتا ہے اتنا ہی غرور قزاقی کو اپنی چپراس پر تھا جب وہ چپراس کھولنے لگا تو اس کی ہاتھ کانپ رہے تھے، اور اس سارے فساد کی جڑ وہ نازک شے تھی جو میری گود میں منہ چھپائے ایسے آرام سے بیٹھی تھی گویا ماں کی گود میں ہو۔ جب قزاقی چلا تو میں بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلا، میرے گھر کے دروازے پر آ کر قزاقی نے کہا: "بھیا، اب گھر جاؤ سانجھ ہو گئی۔"

میں چپ کھڑا اپنے آنسوؤں کے جوش کو پوری طاقت سے ضبط کر رہا تھا، قزاقی پھر بولا: ’’بھیا، میں کہیں باہر تھوڑے ہی چلا جاؤں گا، پھر آؤں گا اور تمھیں کندھے پر بٹھا کر دوڑاؤں گا، بابو جی نے نوکری لے لی ہے تو کیا اتنا بھی نہ کرنے دیں گے؟ تم کو چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا، بھیا جا کر للتاں سے کہہ دو کہ جا تا ہے، اس کا کہا سنا معاف کریں۔‘‘

میں دوڑا ہوا گھر گیا مگر ماں سے کچھ کہنے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ماں رسوئی سے باہر آ کر پوچھنے لگیں: ’’کیا ہوا بیٹا؟ کس نے مارا؟ بابو جی نے کچھ کہا ہے؟ اچھا رہ تو جاؤ، آج گھر آتے ہیں تو پوچھتی ہوں، جب دیکھو میرے لڑکے کو مارا کرتے ہیں، چپ رہو بیٹا اب تم ان کے پاس کبھی مت جانا۔‘‘

میں نے بڑی مشکل سے آواز سنبھال کر کہا: ’’قزاقی۔‘‘

ماں نے سمجھا کہ قزاقی نے مارا ہے، اچھا، آنے دو قزاقی کو دیکھو کھڑے کھڑے نکلوائے دیتی ہوں —— ہر کارہ ہو کر مرے راجہ بیٹے کو مارے، آج ہی تو صافہ، بلم، سب چھنوائے لیتی ہوں، واہ!‘‘

میں نے جلدی سے کہا: ’’نہیں، قزاقی نے نہیں مارا، بابو جی نے اسے نکال دیا، اس کا صافہ بلم چھین لیا، چپراس بھی لے لی۔‘‘

ماں: ’’یہ تمھارے بابو جی نے بہت برا کیا ہے، وہ بیچارہ اپنے کام میں مستعد رہتا ہے، پھر اسے کیوں نکالا؟‘‘

میں نے کہا: ’’آج اُسے دیر ہو گئی تھی۔‘‘

یہ کہہ کر میں نے ہرن کے بچے کو گودی سے اتار دیا، گھر میں اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ نہ تھا، اب تک ماں کی نگاہ بھی اس پر نہ پڑی تھی، اسے پھدکتے دیکھ کر وہ یکا یک چونک پڑیں اور لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا کہیں وہ خوفناک جانور مجھے کاٹ نہ لے، میں کہاں تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، کہاں ماں کی اس گھبراہٹ پر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

ماں: ’’ارے یہ تو ہرن کا بچہ ہے۔ کہاں ملا۔‘‘

میں نے ہرن کے بچے کا سارا ماجرا اور اس کے خوفناک نتیجہ کا حال ابتدا سے انتہا تک کہہ سنایا: ’’للتاں! یہ اتنا تیز بھاگتا ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا تو پکڑ نہ سکتا، سَن سَن ہوا کی طرح اُڑتا چلا جاتا تھا، قزاقی پانچ چھ گھنٹے تک برابر ان کے پیچھے دوڑتا رہا تب کہیں بچہ جا کر ملا، اماں، قزاقی کی طرح کوئی دنیا بھر میں نہیں دوڑ سکتا، اسی سے تو دیر ہو گئی، سو بابو جی نے بچارے کو نکال دیا، چپراس، صافہ، بلم سب چھین لیے۔ اب بیچارہ کیا کرے گا؟ بھوکوں مر جائے گا——‘‘

ماں نے پوچھا: ”کہاں ہے قزاقی، ذرا اسے بلا تو لاؤ۔“

میں نے کہا: ”باہر تو کھڑا ہے، کہتا ہے، اماں جی سے میرا کہا سنا معاف کرا دینا۔“

اب تک ماں میری باتوں کا مذاق سمجھ رہی تھیں، شاید وہ سمجھتی تھیں کہ بابو جی نے قزاقی کو ڈانٹا ہوگا، مگر میرا آخری جملہ سن کر انھیں خیال ہوا کہ کہیں واقعی تو قزاقی برخاست نہیں کر دیا گیا، وہ باہر جا کر 'قزاقی قزاقی' پکارنے لگیں مگر قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا میں نے بار بار پکارا، رو رو کر پکارا، مگر قزاقی وہاں نہ تھا

کھانا تو میں نے کھالیا۔ بچے غم میں بھی کھانا ترک نہیں کرتے، خصوصاً جب ربڑی بھی سامنے ہو، مگر بڑی رات تک پڑے پڑے سوچتا رہا، میرے پاس روپے ہوتے تو ایک لاکھ روپے قزاقی کو دے دیتا اور کہتا کہ بابو جی سے مت بولنا۔ بیچارہ بھوکوں مر جائے گا، دیکھیں کل آتا ہے یا نہیں، اب کیا کرے گا آ کر؟ مگر آنے کو تو کہہ گیا ہے۔ میں کل اسے اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں گا۔

یہی ہوائی قلعے بناتے ہوئے مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے روز میں تمام دن اپنے ہرن کے بچے کی آؤ بھگت میں مشغول رہا۔ پہلے اس کے نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی، منو نام رکھا گیا پھر میں نے اس کا اپنے جملہ دوستوں اور ہم سبق لڑکوں سے تعارف کرایا، ایک ہی روز میں وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ میرے پیچھے دوڑنے لگا، اتنی ہی دیر میں میں نے اسے اپنی زندگی میں ایک اہم جگہ دے دی، اپنے مستقبل میں بننے والے شاندار محل میں اس کی لیے ایک علیحدہ کمرہ بنانے کا بھی تہیہ کر لیا، پلنگ، فٹن وغیرہ کی بھی تجاویز کر لیں۔

لیکن شام ہوتے ہی میں سب چھوڑ چھاڑ کر سڑک پر جا کھڑا ہوا اور قزاقی کی راہ دیکھنے لگا، یہ جانتا تھا کہ قزاقی نکال دیا گیا ہے، اب اسے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے امید ہو رہی تھی کہ وہ آ رہا ہے، یکایک مجھے خیال آیا کہ قزاقی بھوکوں مر رہا ہوگا، میں فوراً گھر گیا، والدہ چراغ جلا رہی تھیں۔ میں نے چپکے سے ایک ٹوکری میں آٹا نکالا اور آٹا ہاتھوں میں لپیٹے ٹوکری سے گرتے ہوئے آٹے کی ایک لکیر بناتا ہوا بھاگا۔ آ کر سڑک پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ قزاقی سامنے سے آتا نظر پڑا، اس کے پاس بلم بھی تھا، کمر میں چپراس بھی تھی، اور سر پر صافہ بھی بندھا ہوا تھا، میں دوڑ کر اس کی کمر سے لپٹ گیا، اور متحیر ہو کر بولا: ”تمھیں چپراس اور بلم کہاں سے مل گیا قزاقی؟“ قزاقی نے مجھے اٹھا کر کندھے پر بٹھاتے

ہوئے کہا: ''وہ چپراس کس کام کی تھی بھیا، وہ تو غلامی کی چپراس تھی، یہ اپنی خوشی کی چپراس ہے، پہلے سرکار کا نوکر تھا اب تمھارا نوکر ہوں۔''

یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ ٹوکری پر پڑی جو وہیں رکھی تھی، بولا: ''یہ آٹا کیسا ہے بھیا؟'' میں نے شرماتے ہوئے کہا: ''تمھارے ہی لیے تو لایا ہوں، تم بھوکے ہوگے، آج کیا کھایا ہوگا؟''

قزاقی کی آنکھیں تو میں نہ دیکھ سکا، اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا تھا، ہاں! اس کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس کا گلا بھر آیا ہے، بولا: ''بھیا! کیا روکھی روٹی کھاؤں گا، دال نمک گھی اور تو کچھ نہیں ہے۔''

میں اپنے سہو پر بڑا نادم ہوا۔ سچ تو ہے کہ بیچارہ روکھی روٹیاں کیسے کھائے گا؟ لیکن نمک دال اور گھی کیسے لاؤں؟ اب تو ماں چوکے میں ہوں گی۔ آٹا لے کر تو کسی طرح بھاگ آیا تھا، ابھی تک مجھے نہ معلوم تھا کہ میری چوری پکڑ لی گئی۔ آٹے کی لکیر نے سُراغ دے دیا۔ اب یہ تین تین کیسے لاؤں گا؟ ماں سے مانگوں گا تو کبھی نہ دیں گی، ایک ایک پیسے کی لیے تو گھنٹوں رُلاتی ہیں، اتنی سبھی چیزیں کیوں دینے لگیں، یکایک مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں نے اپنی کتابوں کے بستہ میں کئی آنے پیسے رکھ چھوڑے تھے۔ مجھے پیسے جمع کر کے رکھنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی، معلوم نہیں اب وہ عادت کیوں تبدیل ہوگئی۔ اب بھی وہی حالت ہوتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا، بابو جی مجھے پیار کر کے رکھنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی، معلوم نہیں اب وہ عادت کیوں تبدیل ہوگئی، اب بھی وہی حالت ہوتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا، بابو جی مجھے پیار تو کبھی نہ کرتے تھے مگر پیسے خوب دیتے تھے۔ شاید اپنے کام میں مصروف رہنے کے سبب مجھ سے گلا چھڑانے کے لیے اسی کام کو سب سے آسان سمجھتے تھے، انکار کرنے میں میرے رونے اور مچلنے کا اندیشہ تھا، اس بلا کو وہ دُور سے ہی ٹال دیتے تھے، ماں کا مزاج اس کے ٹھیک برعکس تھا، انھیں میرے رونے اور مچلنے سے کسی کام میں خلل پڑنے کا خوف نہ تھا، آدمی لیٹے لیٹے دن بھر رونا سن سکتا ہے، حساب لگاتے ہوئے زور کی آواز سے بھی دھیان بٹ جاتا ہے، اماں مجھے پیار تو بہت کرتی تھیں مگر پیسہ کا نام سنتے ہی ان کی تیوریاں بدل جاتی تھیں، میرے پاس کتابیں نہ تھیں، ہاں ایک بستہ تھا جس میں ڈاک خانے کے دو چار فارم تہہ کر کے کتابی صورت میں رکھے ہوئے تھے، میں نے سوچا، دال نمک اور گھی کے لیے کیا اتنے پیسہ کافی نہ ہوں گے، میری تو مٹھی میں نہیں سماتے، خیر! یہ فیصلہ کر کے میں نے کہا: ''اچھا، مجھے اتار دو تو میں دال نمک لادوں مگر روز آیا کرو گے نا؟''

قزاقی: ''بھیا کھانے کو دو گے تو کیوں نہ آؤں گا؟''

میں نے کہا: "میں روز کھانے کو دوں گا۔"

قزاقی بولا: "تو میں روز آؤں گا۔"

میں نیچے اترا اور دوڑ کر اپنی ساری پونجی اٹھا لایا۔ قزاقی کو روزانہ بلانے کے لیے اس وقت میرے پاس کوہِ نور کا ہیرا ہوتا تو اسے بھی نذر کرنے میں مجھے تامل نہ ہوتا۔

قزاقی نے متحیر ہو کر پوچھا: "یہ پیسے کہاں پائے، بھیا؟

میں نے فخر سے کہا: "میرے ہی تو ہیں۔"

قزاقی: "تمھاری اماں جی تم کو ماریں گی، کہیں گی کہ کجا کی نے پھسلا کر منگوا لیے ہوں گے۔ بھیا، ان پیسوں کی مٹھائی لے لینا اور آٹا مٹکے میں رکھ دینا، میں بھوکوں نہیں مرتا، میرے دو ہاتھ ہیں، بھلا میں بھوکوں مر سکتا ہوں؟"

میں نے ہر چند کہا کہ پیسے میرے ہیں لیکن قزاقی نے نہ لیے۔ اس نے بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی سیر کرائی، گیت سنائے اور مجھے گھر پہنچا کر چلا گیا میرے دروازے پر آٹے کی ٹوکری بھی رکھ دی۔

میں نے مکان میں قدم ہی رکھا تھا کہ ماں نے ڈانٹ کر کہا: "کیوں رے چور، تو آٹا کہاں لے گیا تھا؟ اب چوری کرنا سیکھتا ہے؟ بتا کس کو آٹا دے آیا، ورنہ تیری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔"

میری نانی مر گئی۔ ماں غصہ میں شیرنی ہو جاتی تھیں، میں سٹپٹا کر بولا: "کسی کو تو نہیں دے آیا۔"

ماں: "تو نے آٹا نہیں نکالا؟ دیکھ کتنا آٹا سارے صحن میں بکھرا پڑا ہے۔" میں خاموش کھڑا تھا، وہ کتنا ہی دھمکاتی تھیں، چمکارتی تھیں مگر میری زبان نہ کھلتی تھی۔ آنے والی مصیبت کے خوف سے جان سوکھ رہی تھی، یہاں تک بھی کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بگڑتی کیوں ہو؟ آٹا تو دروازے پر رکھا ہوا ہے، نہ اٹھا کر لاتے بنتا تھا۔ گویا کام کرنے کی قوت ہی جاتی رہی، گویا پیروں میں ہلنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ دفعتاً قزاقی نے پکارا: "بہو جی آٹا یہ دروازے پر رکھا ہوا ہے، بھیا مجھے دینے کو لے گئے تھے۔"

یہ سنتے ہی ماں دروازے کی طرف چلی گئی۔ قزاقی سے وہ پردہ نہ کرتی تھی، انھوں نے قزاقی سے کوئی بات کی یا نہیں، یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اماں جی خالی ٹوکری لیے ہوئے گھر میں آئیں، پھر کوٹھری میں جا کر صندوق سے کچھ نکالا اور دروازہ کی طرف گئیں، میں نے دیکھا، ان کی مٹھی بند تھی، اب مجھ سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا، ماں کے پیچھے پیچھے میں بھی گیا، ماں

نے دروازے پر کئی بار پکارا مگر قزاقی چلا گیا تھا۔

میں نے بڑی بہادری سے کہا: ''میں جا کر کھوج لاؤں، امّاں جی؟''

ماں نے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا: ''تم اندھیرے میں کہاں جاؤ گے؟ ابھی تو کھڑا تھا۔ میں نے کہا کہ یہیں رہنا، میں آتی ہوں، تب تک نہ جانے کہاں کھسک گیا، بڑا سنکوچی آدمی ہے، آنا لیتا ہی نہ تھا، میں نے زبردستی اس کے انگوچھے میں باندھ دیا، مجھے تو بیچارے پر بڑا ترس آتا ہے، نہ جانے غریب کے گھر میں کچھ کھانے کو ہے یا نہیں، روپے لائی تھی کہ دے دوں گی مگر نہ جانے کہاں چلا گیا۔''

اب تو مجھے بھی ہمت ہوئی، میں نے اپنی چوری کی پوری داستان کہہ ڈالی۔ بچوں کے ساتھ سمجھ دار بچے بن کر والدین ان پر جتنا اثر ڈال سکتے ہیں، جتنی نصیحت دے سکتے ہیں اتنا بڈھے بن کر نہیں۔

ماں نے کہا: ''تم نے مجھ سے پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیا میں قزاقی کو تھوڑا سا آٹا نہ دے دیتی؟''

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، دل میں کہا، اس وقت تمھیں قزاقی پر رحم آگیا ہے جو چاہو دے ڈالو لیکن میں مانگتا تو مارنے کے لیے دوڑتیں، ہاں یہ سوچ کر دل خوش ہوا کہ اب قزاقی بھوکوں نہ مرے گا، امّاں جی اسے روز کھانے کو دیں گی اور وہ روز مجھے بٹھا کر سیر کرا دے گا۔

دوسرے روز وہ میں دن بھر منّو کے ساتھ کھیلتا رہا، شام کو سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا، مگر اندھیرا ہو گیا اور قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا، چراغ جل گیا، راستہ میں سناٹا چھا گیا مگر قزاقی نہ آیا؟ میں روتا ہوا گھر آیا امّاں نے پوچھا: ''کیوں روتے ہو بیٹا؟ کیا قزاقی نہیں آیا۔''

میں اور زور سے رونے لگا، ماں نے مجھے چھاتی سے لگا لیا، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان کا گلا بھی بھر آیا ہے، انھوں نے کہا: ''بیٹا چپ ہو جاؤ، میں کل کسی ہرکارے کو بھیج کر قزاقی کو بلاؤں گی۔''

میں روتے روتے ہی سو گیا، صبح جیونہی آنکھیں کھلیں میں نے ماں سے کہا: ''قزاقی کو بلوا دو۔''

ماں نے کہا آدمی گیا ہے بیٹا، قزاقی آتا ہوگا، میں خوش ہو کر کھیلنے لگا، مجھے معلوم تھا کہ امّاں جی جو بات کہتی ہیں اسے پورا ضرور کرتی ہیں، انھوں نے صبح سویرے ہی ایک اہلکار بھیج دیا تھا، دس بجے جب میں منّو کو لیے ہوئے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ قزاقی اپنے گھر پر نہیں ملا، اس کی بیوی رو رہی تھی کہ نہ جانے کہاں چلے گئے اسے اندیشہ تھا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

بچوں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے، اس کا اندازہ دوسرا نہیں کر سکتا۔ ان میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہوتے، انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی بات انھیں بے

چین کر رہی ہے، کون سا کانٹا ان کے دل میں کھٹک رہا ہے، کیوں بار بار انھیں رونا آتا ہے کیوں وہ من مارے بیٹھے ہیں، کھیلنے میں جی نہیں لگتا، میری بھی یہی حالت تھی، کبھی گھر میں آتا، کبھی باہر جاتا، کبھی سڑک پر جا پہنچتا آنکھیں قزاقی کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ کہاں چلا گیا، کہیں بھاگ تو نہیں گیا؟

تیسرے پہر کو میں گمشدہ سا سڑک پر کھڑا تھا۔ یکایک میں نے قزاقی کو ایک گلی میں دیکھا، ہاں! وہ قزاقی ہی تھا، میں اس کی طرف پکارتا ہوا دوڑا مگر گلی میں اس کا پتہ نہ تھا، نہ جانے کدھر غائب ہو گیا، میں نے گلی کو اِس سرے سے اُس سرے تک دیکھا مگر کہیں قزاقی کی بو تک نہ ملی۔

گھر جا کر میں نے ماں سے یہ بات کہی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یہ بات سن کر بہت متفکر ہو گئیں، اس کے بعد دو تین روز تک قزاقی نہ دکھائی دیا، میں بھی اب اس کو کچھ کچھ بھولنے لگا، بچّے پہلے جتنی محبت کرتے ہیں بعد کو اتنا ہی بے اعتنا بھی ہو جاتے ہیں جس کھلونے پر جان دیتے ہیں اسی کو دو چار روز بعد پٹک کر توڑ بھی ڈالتے ہیں۔

دس بارہ روز اور گزر گئے، دوپہر کا وقت تھا بابو جی کھانا کھا رہے تھے، میں منّو کے پیروں میں پیتل کی پینجیاں باندھ رہا تھا، ایک عورت گھونگھٹ نکالے ہوئے آئی اور صحن میں کھڑی ہو گئی، اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے تھے، مگر گوری اور خوبصورت عورت تھی، اس نے مجھ سے پوچھا: ''بھیا، بہو جی کہاں ہیں؟'' میں نے اس کے پاس جا کر اس کا منہ دیکھتے ہوئے کہا: ''تم کون ہو؟ کیا بیچتی ہو۔''

عورت: ''کچھ بیچتی نہیں ہوں، تمھارے لیے کمل گٹّے لائی ہوں۔ بھیا تمھیں تو کمل گٹّے بہت اچھے لگتے ہیں نا؟'' میں نے اس کے ہاتھوں سے لٹکی ہوئی پوٹلی کو شوق بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا: ''کہاں سے لائی ہو، دیکھیں۔''

عورت: ''تمھارے ہرکارے نے بھیجا ہے، بھیا۔''

میں نے اچھل کر پوچھا: ''قزاقی نے؟''

عورت نے سر ہلا کر ہاں کہا اور پوٹلی کھولنے لگی، اتنے میں ماں بھی رسوئی سے نکل آئیں اس نے ماں کے پیر چھوئے، ماں نے پوچھا: ''تو قزاقی کی گھر والی ہے؟''

عورت نے سر جھکا لیا۔

ماں: ''آج کل قزاقی کیا کرتا ہے۔''

عورت نے رو کر کہا: ''بہو جی، جس دن سے آپ کے پاس سے آٹا لے کر گئے ہیں اسی

دن سے بیمار پڑے ہیں، بس بھیا، بھیا کیا کرتے ہیں، بھیا ہی میں ان کا من بسا رہتا ہے۔ چونک چونک کر بھیا بھیا کہتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑتے ہیں، نہ جانے انھیں کیا ہو گیا ہے، بہو جی، ایک دن مجھ سے کچھ کہا نہ سنا گھر سے چل دیے اور ایک گلی میں چھپ کر بھیا کو دیکھتے رہے، جب بھیا نے انھیں دیکھ لیا تو بھاگے، تمھارے پاس آتے ہوئے لجاتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''ہاں ہاں، میں نے اس دن تم سے جو کہا تھا، اماں جی۔''

ماں: ''گھر میں کچھ کھانے پینے کو ہے؟''

عورت: ''ہاں بہو جی، تمھارے آسرباد سے کھانے پینے کا دکھ تو نہیں ہے، آج سبیرے اُٹھے اور تالاب کی طرف چلے گئے، بہت کہتی رہی کہ باہر مت جاؤ، ہوا لگ جائے گی، مگر نہ مانا، مارے کمزوری کے پاؤں بھی کانپنے لگتے ہیں مگر تالاب میں گھس کر یہ کمل گٹے تو ڑلائے اور مجھ سے کہا کہ لے جا، بھیا کو دے آ، انھیں کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں، کسل چھیم (خیر و عافیت) پوچھتی آنا۔''

میں نے پوٹلی سے کمل گٹے نکال لیے اور مزے سے کھا رہا تھا، ماں نے بہت آنکھیں دکھائیں مگر یہاں اتنا صبر کہاں؟

ماں نے کہا: ''کہہ دینا سب کسل ہے۔''

میں نے کہا: یہ'' بھی کہہ دینا کہ بھیا نے بلایا ہے، نہ جاؤ گے تو پھر تم سے کبھی نہ بولیں گے، ہاں۔''

بابو جی کھانا کھا کر نکل آئے تھے، تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے'' اور یہ بھی کہہ دینا کہ صاحب نے تم کو بحال کر دیا ہے، جلد جاؤ ورنہ کوئی دوسرا آدمی رکھ لیا جاوے گا۔''

عورت نے اپنا کپڑا اُٹھایا اور چلی گئی، ماں نے پکارا مگر وہ نہ رُکی شاید اماں جی اُسے آٹا، دال دینا چاہتی تھیں۔

ماں نے پوچھا: ''سچ مچ بحال ہو گیا؟''

بابو جی: ''اور کیا جھوٹ ہی بلا رہا ہوں، میں نے تو پانچویں ہی روز اس کی بحال رپورٹ کی تھی۔''

ماں: ''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔''

بابو جی: ''اس کی بیماری کی یہی دوا ہے۔''

علی الصبح میں اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قزاقی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آ رہا ہے، وہ بہت دُبلا ہو گیا

تھا، معلوم ہوتا تھا، بوڑھا ہو گیا ہے، ہرا بھرا درخت سوکھ کر ٹھونٹھ سا ہو گیا تھا، میں اس کی طرف دوڑا اور اس کی کمر سے لپٹ گیا، قزاقی نے میرے گالوں کو چوما اور مجھے اٹھا کر کندھے پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ اُٹھ سکا، تب وہ چوپایوں کی طرح زمین پر ہاتھوں اور گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا اور میں اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر ڈاک خانے کی طرف چلا، میں اس وقت خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، اور شاید قزاقی مجھ سے بھی زیادہ خوش تھا۔

بابو جی نے کہا: ’’قزاقی تم بحال ہو گئے اب کبھی دیر نہ کرنا۔‘‘

قزاقی روتا ہوا والد صاحب کے قدموں پر گر پڑا، مگر شاید میرے نصیب میں دو سکھ بھوگنا بدا نہ تھا۔ منو ملا تو قزاقی چھوٹا، قزاقی آیا تو منو ہاتھ سے گیا، اور ایسا گیا کہ اس کے جانے کا رنج آج تک ہے، منو میری ہی تھالی میں کھاتا تھا، جب تک میں کھانے نہ بیٹھوں وہ کبھی کچھ نہ کھاتا تھا، اسے بھات سے بہت ہی رغبت تھی جب تک خوب گھی نہ پڑا ہو اُس کا جی نہ بھرتا تھا، وہ میرے ہی ساتھ سوتا بھی تھا، اور میرے ہی ساتھ اُٹھتا بھی، صفائی تو اُسے اِس قدر پسند تھی کہ رفع حاجت کے لیے گھر سے باہر میدان میں نکل جاتا تھا، کتوں سے اس کو چڑ تھی، کتوں کو گھر میں نہ گھسنے دیتا تھا، کتے کو دیکھتے ہی تھالی سے اُٹھ جاتا اور اسے دوڑا کر گھر سے باہر نکال دیتا تھا۔

قزاقی کو ڈاک خانے میں چھوڑ کر جب میں کھانا کھانے گیا تو منو بھی آ بیٹھا، ابھی دو چار ہی لقمے کھائے تھے کہ ایک بڑا سا جھبرا کتا صحن میں نظر آیا، منو اسے دیکھتے ہی دوڑا، دوسرے مکان میں جا کر کتا چوہا ہو جاتا ہے۔ جھبرا کتا اسے آتے دیکھ کر بھاگا، منو کو اب گھر لوٹ آنا چاہیے تھا، مگر وہ کتا اس کے لیے ملک الموت تھا، منو کو اسے گھر سے نکال کر بھی صبر نہ ہوا، وہ اسے گھر سے باہر میدان میں بھی دوڑانے لگا، منو کو شاید خیال نہ رہا کہ یہاں میری عمل داری نہیں ہے، وہ اس احاطہ میں پہنچ گیا تھا جہاں جھبرے کا بھی اتنا ہی اقتدار تھا جتنا منو کا اپنے گھر میں۔ منو کتوں کو بھگاتے بھگاتے شاید اپنے قوتِ بازو پر گھمنڈ کرنے لگا تھا، جھبرے نے میدان میں آتے ہی پلٹ کر منو کی گردن دبا دی، بیچارے منو کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ پڑوسیوں نے شور مچایا تو میں دوڑا، دیکھا تو منو مرا پڑا ہے اور جھبرے کا کہیں پتہ نہیں۔

آٹھ سال کا تھا، اپنی والدہ کو، جو دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی دیکھتا رہتا، وہ ایک اچھی ماں کی طرح مجھ سے محبت بھی کرتی تھیں اور ضرورت پڑنے پر سختی بھی برتتی تھی، بچپن کی ایک اور یاد۔

ہائے میرا بچپن، تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچا ٹوٹا گھر، وہ پوال کا بستر، وہ برہنہ جسم، برہنہ پا کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا، ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں، کھینچے جوتے پہن کر اس وقت جتنی خوشی ہوتی تھی، اب فلیکس کے جوتوں سے بھی نہیں ہوتی، گرم تپیلے رس میں جو لذّت تھی، وہ اب گلاب کے شربت میں بھی نہیں، چربن اور کچّے بیرون میں جو ذائقہ تھا وہ اب شیر برنج اور انگور میں بھی نہیں ملتا۔

میں اپنے چچازاد بھائی بلدھر کے ساتھ دوسرے گانو میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا، میری عمر آٹھ سال کی ہوگی۔ بلدھر (وہ اب بہشت میں ہے) مجھ سے دو سال بڑے تھے، ہم دونوں علی الصباح باسی روٹیاں کھا کر دوپہر کے لیے مٹر اور جو کا چربن لے کر، کوئی حاضری کا رجسٹر تو تھا ہی نہیں، اور نہ غیر حاضری کا جرمانہ دینا پڑتا تھا، پھر خوف کس بات کا؟ کبھی تو تھانہ کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے، کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑی کی بہار دیکھتے، گاڑیوں کے وقت کا جتنا علم ہم کو تھا اتنا شاید ٹائم ٹیبل کو بھی نہ تھا، راستہ میں شہر کے ایک مہاجن نے ایک باغ لگوانا شروع کیا تھا وہاں ایک کنواں کھُد رہا تھا، وہ بھی میرے لیے ایک دلچسپ تماشہ تھا۔ بڈھا مالی ہمیں اپنی جھونپڑی میں بڑی محبّت سے بٹھاتا تھا۔ ہم اس سے جھگڑ جھگڑ کر اس کا کام کرتے، کہیں بالٹی لیے پودوں کو سینچ رہے ہیں، کہیں کھرپی سے کیاری گوڑ رہے ہیں، کہیں مقراض سے بیلوں کی پتّیاں چھانٹ رہے ہیں۔ ان کاموں میں کتنا لطف تھا، مالی بچّوں کی فطرت کا عالم تھا ہم سے کام لیتا مگر اس طرح کہ گویا ہم پر کوئی احسان کر رہا ہے۔ جتنا کام وہ دن بھر میں کرتا اسے ہم گھنٹے بھر میں ختم کر دیتے۔ اب وہ مالی نہیں ہے لیکن باغ ہرا بھرا ہے۔ اس کے پاس سے ہو کر گزرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ان درختوں کے گلے مل کر روؤں اور کہوں، پیارے، تم مجھے بھول گئے ہو مگر میں تم کو نہیں بھولا، میرے دل میں تمھاری یاد ابھی تک زندہ ہے، اتنی ہی تازہ جتنے تمھارے پتّے! بے غرضانہ محبّت کے تم جیتے جاگتے مجسمہ ہو۔

کبھی کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی چڑھی ہوئی تیوریاں اُتر جاتیں، اتنی تخیلی قوت آج ہوتی تو ایسا ناول لکھ مارتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ اب تو یہ حال ہے کہ بہت سر کھپانے کے بعد کوئی کہانی سوجھتی ہے، خیر ہمارے مولوی

صاحب درزی تھے، مولوی گیری صرف شوقیہ کرتے تھے، ہم دونوں بھائی اپنے گانو کے کرمی کمہاروں سے ان کی خوب تعریف کرتے تھے، یا کہیے کہ ہم لوگ مولوی صاحب کے سفری ایجنٹ تھے، ہماری کوشش سے مولوی صاحب کو جب کچھ کام مل جاتا تو ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ جس روز کوئی اچھا بہانہ نہ سوجھتا اس روز مولوی صاحب کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے جاتے، کبھی سیر آدھ سیر پھلیاں توڑ لیں تو کبھی دس پانچ گنے، کبھی جو یا گیہوں کی ہری ہری بالیں لے لیں، ان تحفہ جات کو دیکھتے ہی مولوی صاحب کا غصہ سرد ہو جاتا، جب ان چیزوں کی فصل نہ ہوتی تو ہم سزا سے بچنے کی کوئی اور ہی تدبیر سوچتے۔ مولوی صاحب کو چڑیوں کا شوق تھا، مکتب میں شیاما، بلبل، دہیل اور چنڈولوں کے پنجرے لٹکے رہتے تھے، ہمیں سبق یاد ہو یا نہ ہو مگر چڑیوں کو یاد ہو جاتے تھے، ہمارے ساتھ ہی وہ بھی پڑھا کرتی تھیں، ان چڑیوں کی لیے بیشن تیار کرنے میں ہم لوگ کافی حوصلہ کا اظہار کرتے تھے، مولوی صاحب سب لڑکوں کو پتنگے پکڑ کر لانے کی تاکید کرتے رہتے، ان چڑیوں کو پتنگوں سے دلی رغبت تھی، کبھی کبھی ہماری بلا پتنگوں کے ہی سر چلی جاتی تھی، ان کی قربانی کر کے ہم مولوی صاحب کی قہر آلود شخصیت کو خوش و خرم بنا دیا کرتے تھے۔

ایک روز صبح ہم دونوں بھائی تالاب میں منہ دھونے گئے تو بلدھر نے کوئی سفید سی چیز مٹھی میں لے کر دکھائی، میں نے لپک کر مٹھی کھولی تو اس میں ایک روپیہ تھا۔ میں نے متحیر ہو کر پوچھا:
''یہ روپیہ تمھیں کہاں ملا؟''

بلدھر: ''اماں نے طاق پر رکھا تھا، چارپائی کھڑی کر کے نکال لایا۔''

مکان میں کوئی صندوق یا الماری تو تھی نہیں، روپے پیسے ایک بلند طاق پر رکھ دیے جاتے تھے، ایک روز قبل چچا صاحب نے سن فروخت کیا تھا اسی کے روپے زمیندار کو دینے کے لیے رکھے ہوئے تھے، بلدھر کو نہ جانے کیسے سراغ مل گیا۔ جب گھر کے سب لوگ اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے تو اس نے چارپائی کھڑی کی اور اس پر چڑھ کر ایک روپیہ نکال لایا۔

اس وقت تک ہم نے کبھی روپیہ چھوا تک نہ تھا، وہ روپیہ دیکھ کر خوشی و خوف کے جو جذبات دل میں پیدا ہوئے وہ ابھی تک یاد ہیں۔ ہمارے لیے روپیہ ایک نایاب چیز تھی، مولوی صاحب کو ہمارے یہاں سے صرف بارہ آنے ملا کرتے تھے، مہینہ کے آخر میں چچا صاحب خود جا کر پیسے دے آتے تھے۔ ہمارا اتنا بھی اعتبار نہ تھا۔ وہی ہم آج ایک روپے کے کامل بادشاہ تھے۔ بھلا کون ہمارے گھمنڈ کا اندازہ کر سکتا ہے، لیکن مار کھانے کا خوف ہماری خوشی میں مخل ہو رہا تھا، روپے بے شمار تو تھے نہیں، چوری کا کھل جانا ایک مسلّمہ امر تھا، چچا صاحب کے

غصہ کا بھی مجھے تو نہیں مگر بلدھر کو ضرور احساس ہو چکا تھا۔یوں تو ان سے زیادہ سیدھا سادا آدمی دُنیا میں نہ تھا، چچی صاحبہ نے ان کی حفاظت کا ذمہ نہ لے رکھا ہوتا تو کوئی بنیا انھیں بازار میں فروخت کر سکتا تھا مگر جب غصہ آ جاتا تو پھر انھیں کچھ نہ سوجھتا،اور تو اور، چچی صاحبہ بھی ان کے غصہ کا مقابلہ کرتی ہوئی ڈرتی تھیں،ہم دونوں نے کئی منٹ تک انھیں امور پر غور کیا اور آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ آئی ہوئی لکشمی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ایک تو ہم پر شبہ ہوہی گا نہیں اور اگر ہوا بھی تو ہم صاف انکار کر جائیں گے،کہیں گے ہم روپیہ لے کر کیا کرتے؟ ہماری ''ننگا جھولی'' لے لیجیے۔شاید زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو ہمارا یہ ارادہ فسخ ہو جاتا اور وہ خوفناک نظارہ سامنے نہ آتا جسے بعد میں دیکھنا نصیب ہوا مگر اُس وقت ہم میں اِس طرح غور کرنے کی سکت ہی نہ تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر ہم دونوں گھر گئے اور ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا۔اگر کہیں اس وقت تلاشی کی نوبت آئی تو پھر ایشور ہی مالک ہے،لیکن سب لوگ اپنا اپنا کام کر رہے تھے،کوئی ہم سے نہ بولا،ہم نے ناشتہ بھی نہ کیا، چربن بھی نہ لیا، کتاب بغل میں دبائی،اور مکتب کو روانہ ہو گئے۔

برسات کے دن تھے،آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے،ہم دونوں خوش خوش مکتب چلے جا رہے تھے،آج کونسل کی منسٹری پا کر بھی شاید اتنی خوشی نہ ہو،ہزاروں منصوبے باندھتے تھے، ہزاروں ہوائی قلعے تعمیر کرتے تھے،ایسا موقع بڑی خوش قسمتی سے نصیب ہوا تھا،زندگی میں پھر شاید ہی ایسا موقع نصیب ہو،بس روپیہ کو اس طرح صرف کرنا چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دِنوں تک چل سکے،اگر چہ ان دِنوں پانچ آنہ سیر بہت عمدہ مٹھائی ملتی تھی اور شاید آدھ سیر مٹھائی میں ہم دونوں آسودہ ہو جاتے،مگر یہ خیال ہوا کہ مٹھائی کھائیں گے تو روپیہ آج ہی غائب ہو جاوے گا،کوئی سستی چیز کھانی چاہیے کہ مزہ بھی آئے، پیٹ بھی بھرے،اور پیسے بھی کم خرچ ہوں۔آخر امرودوں پر ہماری نظر پڑی،ہم دونوں راضی ہو گئے۔دو پیسے کے امرود لیے، سستا وقت تھا، بڑے بڑے بارہ امرود ملے،ہم دونوں کے کُرتوں کے دامن بھر گئے، جب بلدھر نے کنجڑن کی ہاتھ میں روپیہ رکھا تو اس نے شبہ سے دیکھ کر پوچھا: ''روپیہ کہاں پایا،لالا..؟ چرا تو نہیں لائے؟''

جواب ہمارے پاس تیار تھا،زیادہ نہیں تو دو تین کتابیں تو پڑھ ہی چکے تھے،علم کا کچھ کچھ اثر ہو چلا تھا۔میں نے فوراً کہا: ''مولوی صاحب کی تنخواہ دینی ہے گھر میں پیسے نہ تھے تو چچا صاحب نے روپیہ دے دیا۔''

اس جواب نے کنجڑن کا شبہ دُور کر دیا،ہم دونوں نے ایک پُلیا پر بیٹھ کر خوب امرود

کھائے، مگر اب ساڑھے پندرہ آنے پیسے کہاں لے جائیں؟ ایک روپیہ تو چھپا لینا اتنا مشکل کام نہ تھا، یہ پیسوں کا ڈھیر کہاں چھپتا؟ نہ کمر میں اتنی جگہ تھی، اور نہ جیب میں اتنی گنجائش، انھیں اپنے پاس رکھنا اپنی چوری کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے، بہت سوچنے کے بعد یہ طے کیا کہ بارہ آنے تو مولوی صاحب کو دے دیے جائیں بقیہ ساڑھے تین آنے کی مٹھائی اُڑائیں۔ یہ فیصلہ کرکے ہم لوگ مکتب پہنچے، آج کئی روز بعد گئے تھے، مولوی صاحب نے پکڑ کر پوچھا: ''اتنے دن کہاں رہے۔''

میں نے کہا: ''مولوی صاحب، گھر میں غمی ہوگئی تھی۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے بارہ آنے ان کے سامنے رکھ دیے، پھر کیا پوچھنا تھا، پیسے دیکھتے ہی مولوی صاحب کی باچھیں کھل گئیں، مہینہ ختم ہونے میں ابھی کئی دن باقی تھے۔ عموماً مہینہ گزر جانے اور بار بار تقاضے کرنے پر کہیں پیسے ملتے تھے اب کے اتنا جلد پیسے پاکر ان کا خوش ہونا کوئی معمول بات نہ تھی، ہم نے اور لڑکوں کی طرف فخریہ نگاہوں سے دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں، ایک تم ہو کہ مانگنے پر بھی پیسے نہیں دیتے، ایک ہم ہیں کہ پیشگی دے دیتے ہیں۔

ہم ابھی سبق پڑھ ہی رہے تھے کہ معلوم ہوا، آج تالاب کا میلہ ہے۔ دوپہر سے چھٹی ہوجائے گی، مولوی صاحب میلے میں بلبل لڑانے جاویں گے۔ یہ خبر سنتے ہی ہماری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا، بارہ آنے تو بینک میں جمع کر ہی چکے تھے، ساڑھے تین آنوں میں میلا دیکھنے کی ٹھہری، خوب بہار رہے گی، مزے سے ریوڑیاں کھائیں گے، گول گپے اُڑائیں گے، جھولے پر چڑھیں گے اور شام کو گھر پہنچیں گے، لیکن مولوی صاحب نے ایک سخت شرط یہ لگادی تھی کہ سب لڑکے چھٹی کے پہلے اپنا اپنا سبق سنادیں۔ جو سبق نہ سنا سکے گا اس کو چھٹی نہ ملے گی، نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے تو چھٹی مل گئی مگر ہلدھر قید کرلیے گئے اور کئی لڑکوں نے سبق سنا دیا تھا، وہ بھی میلا دیکھنے چل پڑے، میں بھی ان کے ساتھ ہولیا، یہ طے ہوگیا تھا کہ وہ چھٹی پاتے ہی میلے میں آجاویں اور دونوں ساتھ ساتھ میلا دیکھیں، میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک وہ نہ آئیں گے ایک پیسہ بھی نہ خرچ کروں گا لیکن کیا معلوم تھا کہ بدقسمتی کچھ اور ہی دِکھلانے کو ہے، میلا پہنچے ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا مگر ہلدھر کا کہیں پتہ نہ تھا، کیا ابھی تک مولوی صاحب نے چھٹی نہیں دی یا راستہ بھول گئے؟ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک کی طرف دیکھتا تھا، تنہا میلا دیکھنے میں جی بھی نہ لگتا تھا یہ اندیشہ بھی ہو رہا تھا کہ کہیں چوری کھل تو نہیں گئی اور چچا صاحب ہلدھر کو پکڑ کر گھر تو نہیں لے گئے؟ آخر جب شام ہوگئی تو میں نے کچھ ریوڑیاں کھائیں اور ہلدھر کے حصے کے پیسے جیب میں رکھ کر آہستہ آہستہ گھر چلا، راستہ میں خیال آیا کہ مکتب ہوتا چلوں، شاید ہلدھر بھی

وہیں پر ہوں، مگر وہاں سناٹا تھا، ہاں، ایک لڑکا کھیلتا ہوا ملا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی زور سے قہقہہ لگایا، اور بولا "بچہ گھر جاؤ تو کیسی مار پڑتی ہے، تمھارے چچا آئے تھے، ہلدھر کو مارتے مارتے لے گئے ہیں، اجی، ایسا تان کر گھونسہ مارا کہ ہلدھر منھ کے بل گر پڑے، یہاں سے گھسیٹتے لے گئے ہیں، تم نے مولوی صاحب کو تنخواہ دے دی تھی وہ بھی لے لی، ابھی سے کوئی حیلہ سوچ لو ورنہ بے بھاؤ کی پڑے گی۔"

میرے حواس جاتے رہے، بدن کا خون خشک ہو گیا، وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ ہو رہا تھا، پیر من من بھر کے ہو گئے، گھر کی طرف ایک ایک قدم چلنا مشکل ہو گیا، دیوی دیوتاؤں کے جتنے نام یاد تھے سبھی کی منت مانی، کسی کو لڈو، کسی کو پیڑے، کسی کو بتاشے، گانو کے پاس پہنچا تو گانو کے ڈیہہ کا سمرن کیا کیونکہ اپنے حلقہ میں ڈیہہ کی مرضی ہی سب پر سبقت رکھتی ہے۔

یہ سب کچھ کیا مگر جیوں جیوں گھر نزدیک آتا دل کی دھڑکن بڑھتی جاتی تھی، گھٹائیں اُمنڈ آتی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پھٹ کر گرا ہی چاہتا ہے۔ دیکھتا تھا کہ لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں، مویشی بھی دُم اٹھائے گھر کی طرف اُچھلتے کودتے چلے جاتے تھے، چڑیاں اپنے گھونسلوں کی طرف اُڑی چلی جاتی تھیں، لیکن میں اسی سُست رفتاری سے چلا جاتا تھا، گویا پیروں میں طاقت ہی نہیں تھی، جی چاہتا تھا کہ زور کا بخار ہو جاوے، یا کہیں چوٹ لگ جاوے، لیکن کہنے سے دھوبی گدھے پر نہیں چڑھتا، بلانے سے موت بھی نہیں آتی، بیماری کا تو کہنا ہی کیا، کچھ نہ ہوا، اور باوجود سُست رفتاری کے گھر سامنے آ ہی گیا، اب کیا ہو؟ ہمارے دروازے پر املی کا ایک گھنا درخت تھا، میں اسی کی آڑ میں چھپ گیا کہ ذرا اور اندھیرا ہو جاوے تو چپکے سے اندر گھس جاؤں اور ماں کے کمرے میں پلنگ کے نیچے جا بیٹھوں جب سب لوگ سو جائیں گے تو ماں سے ساری داستان کہہ سناؤں، ماں کبھی نہیں مارتیں، ذرا ان کے سامنے جھوٹ موٹ روؤں گا تو وہ اور بھی پگھل جاویں گی۔ رات گزر جانے پر پھر کون پوچھتا ہے، صبح تک سب کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا، اگر یہ منصوبہ پورا ہو جاتا، تو اس میں شک نہیں کہ میں بے داغ بچ جاتا، مگر وہاں تو خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، مجھے ایک لڑکے نے دیکھ لیا اور میرے نام کی رَٹ لگاتے ہوئے سیدھا میرے گھر کے اندر کو بھاگا، اب میرے لیے کوئی اُمید نہ رہی، ناچار گھر میں داخل ہوا تو دفعتاً میرے منھ سے ایک چیخ نکل گئی جیسے مار کھایا ہوا کتا کسی کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر خوف سے چلانے لگتا ہے۔ بروٹھے میں والد صاحب بیٹھے تھے، والد صاحب کی صحت ان دنوں کچھ خراب ہو گئی تھی چھٹی لے کر گھر آئے ہوئے تھے، یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انھیں شکایت کیا تھی، مگر وہ مونگ کی دال کھاتے تھے، اور شام کے وقت شیشے کے گلاس میں ایک

بوتل میں سے کچھ اُنڈیل اُنڈیل کر پیتے تھے۔ شاید یہ کسی تجربہ کار حکیم کی بتلائی ہوئی دوا تھی، دوائیں سب بدبودار اور تلخ ہوتی ہیں یہ دوا بھی بری ہی تھی مگر والد صاحب نہ جانے کیوں اس دوا کو مزے لے لے کر پیتے تھے، ہم جو دوا پیتے ہیں تو ایک ہی گھونٹ میں آنکھیں بند کر کے پی جاتے ہیں مگر شاید اس دوا کا اثر آہستہ آہستہ پینے ہی سے ہوتا ہے، والد صاحب کے پاس گانوْ کے دو تین اور کبھی کبھی چار پانچ اور مریض بھی ہو جاتے تھے اور گھنٹوں دوا پیتے رہتے تھے۔ کھانا کھانے کے لیے مشکل سے اٹھتے تھے، اس وقت بھی وہ دوا پی رہے تھے، مریضوں کا مجمع لگا رہتا تھا، مجھے دیکھتے ہی والد صاحب نے سُرخ آنکھیں کر کے پوچھا: ''کہاں تھے اب تک؟''

میں نے دبی زبان سے کہا: ''کہیں تو نہیں۔''

''اب چوری کی عادت سیکھ رہا ہے، بول تو نے روپیہ چرایا یا نہیں؟''

میری زبان بند ہو گئی، سامنے شمشیر برہنہ ناچ رہی تھی، لفظ بھی منہ سے نکلتے ڈرتا تھا، والد صاحب نے زور سے ڈانٹ کر پوچھا: ''بولتا کیوں نہیں، تو نے روپیہ چرایا یا نہیں؟''

میں نے جان پر کھیل کر کہا: ''میں نے کہاں......''

منہ سے پوری بات نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ والد صاحب خوفناک شکل بنائے، دانت پیسے جھپٹ کر اُٹھے اور ہاتھ اٹھائے میری طرف بڑھے، میں زور سے چلا کر رونے لگا ایسا چلایا کہ والد صاحب بھی سہم گئے ان کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا، شاید سمجھے کہ جب ابھی سے اس کا یہ حال ہے تو طمانچہ پڑ جانے پر کہیں اس کی جان ہی نہ نکل جائے، میں نے جو دیکھا کہ میری حکمت کام کر گئی تو اور بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا، اتنے میں اس مجمع کے دو تین آدمیوں نے والد صاحب کو پکڑ لیا اور میری طرف اشارہ کیا کہ بھاگ جا، بچے اکثر ایسے مواقع پر اور بھی مچل جاتے ہیں اور مفت مار کھاتے ہیں، میں نے عقلمندی سے کام لیا۔

لیکن اندر کا منظر اس سے کہیں زیادہ خوفناک تھا، میرا تو خون سرد ہو گیا، ہلدھر کے دونوں ہاتھ ایک کھمبے سے بندھے تھے، سارے بدن میں مٹی لگی ہوئی تھی اور وہ ابھی تک سسک رہے تھے، شاید وہ صحن بھر میں لوٹے تھے، ایسا معلوم ہوا کہ سارا صحن ان کے آنسوؤں سے تر ہو گیا ہے، چچی ہلدھر کو ڈانٹ رہی تھیں، اور والدہ بیٹھی مسالہ پیس رہی تھیں، سب سے پہلے مجھ پر چچی کی نگاہ پڑی۔

بولیں: ''لو وہ بھی آ گیا کیوں رے، روپیہ تو نے چرایا تھا کہ اس نے؟''

میں نے بے دھڑک ہو کر کہا: ''ہلدھر نے۔''

والدہ بولیں: ''اگر اسی نے چرایا تھا تو تُو نے گھر آ کر کسی سے کہا کیوں نہیں؟''

اب جھوٹ بولے بغیر بچنا مشکل ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ جب آدمی کو جان کا خطرہ ہو تو جھوٹ بولنا قابلِ معافی ہے، ہلدھر مار کھانے کے عادی تھے دو چار گھونسے پڑ جانے سے ان کا کچھ نہ بگڑ سکتا تھا۔

میں نے مار کبھی نہ کھائی تھی، میرا تو دو چار ہی گھونسوں میں کام تمام ہو جاتا پھر ہلدھر نے بھی اپنے بچانے کے لیے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی، ورنہ چچی مجھ سے یہ کیوں پوچھتیں کہ روپیہ تو نے چرایا یا ہلدھر نے؟ کسی بھی اصول کے مطابق اس وقت میرا جھوٹ بولنا قابلِ تعریف نہیں تو قابلِ تصریف ضرور تھا میں نے فی الفور کہا: ''ہلدھر کہتے تھے کسی سے بتایا تو مار ہی ڈالوں گا۔''

ماں: ''دیکھا، وہی بات نکلی نہ، میں تو کہتی تھی کہ بچّہ کی ایسی عادت نہیں، پیسہ تو ہاتھ سے چھوتا ہی نہیں، مگر سب لوگ مجھی کو اُلو بنانے لگے۔''

ہلدھر: ''میں نے تم سے کب کہا تھا کہ بتاؤ گے تو ماروں گا؟''

میں: ''وہی تالاب کے کنارے تو۔''

ہلدھر: ''اماں، بالکل جھوٹ ہے۔''

چچی: ''جھوٹ نہیں، سچ ہے، جھوٹا تو تُو ہے اور سارا سنسار سچا؟ تیرا نام نکل گیا ہے نا، تیرا باپ بھی نوکری کرتا، باہر سے روپے کما لاتا، چار آدمی اُسے بھلا مانس کہتے تو تو بھی سچا ہوتا، اب تو تو ہی جھوٹا ہے جس کے بھاگ میں مٹھائی لکھی تھی اس نے مٹھائی کھائی، تیرے بھاگ میں تو لات کھانا ہی لکھا تھا۔''

یہ کہتے ہی چچی نے ہلدھر کو کھول دیا اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی، میرے بارے میں محبت آمیز رائے زنی کر کے ماں نے پانسہ پلٹ دیا تھا ورنہ ابھی نہ جانے بیچارے پر کتنی مار پڑتی، میں نے ماں کے پاس بیٹھ کر اپنی بے گناہی کا راگ خوب الاپا، میری سیدھی سادی ماں مجھے سچائی کا اوتار سمجھتی تھیں، انھیں یقینِ کامل ہو گیا کہ سارا قصور ہلدھر کا ہے، ایک لمحہ بعد میں گڑ چربن لیے ہوئے کوٹھری سے باہر نکلا، ہلدھر بھی اسی وقت چیوڑا چباتے ہوئے باہر نکلے، ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے اور اپنی اپنی سرگذشت سنانے لگے۔ میری سرگذشت سکھ بھری تھی اور ہلدھر کی دکھ بھری، انجام دونوں کا ایک تھا گڑ اور چربن۔

○

ایک طرف ایک مدّت سے رام لیلا دیکھنے نہیں گیا، بندروں کے بھدّے چہرے لگائے

نصف ٹانگوں کا پاجامہ، اور سیاہ رنگ کا اونچا کُرتا پہنے آدمیوں کو دوڑتے اور ''ہو ہو'' کرتے دیکھ کر اَب ہنسی آتی ہے، مزہ نہیں آتا، بنارس کی لیلا زمانہ میں مشہور ہے، سنا ہے کہ لوگ اسے دُور دُور سے دیکھنے آتے ہیں، میں بھی بڑے شوق سے دیکھنے گیا مگر مجھے تو وہاں کی لیلا اور کسی بالکل دیہاتی لیلا میں کوئی فرق نظر نہ آیا، ہاں، رام نگر کی لیلا میں کچھ ساز و سامان عمدہ ہے، راکھشسوں اور بندروں کے چہرے پیتل کے ہیں، گدائیں بھی پیتل کی ہیں، شاید بن باسی بھائیوں کے مکٹ سچے کام کے ہوں، لیکن ساز و سامان کے سوا وہاں بھی بجز ''ہو ہو'' کے اور کچھ نہیں، پھر بھی لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب مجھے بھی رام لیلا میں لطف آتا تھا۔ لطف تو بہت سُبک لفظ ہے، وہ لطف دیوانگی سے کم نہ تھا۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت رام لیلا کا میدان میرے مکان سے بہت کم فاصلہ پر تھا، اور جس مکان میں لیلا کرنے والوں کا رُوپ بھرا جاتا تھا وہ تو میرے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا، دو بجے دن سے بناؤ سنگار ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ میں دوپہر ہی سے وہاں جا بیٹھتا اور جس حوصلہ سے دوڑ دوڑ کر چھوٹے موٹے کام کرتا اس حوصلہ سے تو آج اپنی پنشن لینے بھی نہیں جاتا، ایک کوٹھری میں راجکماروں کا سنگار ہوتا تھا، اُن کے بدن پر ُرام راج' (سفیدی) پیس کر لگائی جاتی، چہرے پر پاؤڈر مَلا جاتا تھا اور پاؤڈر پر سُرخ سبز اور نیلے رنگ کی بندیاں دی جاتی تھیں، سارا ماتھا، بھنویں، گال اور ٹھوڑی ان بندیوں سے مزین ہو جاتی تھی، اس کام میں ایک ہی شخص ہوشیار تھا، وہی باری باری سے تینوں مورتوں کا سنگار کرتا تھا۔ رنگ کی پیالیوں میں پانی لانا ُرام راج' پیسنا، پنکھا جھلنا میرا کام تھا، جب ان ساری تیاریوں کے بعد بوان نکلتا تو اس پر رام چندر جی کے پیچھے بیٹھ کر مجھے فخر و مسرّت کا جو احساس ہوتا وہ اب لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی پر بیٹھ کر بھی نہیں ہوتا، ایک مرتبہ جب ہوم ممبر صاحب نے کونسل میں میری ایک تجویز کی تائید کی تھی اس وقت مجھے فخر و مسرّت کا کچھ ویسا ہی احساس ہوا تھا، ہاں ایک مرتبہ جب میرا لڑکا نائب تحصیلداری کے لیے نامزد ہوا اس وقت بھی کچھ اس طرح کے احساس سے دل پھڑک اٹھا تھا، مگر ان میں اور اس طفلانہ احساس کے لطف میں بڑا فرق ہے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس میں جنت میں بیٹھا ہوں۔

نکھاد کی ناؤ لیلا کا دن تھا، میں دو چار لڑکوں کے بہکانے میں آ کر گلی ڈنڈا کھیلنے لگا تھا۔ آج سنگار دیکھنے نہ گیا، بوان بھی نکلا مگر میں نے کھیلنا نہ چھوڑا۔ مجھے اپنا داؤں لینا تھا، اپنا داؤں چھوڑنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ ایثار کی ضرورت تھی، جتنا میں کر سکتا تھا، اگر داؤں دینا ہوتا تو میں کب کا بھاگ کھڑا ہوتا لیکن داؤں لینے میں کچھ اور ہی بات ہوتی ہے، خیر داؤں پورا ہوا،

اگر میں چاہتا تو دھوکا دے کر دس پانچ منٹ اور زچ کر سکتا تھا، اس کی کافی گنجائش تھی مگر اب اس کا موقع نہ تھا۔ میں سیدھا نالے کی طرف دوڑا، بوان لب آب پہنچ چکا تھا، میں نے دور سے دیکھا کہ ملاح کشتی لیے آرہا ہے، میں دوڑا مگر آدمیوں کے بھیڑ میں دوڑنا مشکل تھا، آخر جب میں بھیڑ کو ہٹاتا ہوا اور سخت کوشش سے آگے بڑھتا ہوا گھاٹ پر پہنچا تو نکھادا پنی کشتی کھول چکا تھا، رام چندر سے میری کتنی عقیدت تھی، میں اپنے سبق کی پروا نہ کرکے انھیں پڑھا دیا کرتا تھا کہ وہ فیل نہ ہو جائیں۔ مجھ سے زیادہ عمر والے ہو کر بھی وہ نیچے درجہ میں پڑھتے تھے مگر اس وقت وہی رام چندر کشتی میں بیٹھے اس طرح منہ پھیرے چلے جاتے تھے گویا مجھ سے ذرا بھی تعارف نہیں، نقل میں اصل کی کچھ بو باس آہی جاتی ہے جن کی چتون بھگتوں کے لیے بھی ہمیشہ تیکھی رہے، وہ مجھ پر کیوں التفاف کرتے۔ میں بے قرار ہو کر اس بچھڑے کی طرح کودنے لگا جس کی گردن پر پہلی مرتبہ جُوا رکھا گیا ہو، کبھی لپک کر نالے کی طرف جاتا کبھی کسی مدد کی تلاش میں پیچھے کی طرف دوڑتا مگر سب کے سب اسی دھن میں مست تھے، میری چیخ و پکار کسی کے کانوں تک نہ پہنچی۔ اس وقت سے بڑی مصیبتیں جھیلیں مگر اس وقت جتنا رنج ہوا اتنا عمر بھر کبھی نہ ہوا۔

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب رام چندر سے کبھی نہ ملوں گا، نہ کبھی کھانے کی چیز ہی انھیں دوں گا، مگر جوں ہی وہ نالے کو پار کر کے پل کی طرف سے لوٹے میں دوڑ کر بوان پر چڑھ گیا، اور ایسا خوش ہوا کہ گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔

رام لیلا ختم ہو گئی تھی، راج گدی ہونے والی تھی مگر نہ جانے کیوں دیر ہو رہی تھی، شاید چندہ کم وصول ہوا تھا، ان دنوں رام چندر جی کی کوئی بات نہ پوچھتا تھا، انھیں نہ تو گھر جانے کی اجازت ملتی تھی اور نہ ان کے کھانے پینے ہی کا انتظام ہوتا تھا، چودھری صاحب کے یہاں صرف ایک وقت کے کھانے کا سامان کوئی تین بجے دن کو ملتا تھا، بقیہ تمام دن کوئی پانی کو نہ پوچھتا تھا لیکن میری عقیدت ابھی جیوں کی تیوں برقرار تھی، میری نگاہوں میں وہ اب بھی رام چندر ہی تھے، مکان پر مجھے کھانے کی جو چیز ملتی اسے لے کر میں رام چندر ہی کو دے دیتا، انھیں کھلانے میں جو مسرت ہوتی تھی وہ خود کھانے میں کبھی نہ ہوتی، کوئی مٹھائی یا پھل پاتے ہی میں بے تحاشا چوپال کی طرف دوڑتا، اگر رام چندر وہاں نہ ملتے تو انھیں چاروں طرف تلاش کرتا اور جب تک وہ چیز انھیں نہ کھلا دیتا مجھے چین نہ آتا۔

خیر راج گدی کا دن آیا، رام لیلا کے میدان میں ایک بڑا شامیانہ نصب کیا گیا، اس کی خوب آرائش کی گئی، طوائفوں کا گروہ بھی آپہنچا۔ شام کو رام چندر کی سواری نکلی اور ہر دروازے

پر ان کی آرتی اُتاری گئی، اپنی اپنی عقیدت کے مطابق کسی نے روپے دیے اور کسی نے پیسے، میرے والد پولس کے آدمی تھے پس انھوں نے بلا کچھ پیشکش ہی آرتی اُتاری۔ اس وقت مجھے جتنی ندامت محسوس ہوئی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ اس وقت میرے پاس اتفاقاً ایک روپیہ تھا۔ میرے ماموں صاحب دسہرہ کے قبل آئے تھے اور مجھے ایک روپیہ دے گئے تھے، اس روپیہ کو میں نے رکھ چھوڑا تھا، دسہرہ کے دن بھی اسے خرچ نہ کر سکا، میں نے فوراً وہ روپیہ لا کر آرتی کی تھالی میں ڈال دیا، والد صاحب میری طرف غضب آمیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئے۔ انھوں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن منہ ایسا بنالیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میری اس دیدہ دلیری سے ان کی شان میں فرق آ گیا، رات کے دس بجتے بجتے اس رسم کا خاتمہ ہوا، آرتی کی تھالی روپے پیسوں سے بھری ہوئی تھی، ٹھیک تو کہہ نہیں سکتا مگر اب ایسا قیاس ہوتا ہے کہ کل ۲۴-۲۵ روپیوں سے کم نہ تھے۔ چودھری صاحب اس رقم سے کچھ زیادہ ہی خرچ کر چکے تھے، انھیں اس کی بڑی بے فکر ہوئی کہ کسی طرح کم از کم دو سو روپیہ اور وصول ہو جاویں اور اس کی بہترین ترکیب انھیں یہ معلوم ہوئی کہ رنڈیوں کے ذریعے محفل میں وصولی ہو، جب سب لوگ آ کر بیٹھ جاویں اور محفل کا رنگ جم جاوے تو آبادی جان حسن پرستوں کی کلائیاں پکڑ پکڑ کر ایسے ناز و انداز دکھلائے کہ لوگ شرماتے شرماتے بھی کچھ نہ کچھ دے ہی نکلیں۔ آبادی جان اور چودھری صاحب میں مشورہ ہونے لگا۔ اتفاقاً میں ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، چودھری صاحب نے سمجھا ہوگا یہ لونڈا ابھی کیا سمجھے گا، مگر یہاں بفضلہٖ عقل کے پتلے تھے، ساری داستان سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔

چودھری: ''سنو آبادی جان، یہ تمھاری زیادتی ہے، ہمارا تمھارا پہلا کوئی سابقہ تو ہے نہیں، ایشور نے چاہا تو یہاں ہمیشہ تمھاری آمد و رفت رہے گی، اب کے چندہ بہت کم آیا ورنہ میں تم سے اس قدر اصرار نہ کرتا آبادی۔''

آبادی: ''آپ مجھ سے بھی زمیندارانہ چالیں چلتے ہیں، کیوں؟ مگر یہاں حضور کی دال نہ گلے گی، واہ، روپے تو میں وصول کروں اور مونچھوں پر تاؤ آپ دیں، کمائی کا یہ اچھا ڈھنگ نکالا ہے! ایسی کمائی سے تو واقعی آپ تھوڑے دِنوں میں بادشاہ ہو جائیں گے، اس کے مقابلہ میں زمینداری جھک مارے گی۔ بس کل ہی سے ایک چکلہ کھول دیجیے، قسم خدا کی مالا مال ہو جایئے گا۔''

چودھری: ''تم تو مذاق کرتی ہو اور یہاں قافیہ تنگ ہو رہا ہے۔''

آبادی: ''تو آپ بھی تو مجھ سے استادی کرتے ہیں، یہاں آپ جیسے کاہلوں کو روز انگلی

پر نچاتی ہوں۔"

چودھری: "آخر تمھارا منشا کیا ہے؟"

آبادی: "جو کچھ وصول کروں اس میں نصف میرا اور نصف آپ کا، لائیے ہاتھ ماریے۔"

چودھری: "یہی سہی۔"

آبادی: "اچھا تو پہلے میرے سو روپیہ گنا دیجیے، بعد کو آپ حیلہ سازی کرنے لگیں گے۔"

چودھری: "واہ! وہ بھی لوگی اور یہ بھی۔"

آبادی: "اچھا تو کیا آپ سمجھتے تھے کہ اپنی اُجرت چھوڑ دوں گی۔ بلہاری آپ کی سمجھ کی۔ خوب، کیوں نہ ہو، دیوانہ بکار خویش ہشیار۔"

چودھری: "تو کیا تم نے دوگنی فیس لینے کی ٹھانی ہے۔"

آبادی: "اگر آپ کو سو دفعہ غرض ہو تو، ورنہ میرے ایک سو روپیے تو کہیں گئے نہیں مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے جو لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتی ہوئی پھروں۔"

چودھری کی ایک نہ چلی، انھیں آبادی جان سے دبنا ہی پڑا۔ ناچ شروع ہوا، آبادی جان بلا کی شوخ عورت تھی، ایک تو کمسن اور اس پر حسین اور اس کی ادائیں تو اس غضب کی تھیں کہ میری طبیعت بھی مست ہوئی جاتی تھی۔ لوگوں کے پہچاننے کا وصف بھی اس میں کچھ کم نہ تھا، جس کے سامنے بیٹھ گئی اس سے کچھ نہ کچھ لے ہی لیا، پانچ روپے سے کم تو شاید ہی کسی نے دیے ہوں۔ والد صاحب کے سامنے بھی وہ جا بیٹھی، میں شرم کے مارے گڑ گیا، جب اس نے کلائی پکڑی اس وقت تو میں سہم گیا، مجھے یقین تھا کہ والد صاحب اس کا ہاتھ جھٹک دیں گے اور شاید اسے پھٹکار بھی دیں، مگر یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایشور! میری آنکھیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں؟ والد صاحب مونچھوں میں ہنس رہے تھے، ایسی میٹھی ہنسی میں نے ان کے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی، ان کی آنکھیں نشۂ محبت سے سرشار تھیں، ان کا ایک ایک رونگٹا متحرک ہو رہا تھا مگر ایشور نے میری شرم رکھ لی، وہ دیکھو، انھوں نے آہستہ سے آبادی جان کے نازک ہاتھوں سے اپنی کلائی چھڑا لی، ارے، یہ پھر کیا ہوا؟ آبادی تو ان کے گلے میں بانہیں ڈالے دیتی ہے، اب کی والد صاحب اسے ضرور پیٹیں گے چڑیل کو ذرا بھی حیا نہیں۔

ایک صاحب نے مسکرا کر کہا: "یہاں تمھاری دال نہ گلے گی آبادی جان اور دروازہ دیکھو۔"

بات تو ان صاحب نے میرے دل کی کہی اور بہت مناسب کہی مگر نہ جانے کیوں والد صاحب نے ان کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا، اور مونچھوں پر تاؤ دیا، منہ سے تو وہ کچھ نہ بولے مگر ان کا بشرہ زبانِ حال سے غصہ بھرے لفظوں میں کہہ رہا تھا: 'تو بنیا، مجھے سمجھتا کیا

ہے؟ یہاں ایسے مواقع پر جان تک نثار کرنے کو تیار ہیں، روپیہ کی تو حقیقت ہی کیا ہے؟ تیرا جی چاہے تو آزمالے! تجھ سے دُگنی رقم نہ دے ڈالوں تو منہ نہ دکھلاؤں آہ حیرت، اُف غضب! ارے زمین تو شق کیوں نہیں ہو جاتی؟ آسمان تو پھٹ کیوں نہیں جاتا؟ آہ! مجھے موت کیوں نہیں آجاتی؟ والد صاحب جیب میں ہاتھ ڈال رہے ہیں، وہ کوئی چیز نکالی اور سیٹھ جی کو دِکھلا کر آبادی جان کو دے دی آہ! یہ تو اشرفی ہے، چاروں طرف تالیاں بجنے لگیں، سیٹھ جی الو بن گئے۔ والد صاحب سے منہ کی کھائی، یہ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، میں نے صرف اتنا دیکھا کی والد نے ایک اشرفی نکال کر آبادی جان کو دے دی، ان کی آنکھوں میں اس وقت ایسی فخر آمیز خوشی تھی گویا انھوں نے حاتم کی قبر پر لات ماری ہو، یہی والد صاحب تو ہیں جنھوں نے مجھے آرتی میں ایک روپیہ ڈالتے دیکھ کر میری طرف اس طرح دیکھا تھا گویا مجھے پھاڑ ہی کھائیں گے۔ میرے اس بجا اور مناسب برتاؤ سے ان کی شان میں فرق آتا تھا اور اس وقت ایسے نفرت آمیز اور مذموم طرزِ عمل پر وہ فخر و مسرت سے جامہ میں پھولے نہ ساتے تھے۔

بی آبادی جان نے ایک دِلربانہ تبسم کے ساتھ والد صاحب کو سلام کیا، پھر وہ آگے بڑھی، مگر مجھ سے وہاں نہ بیٹھا گیا، بارِ ندامت سے میرا سر جھکا جاتا تھا، اگر میری آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے اس پر کبھی اعتبار ہی نہ ہوتا۔ میں باہر جو کچھ دیکھتا سنتا تھا اس کی خبر والد صاحب کے کانوں تک ضرور پہنچا دیتا، مگر اس معاملہ کو میں نے ان سے پوشیدہ رکھا، میں جانتا تھا، انھیں اس بات سے بڑا رنج ہوگا۔

ساری رات گانا ہوتا رہا، طبلے کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی، جی چاہتا تھا کہ چل کر دیکھوں مگر ہمت نہ پڑتی تھی، میں کسی کو منہ کیسے دِکھاؤں گا، پر کہیں کسی نے والد صاحب کا تذکرہ کر دیا تو میں کیا کروں گا۔

علی الصبح رام چندر جی کی بدائی (رخصت) ہونے والی تھی، میں پلنگ سے اُٹھتے ہی آنکھیں ملتا ہوا چوپال کی طرف بھاگا، خوف ہو رہا تھا کہ کہیں رام چندر چلے نہ گئے ہوں، پہنچا تو دیکھا کہ طوائفوں کی سواریاں جانے کے لیے تیار ہیں بیسیوں آدمی حسرت بھرے دلوں کے ساتھ ان کے چاروں طرف جمع ہیں، میں نے ان کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی، سیدھا رام چندر کے پاس پہنچا، لکشمن اور سیتا بیٹھے رو رہے تھے اور رام چندر کھڑے کندھے پر لوٹا ڈور ڈالے انھیں سمجھا رہے تھے، میرے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا، میں نے مغموم لہجہ میں رام چندر سے پوچھا:
''کیا تمھاری بدائی ہوگئی؟''

رام چندر: ''ہاں، ہو تو گئی، ہماری بدائی ہی کیا؟ چودھری صاحب نے کہہ دیا جاؤ، چلے

جاتے ہیں۔''

میں:'' کیا روپے اور کپڑے نہیں ملے؟''

رام چندر:'' ابھی نہیں ملے، چودھری صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت صاحب بچت میں روپے نہیں ہیں، پھر آ کر لے جانا۔''

میں:'' کچھ نہیں ملا۔''

رام چندر:'' ایک پیسہ بھی نہیں، کہتے ہیں، کچھ بچت نہیں ہوئی، میں نے سوچا تھا، کچھ روپے مل جائیں گے تو پڑھنے کی کتابیں لے لوں گا سو کچھ نہ ملا، سفرخرچ بھی نہیں دیا۔ کہتے ہیں، کونسا دُور ہے، پیدل چلے جاؤ۔''

مجھے ایسا غصہ آیا کہ چل کر چودھری کو آڑے ہاتھوں لوں، رنڈیوں کے لیے روپے سواریاں سب کچھ مگر بیچارے رام چندر اور ان کے ساتھیوں کی لیے کچھ بھی نہیں، جن لوگوں نے آبادی جان پر دس دس بیس بیس روپے نچھاور کیے تھے ان کے پاس کیا انھیں دینے کے لیے دو دو چار چار آنے پیسے بھی نہیں ہیں۔ والد صاحب نے بھی تو آبادی جان کو ایک اشرفی دی تھی، دیکھوان کے نام پر کیا دیتے ہیں، میں دوڑا ہوا والد کے پاس گیا، وہ کہیں تفتیش پر جانے کو تیار کھڑے تھے، مجھے دیکھ کر بولے:'' کہاں گھوم رہے ہو؟ پڑھنے کے وقت تمھیں سیر کرنے کی سوجھتی ہے؟''

میں نے کہا:'' گیا تھا چوپال، رام چندر رخصت ہو رہے ہیں، انھیں چودھری صاحب نے کچھ نہیں دیا۔''

والد:'' تو تمھیں اس کی کیا فکر پڑی ہے۔''

میں:'' وہ جائیں گے کیسے؟ ان کے پاس سفرخرچ بھی تو نہیں ہے۔''

والد:'' کیا کچھ خرچ بھی نہیں دیا، یہ چودھری صاحب کی بے انصافی ہے۔''

میں:'' اگر آپ دو روپیہ دے دیں تو میں انھیں دے آؤں اتنے خرچ سے وہ شاید گھر پہنچ جاویں۔''

والد صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔'' جاؤ اپنی کتاب دیکھو میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے، اسی روز سے والد صاحب پر سے میرا اعتبار اُٹھ گیا، میں نے پھر کبھی ان کی ڈانٹ ڈپٹ کی پروا نہیں کی۔

میرا دل کہتا ہے کہ آپ کو مجھے نصیحت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، مجھے ان کی صورت سے

نفرت ہوگی، وہ جو کہتے، میں ٹھیک اس کے برعکس کرتا اگرچہ اس سے میرا ہی نقصان ہوا مگر اس وقت میرا دل غدّارانہ خیالات سے مملو تھا۔

میرے پاس دو آنے پیسے پڑے ہوئے تھے، میں نے پیسے اٹھالیے، اور جا کر شرماتے شرماتے رام چندر کو دے دیے۔ ان پیسوں کو دیکھ کر رام چندر کو جتنی خوشی ہوئی وہ میرے لیے اُمید سے زیادہ تھی ایک دم ٹوٹ پڑے گویا پیاسے کو پانی مل گیا۔

وہی دو آنے پیسے لے کر تینوں مورتیں رُخصت ہوگئیں، میں تنہا ان کو گاؤں کے باہر تک پہنچانے گیا۔

انھیں پہنچا کر لوٹا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے مگر دل میں مسرت کا دریا موجزن تھا۔

○

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے، لیکن صرف تین درجے آگے، انھوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا، جب میں نے شروع کیا، لیکن تعلیم جیسے اہم معاملے میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے، اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ عمارت پختہ ہوجائے۔

میں چھوٹا تھا، وہ بڑے تھے، میری عمر نو سال تھی، وہ چودہ سال کے تھے، انھیں میری تنبیہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا، اور میری سعادت مندی اس میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے، ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کاپی پر کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتوں، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے۔ کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار لکھ جاتے کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوشخط حروف میں نقل کرتے، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا نہ کوئی معنی مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں میں نے یہ عبارت دیکھی: اسپیشل، آئینہ، بھائیو، بھائیوں، دراصل بھائی بھن رادھے شیام، شری جت رادھے شیام، ایک گھنٹے تک —— اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں لیکن ناکام رہا، اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی، وہ نویں جماعت میں تھے، میں پانچویں جماعت میں، ان کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا، ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بارِ خاطر تھا، موقع پاتے

ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آ جاتا، اور کبھی کنکریاں اُچھالتا، کبھی کاغذ کی تتلیاں اُڑاتا، اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا، کبھی چہار دیواری پر چڑھ کر نیچے کود رہے ہیں، کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں لیکن کمرہ میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی، اور سارا مزا کر کرا ہو جاتا، پہلا سوال ہوتا، کہاں تھے؟ اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا، نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا، میری خاموشی اعتراف گناہ سمجھی جاتی، اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے ہوئے لہجہ میں کہتے، اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے اور ایک حرف نہ آئے گا، انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں کہ جو چاہے پڑھ لے۔ اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے، یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے تب جا کر کہیں انگریزی آتی ہے، اور میں کہتا ہوں کہ تم کتنے کورمغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے، میں کتنی محنت کرتا ہوں، یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمھارا قصور ہے، تمھاری عقل کا قصور ہے، اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں، میں کبھی نہیں جاتا، روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں، میں قریب نہیں پھٹکتا، ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں، اس پر بھی دو دو تین تین سال ایک ایک درجہ میں پڑا رہتا ہوں، پھر تم کیسے اُمید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے، مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے سڑتے رہو گے، اگر تمھیں اس طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کھیلو، دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا، جواب ہی کیا تھا، بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا، ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی۔ اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا، اور ذرا دیر کے لیے مجھ پر مایوسی آ جاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں، جو کام میرے بوتے کے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں، اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا۔ ٹائم ٹیبل بناتا، صبح اُٹھنا، منہ دھو کر ناشتہ کرنا، پھر انگریزی مطالعہ، سات سے آٹھ تک حساب، آٹھ سے نو تک تاریخ، نو سے ساڑھے نو تک کھانا کھا کر اسکول جانا، ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس، آدھ گھنٹے تک آرام، پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرامر، آدھ گھنٹہ آرام، چھ سے ساڑھے سات تک انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی، نو سے دس تک اُردو، دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔

مگر ٹائم ٹیبل بنالینا ایک بات تھی، اس پر عمل کرنا دوسری بات، پہلے ہی دن سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی، میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا، وہ دلآویز ہریالی، وہ پرلطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی، اور بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت کرنے کا موقع مل جاتا، میں ان کے سایہ سے بھاگتا، ان کی نگاہوں سے دُور رہنے کی کوشش کرتا، کمرہ میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انھیں خبر نہ ہو، ان کی نظر میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہوئی۔ ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی معلوم ہوتی، کتابوں سے نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

سالانہ امتحان ہوا، بھائی صاحب فیل ہو گئے، میں پاس ہو گیا، اور درجہ میں اوّل آیا۔ میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت ہو گیا، جی میں آیا بھائی صاحب کو آڑے ہاتھ لوں، آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی، مجھے دیکھیے مزے سے کھیلتا بھی رہا اور درجہ میں اوّل ہوں، لیکن وہ اس قدر پژمردہ شکستہ خاطر تھے کہ مجھے اُن سے دلی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا، ہاں اب مجھے خود پر کچھ اعتماد پیدا ہوا، اور بھائی صاحب کا وہ رُعب مجھ پر نہ رہا، آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا، اگر انھوں نے پھر نصیحت کی تو صاف کہہ دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کون سا تیر مارلیا، میں تو کھیلتے کودتے درجہ میں اوّل آ گیا، زبان سے یہ ہیکڑی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں، بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلّی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے: دیکھتا ہوں امسال پاس ہو گئے اور درجہ میں اوّل آ گئے تو اب تمھیں دماغ ہو گیا ہے، مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا، تمھاری کیا ہستی ہے، تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہوگا، اس کی زندگی سے تم نے آخر کیا نتیجہ نکالا، یوں ہی بڑھ گئے، محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں، اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا، راون ساری دنیا کا مہاراجہ تھا، ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں۔ آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر اُنھیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے، راون چکرورتی راجہ تھا، بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے، آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے، مگر اس کا انجام کیا ہوا، غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا، کوئی اسے ایک چلّو پانی دینے والا تک نہ بچا، انسان اور چاہے جو بُرائی کرے غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا، ابلیس کا حال بھی پڑھا ہوگا۔ اسے بھی غرور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنّت

سے دوزخ میں ڈھکیل دیا گیا۔ شاہ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا، بھیک مانگ کر مر گیا، تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا، اور ابھی سے تمہارا سر پھر گیا، تب تو تم آگے بڑھ چکے، یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے، اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی، مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے، بار بار نہیں لگ سکتی۔ کبھی کبھی گلی ڈنڈے میں بھی اندھے کا بے چوک نشانہ پڑ جاتا ہے، اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے۔ میرے فیل ہونے پر مت جاؤ، میرے درجے میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آجائے گا، جب الجبرا اور جامیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی، بادشاہوں کی نام یاد رکھنا آسان نہیں، آٹھ آٹھ ہنری ہو کر گزرے ہیں، کون سا واقعہ کس ہنری کے زمانہ میں ہوا، کیا اسے یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو، ہنری ساتویں کی جگہ ہنری آٹھویں لکھا اور سب نمبر غائب، صفر بھی نہ ملے گا، صفر بھی! ہو کس خیال میں۔ درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں اور درجنوں ولیم، کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا ہے، ان کم بختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے، ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے چلے گئے اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ! اب ج، کی جگہ اج ب لکھ دیا اور سارے نمبر کٹ گئے کوئی ان بے رحم ممتحنوں سے نہیں پوچھتا کہ آخر اب ج، اور اج ب، میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کے لیے طالب علموں کا خون کرتے ہو؟ دال بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کون سا فرق ہے مگر ممتحنوں کو کیا پروا، وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ چاہتے ہیں کہ سب لڑکے رٹو ہو جائیں، اسی رٹ کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے اور آخر ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا، اس خط پر دو عمود گرا دو تو قاعدہ عمود سے دوگنا ہوگا۔ پوچھیے اس سے کیا مطلب؟ دوگنا نہیں چوگنا ہو جائے، آٹھ گنا ہو جائے میری بلا سے، لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھتے پڑھتے ہیں کہہ دیا ''وقت کی پابندی'' پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو، اب کاپی کھولے ہوئے اس کے نام کو روئیے۔ کون نہیں جانتا کہ وقت کی پابندی اچھی بات ہے لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھیے؟ جو بات ایک جملے میں کہی جا سکے اس کے لیے چار صفحے لکھنے کی کیا ضرورت۔ میں تو اسے حماقت کہتا ہوں مگر نہیں آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے، چاہے جیسے لکھیے اور صفحے بھی پورے فل اسکیپ سائز کے، یہ لڑکوں پر ستم ناروا نہیں ہے تو کیا ہے؟ ظالم اس پر بھی یہ کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے کام لو، ایک ذرا سی بات پر تو آپ چار صفحے رنگواتے ہیں اور اس پر فرماتے ہیں کہ اختصار سے بھی کام لو، تیز بھی دوڑیے اور آہستہ آہستہ بھی، ہے متضاد یا نہیں، بچہ بھی سمجھ سکتا ہے، لیکن ان ماسٹروں کو

اتنی بھی تمیز نہیں، اس پر دعویٰ ہے کہ ہم ماسٹر ہیں۔ میرے درجہ میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اس درجہ میں اوّل آ گئے ہو تو اتنا اِتراتے ہو، لاکھ فیل ہو گیا، لیکن تم سے بڑا ہوں، دُنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے، میرا کہنا مانو جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو، ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا، ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی۔ مجھے آج کا کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا۔ جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ اُنھوں نے اپنے درجہ کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا۔ کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا، یہی تعجب ہے۔ لیکن یہ سب درگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور قائم رہی۔ کھیل کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا، مگر بہت کم، بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجہ میں ذلیل نہ ہونا پڑے اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

پھر سالانہ امتحان ہوا، اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بیچارے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے، میں نے محنت زیادہ نہیں کی، مگر خدا جانے کیسے درجہ میں اوّل آ گیا۔ مجھے خود تعجب ہوا، بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی، دس بجے رات تک، اُدھر چار بجے صبح سے، پھر اُدھر چھ سے ساڑھے نو تک، اسکول جانے کے قبل، چہرہ زرد ہو گیا تھا، مگر فیل! مجھے ان پر رحم آتا تھا نتیجہ سنایا گیا تو رو پڑے اور میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب صرف ایک درجہ کا تفاوت رہ گیا تھا میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں ان کے برابر ہو جاؤں، پھر کس بنا پر میری نصیحت کر سکیں گے، لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا، آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لیے، مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے ضرور، مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنادن پاس ہوتا جا رہا ہوں اور اتنے اچھے نمبروں سے!

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے، کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی انھوں نے تحمل سے کام لیا، شاید اب اُنھیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب انھیں نہیں رہا، یا رہا تو بہت کم، میری بدمعاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی، میں ان کے تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا۔ مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہو ہی جاؤں گا، پڑھوں یا نہ پڑھوں، میری تقدیر اچھی ہے، اس لیے

بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑی بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے کنکوے اُڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا، اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا، پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا، اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اڑاتا تھا، ساری جزئیات در پردہ عمل میں آتی تھیں، میں انھیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزّت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہاسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی، شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے ۔انھوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے: ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لیے دوڑتے تمھیں شرم نہیں آتی، تمھیں اس کا بھی لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو، بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو، اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو، آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے، ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے تحصیلدار ہو جاتے تھے، میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اوّل درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں، کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں، بی اے اور ایم اے والے ان کے ماتحت اور ان کے پیرو ہیں، اور تم اسی آٹھویں درجہ میں آ کر بازاری لونڈوں کی ساتھ کنکوے کے لیے دوڑتے ہو، افسوس ہے تمھاری اس ناعقلی پر، تم ذہین ہو، اس میں شک نہیں، لیکن وہ ذہن کس کام کی جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے، تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے میں ان سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں، اور اب انھیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے، میں تمھارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا، میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں، اور چاہے آج تم میری ہی جماعت میں آ جاؤ، اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں، اور ہمیشہ بڑا رہوں گا، مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کے برابر بھی نہیں آسکو گے، چاہے تم ایم اے اور ایل ایل بی ہی کیوں نہ ہو جاؤ، عقل کتابیں پڑھ لینے ہی سے نہیں آتی۔ ہماری امّاں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دُنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں امّاں اور دادا کو ہمیں تنبیہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا، محض اس لیے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے، امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے؟ اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں، یہ باتیں اُنھیں نہ معلوم ہوں، لیکن

ہزاروں ایسی باتیں ہیں جن کا علم اُنھیں ہم سے زیادہ ہے، آج میں خدانخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمھارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے، سوائے دادا کو تار دینے کے تمھیں اور کچھ نہ سوجھے گا لیکن تمھاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے بلکہ پہلے خود مرض پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے، گھبرائیں گے نہیں، بدحواس نہ ہوں گے۔ ہمارے خرچ کے لیے وہ جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں، ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں لیکن جتنا آج ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کی نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزّت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے اور ایک کنبہ کی پرورش کی ہے۔ جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے، یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم قریب آ گئے اور اب خود مختار ہو، میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کرنے پاؤ گے، میں جانتا ہوں تمھیں میری بات زہر لگ رہی ہے۔

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی نا سعادت مندی پر نادم ہو کر با چشمِ نم کہا: ”ہرگز نہیں، آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے، اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔“

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا، اور بولے: ”میں کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا۔ میرا جی بھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے۔ لیکن کیا کروں، خود بے راہ چلوں گا تو تمھیں ہدایت کیسے کروں گا، یہ فرض تو میرے سر پر ہے۔“

اتفاق سے اسی وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا، اس کی ڈور لٹک رہی تھی بھائی صاحب لمبے تھے، اُچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی، اور اسے لیے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے، میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

○

ہمارے انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ گلّی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجہ ہے، اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلّی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں، نہ لان (میدان) کی ضرورت نہ کَشن گارڈ کی، نہ نیٹ کی نہ بلّے کی، مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ کر گلّی بنائی، اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا، ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے سامان بہت مہنگے ہوتے ہیں، جب تک کم از کم ایک سو خرچ نہ کیجیے کھلاڑیوں میں شمار ہی نہیں ہو سکتا، یہاں گلّی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکری لگے چوکھا رنگ دیتا ہے، لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر دیوانے ہو رہے ہیں

کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہوگئی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں ہر ایک لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیلنے کی فیس لی جاتی ہے۔ کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ ہندستانی کھیلیں کھلائیں، جو بغیر پیسے کوڑی کے کھیلے جاتے ہیں، انگریزی کھیل ان کے لیے ہیں جن کے پاس روپیہ ہے۔ بیچارے غریب لڑکوں کے سر پر یہ فضول خرچیاں کیوں منڈھتے ہو ٹھیک ہے گلّی سے آنکھ پھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے تو کیا کرکٹ سے سر پھوٹ جانے، تلّی پھٹ جانے، ٹانگ ٹوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا، اگر ہمارے ماتھے میں گلّی کا داغ لگا ہوا ہے تو ہمارے کئی دوست ایسے بھی ہیں جو بلّے سے گھائل ہونے کا سرٹیفکیٹ رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند ہے مجھے گلّی ڈنڈا سب کھیلوں سے زیادہ پسند ہے اور بچپن کی یادوں میں گلّی ڈنڈا ہی سب سے زیادہ شیریں یاد ہے۔ وہ علی الصبح گھر سے نکل جانا، وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا اور گلّی ڈنڈے بنانا وہ جوش وخروش، وہ لگن، وہ کھلاڑیوں کے جمگھٹے، وہ پدنا اور پدانا، وہ لڑائی جھگڑے، وہ بے تکلف سادگی جس میں چھوت اچھوت اور غریب امیر کی کوئی تمیز نہ تھی، جس میں امیرانہ چونچلوں کی، غرور اور خودنمائی کی گنجائش ہی نہ تھی، وہ وقت کیسے وقت بھولے گا؟ جب گھر والے بگڑ رہے ہیں، والد صاحب چوکی پر بیٹھے ہوئے روٹیوں پر اپنا غصہ اُتار رہے ہیں، اماں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے لیکن ان کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے اور میں ہوں کہ پدانے میں مست ہوں، نہ نہانے کا خیال ہے نہ کھانے کا۔ گلّی ہے تو ذرا سی مگر اس میں دُنیا بھر کی مٹھاس، اور تماشوں کا لطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہمجولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا، دُبلا، لمبا، بندروں کی سی پھرتی، بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں، بندروں کی سی جھپٹ، گلّی کیسی ہو! اس پر اس طرح لپکتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا، پر تھا ہمارے گلّی ڈنڈا کلب کا چمپئن جس کی طرف وہ آ جائے اس کی جیت یقینی تھی، ہم سب اسے دور سے آتا دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے اور اسے اپنا گو یاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دو ہی کھیل رہے تھے۔ وہ پدا رہا تھا، میں پد رہا تھا لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں، پدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لیے وہ سب چالیں چلیں جو ایسے مواقع پر خلاف قانون ہوتے ہوئے بھی قابلِ معافی ہیں، لیکن گیا اپنا داؤں لیے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا، منت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا، گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا، اور ڈنڈا تان کر بولا: "میرا داؤں

دے کر جاؤ، پدایا تو بہادر بن کر، پدنے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟''

''تم دن بھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں؟''

''ہاں تمھیں دن بھر پدنا پڑے گا۔''

''نہ کھانے جاؤں نہ پینے جاؤں۔''

''ہاں میرا داؤں دیے بغیر کہیں نہیں جاسکتے''

''میں تمھارا غلام ہوں؟''

''ہاں، تم میرے غلام ہو۔''

''میں گھر جاتا ہوں، دیکھوں تم میرا کیا کر لیتے ہو؟''

''گھر کیسے جاؤ گے، کوئی دل لگی ہے، داؤں دیا ہے داؤں لیں گے۔''

''اچھا کل میں نے تمھیں امرود کھلایا تھا وہ رکھ دو۔''

''وہ پیٹ میں چلا گیا۔''

''نکالو پیٹ سے، تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟''

''امرود تم نے دیا، تب میں نے کھایا، میں تم سے مانگنے نہ گیا تھا۔''

''جب تک میرا امرود نہ دو گے میں داؤں نہ دوں گا''

میں سمجھتا تھا انصاف میری طرف ہے، آخر میں نے کسی غرض کے لیے ہی اسے امرود کھلا دیا ہوگا، کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے، بھیک تک تو غرض کے لیے ہی دیتے ہیں، جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اسے مجھ سے داؤں لینے کا کیا حق حاصل ہے، رشوت دے کر تو لوگ خون کھپا جاتے ہیں، وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائے گا، امرود پیسے کے پانچ والے تھے جو گیا کے باپ کو بھی نصیب نہ ہوں گے، یہ سراسر بے انصافی ہے۔

گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: ''میرا داؤں دے کر جاؤ، امرود سمرود میں نہیں جانتا۔''

مجھے انصاف کا زور تھا، میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا، وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔

میں نے گالی دی، اس نے اس سے بھی سخت گالی دی اور گالی ہی نہیں دی ایک چانٹا جما دیا، میں نے اسے دانت سے کاٹ لیا، اس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا، میں رونے لگا، گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا، بھاگا، میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا، اور ہنستا ہوا گھر پہنچا، میں تھانیدار کا لڑکا ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا، یہ مجھے اس وقت بھی بے عزتی کا باعث معلوم ہوا، لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہ کی۔

ان ہی دِنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہوگیا، نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہمجولیوں سے جدا ہو جانے کا بالکل افسوس نہ ہوا، والد صاحب افسوس کرتے تھے، یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی، اماں جی بھی بہت افسوس کرتی تھیں یہاں سب چیزیں سستی تھیں، اور محلے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہوگیا تھا لیکن میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا لڑکوں سے شیخی بگھارتا تھا، وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہیں، ایسے ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ وہاں کے انگریزی اسکول میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے، میرے دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہ میں کتنا اونچا اٹھ گیا ہوں۔ بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم، جو سچ کو جھوٹ بنا دیتے ہیں، نہیں سمجھ سکتے، دوست کہہ رہے تھے: ''تم خوش قسمت ہو، بھائی جاؤ ہمیں تو اسی گاؤں میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی۔''

بیس سال گذر گئے، میں نے انجینئری پاس کی اور کسی ضلع کا دورہ کرتا ہوا اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا، اس جگہ کو دیکھتے ہی اس قدر دلکش اور شیریں یاد تازہ ہو اٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی اور قصبے کی سیر کو نکلا، آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں لیکن اس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہ ملا۔ جہاں کھنڈر تھا وہاں پکّے مکانات کھڑے تھے، جہاں برگد کا پُرانا درخت تھا، وہاں اب ایک خوب صورت باغیچہ تھا۔ اس جگہ کی کایا پلٹ ہوگئی تھی، اگر اس کے نام ونشان کا علم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا۔ وہ پرانی یادگاریں بانہیں پھیلا پھیلا کر اپنے پرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لیے بیقرار ہو رہی تھیں، مگر وہ دُنیا بدل گئی تھی، جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر رودوں اور کہوں، تم مجھے بھول گئیں لیکن میرے دل میں تمھاری یاد تازہ ہے۔

اچانک ایک کھلی جگہ میں نے دو تین لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا، ایک لمحے کے لیے میں اپنے آپ کو بالکل بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں، صاحبی ٹھاٹ میں، رعب اور اختیار کے لباس میں، جا کر ایک لڑکے سے پوچھا: ''کیوں بیٹے! یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟''

ایک لڑکے نے گلی ڈنڈا سمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کون گیا، گیا چمار؟''

میں نے یونہی کہا۔ ''ہاں ہاں وہی، گیا نام کا کوئی آدمی ہے تو شاید وہی ہو۔''

''ہاں ہے تو۔''

''ذرا اسے بلا سکتے ہو؟''

لڑکا دوڑا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لیے آتا دکھائی دیا، میں نے دور سے ہی پہچان لیا، اس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اس کے گلے لپٹ جاؤں، مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا۔ ''کہو مجھے پہچانتے ہو؟''

گیا نے جھک کر سلام کیا، ''ہاں مالک، بھلا پہچانوں گا نہیں، آپ مزے میں رہے۔''

''بہت مزے میں، تم اپنی کہو''؟

''ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں''

''مانا، موہن، دُرگا یہ سب کہاں ہیں، کچھ خبر ہے؟''

''مانا تو مر گیا، موہن اور دُرگا دونوں ڈاکیے ہو گئے ہیں، آپ؟''

''میں ضلع کا انجینئر ہوں۔''

''سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین تھے''

''اب کبھی گلی ڈنڈا کھیلتے ہو؟''

گیا نے میری طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا: ''گلی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار، اب تو پیٹ کے دھندے سے ہی چھٹی نہیں ملتی۔''

''آؤ آج ہم تم کھیلیں، تم پدانا ہم پدیں گے، تمھارا ایک داؤں ہمارے اوپر ہے وہ آج لے لو۔''

گیا بڑی مشکل سے راضی ہوا، وہ ٹھہرا ٹکے کا مزدور، میں ایک بڑا افسر۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ۔ بیچارہ جھینپ رہا تھا لیکن مجھے بھی کچھ کم جھینپ نہ تھی، اس لیے نہیں کہ میں گیا کے ساتھ کھیلنے جا رہا تھا، بلکہ لوگ اس کھیل کو عجوبہ سمجھ کر اس کا تماشا بنا لیں گے اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی، اس بھیڑ میں وہ لطف کہاں رہے گا لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا، آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں بستی سے بہت دُور تنہائی میں جا کر کھیلیں وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہوگا، مزے سے کھیلیں گے اور، بچپن کی اس مٹھائی کو خوب مزے لے لے کر کھائیں گے، میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا، اور موٹر میں بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے۔ ساتھ ایک کلہاڑی لے لی۔ میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا، مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہ تھا، شاید ہم دونوں میں جو فرق ہو گیا تھا وہ اسے سوچنے میں محو تھا۔

میں نے پوچھا: ''تمھیں کبھی ہماری یاد آتی تھی گیا؟ سچ کہنا۔''

گیا جھینپتا ہوا بولا: ''میں آپ کو کیا یاد کرتا حضور، کس لائق ہوں، قسمت میں کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا، نہیں تو میری کیا گنتی۔''

میں نے کچھ اُداس ہو کر کہا: "لیکن مجھے تو تمھاری یاد برابر آتی تھی۔ تمھارا وہ ڈنڈا جو تم نے تان کر جمایا تھا، یاد ہے نا"

گیا نے شرماتے ہوئے کہا: "وہ لڑکپن تھا سرکار، اس کی یاد نہ دلاؤ۔"

"واہ! وہ میرے ان دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے۔ تمھارے اس ڈنڈے میں جو رس تھا وہ اب عزّت اور بڑائی میں پاتا ہوں نہ دولت میں۔ کچھ ایسی مٹھاس تھی، اس میں کہ آج تک اس سے من میٹھا ہوتا رہتا ہے۔"

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا جہاں آ کر ہم کسی وقت کنول کے پھول توڑ لے جاتے تھے اور اس کے جھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے، جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آ رہی ہے، میں لپک کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ کاٹ لایا، جھٹ پٹ گلّی ڈنڈا بن گیا، کھیل شروع ہو گیا، میں نے راب میں گلّی رکھ کر اُچھالی، گیا کے سامنے سے نکل گئی اس نے ہاتھ لپکایا جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو، گلّی اس کے پیچھے جا گری، یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلّی جیسے آپ ہی آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی، وہ اپنے دائیں بائیں کہیں ہو گلّی اس کی ہتھیلی میں ہی پہنچتی تھی۔ جیسے گلّیوں پر اس نے جادو کر کے انھیں بس میں کر لیا ہو، نئی گلّی، پرانی گلّی، چھوٹی گلّی، بڑی گلّی، نوک دار گلّی، سب ہی اس سے ہل جاتی تھیں، گویا اس کے ہاتھوں میں کوئی مقناطیسی طاقت ہے، جو گلّیوں کو کھینچ لیتی ہو، لیکن آج گلّی کو اس سے وہ محبّت نہیں رہی، پھر تو میں نے پدانا شروع کیا، میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا، مشق کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا، داؤں پورا ہونے پر بھی میں کھیلے جاتا تھا حالانکہ قاعدے کے مطابق گیا کی باری آنی چاہیے تھی، گلّی پر ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا ہی دُور پر گر پڑتی تو میں لپک کر اسے خود ہی اٹھا لاتا اور دوبارہ ٹل لگاتا، گیا یہ ساری بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا، مگر نہ بولتا تھا، گویا اُسے وہ تمام قاعدے قانون بھول گئے ہوں، اس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا۔ گلّی اس کے ہاتھ سے نکل کر ٹن سے ڈنڈے میں آ کر لگتی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کا کام تھا ڈنڈے سے ٹکرا جانا لیکن آج وہ گلّی ڈنڈے میں لگتی ہی نہیں، کبھی داہنے جاتی ہے، کبھی بائیں، کبھی آگے، کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹے پدانے کے بعد ایک بار گلّی ڈنڈے میں آ لگی، میں نے دھاندلی کی: "گلّی ڈنڈے میں نہیں لگی۔ پاس سے گئی، لیکن لگی نہیں۔"

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا: "نہ لگی ہوگی۔"

''ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا۔''

''نہیں بھیا، تم بھلا بے ایمانی کرو گے۔''

بچپن میں مجال تھی کہ میں ایسا گھپلا کر کے جیتا بچتا، یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا، لیکن آج میں اسے آسانی سے دھوکا دیے چلا جاتا تھا، گدھا ہے ساری باتیں بھول گیا۔

اچانک گلی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو، اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کا فریب چلانے کا مجھے اس وقت بھی حوصلہ نہ ہو سکا، لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں، میرا حرج ہی کیا ہے۔ مان گیا تو واہ واہ! ورنہ دو چار ہاتھ پدنا ہی تو پڑے گا، اندھیرے کا بہانہ کر کے گلا چھڑا لوں گا، پھر کون داؤں دینے آتا ہے۔

گیا نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ ''لگ گئی، لگ گئی، ٹن سے بولی۔''

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''تم نے لگتے دیکھا، میں نے تو نہیں دیکھا۔''

''ٹن سے بولی ہے سرکار۔''

''اور جو کسی اینٹ میں لگ گئی ہو۔''

میرے منہ سے یہ فقرہ اس وقت کیسے نکل گیا، اس پر مجھے خود حیرت ہے۔ اس سچائی کا جھٹلانا ایسا ہی تھا جیسے دن کو رات بتانا، ہم دونوں نے گلی ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا، لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

''ہاں سرکار کسی اینٹ سے لگی ہوگی، ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی۔''

میں نے پھر پدانا شروع کیا، لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا، اس لیے جب تیسری بار گلی ڈنڈے میں لگی تو میں نے بڑی فراخ دلی سے داؤں دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا: ''اب تو اندھیرا ہو گیا ہے بھیا، کل پر رکھو۔''

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہوگا، یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے اس لیے اسی وقت معاملہ صاف کر لینا اچھا ہوگا: ''نہیں نہیں ابھی بہت اُجالا ہے تم اپنا داؤں لے لو۔''

''گلی سوجھے گی نہیں۔''

''کچھ پروا نہیں۔''

گیا نے پدانا شروع کیا لیکن اب اسے بالکل مشق نہ تھی، اس نے دو بار ٹل لگانے کا ارادہ کیا لیکن دونوں ہی بار چوک گیا، ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا داؤں پورا کر چکا تھا۔ بیچارا گھنٹہ

پھر پدا لیکن ایک منٹ ہی میں اپنا داؤں کھو بیٹھا، میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا:

"ایک داؤں اور لے لو، تم تو پہلے ہی ہاتھ میں چُگ گئے۔"

"نہیں بھیّا اب اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"تمھاری مشق چھوٹ گئی، کیا کبھی کھیلتے نہیں ہو؟"

"کھیلنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے، بھیّا۔"

ہم دونوں موٹر پر جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر پہنچ گئے۔

گیا چلتے چلتے بولا۔ "کل یہاں گلی ڈنڈا ہوگا، سب ہی پرانے کھلاڑی کھیلیں گے، تم بھی آؤ گے؟ جب تمھیں فرصت ہو سب ہی کھلاڑیوں کو بلالوں۔"

میں نے شام کا وقت دیا اور وہ دوسرے دن میچ دیکھنے لگا، کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔ کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے، مگر بیشتر نوجوان تھے جنھیں میں پہچان نہ سکا۔ کھیل شروع ہوا، میں موٹر پر بیٹھا تماشا دیکھنے لگا، آج گیا کا کھیل اور اس کی کرامات دیکھ کر میں دنگ رہ گیا، وہ ٹل لگاتا تو گلّی آسمان سے باتیں کرتی۔ کل کی سی وہ جھجک، وہ ہچکچاہٹ، وہ بے دلی آج نہ تھی، لڑکپن کی جو بات تھی آج اس نے اسے کمالِ معراج تک پہنچا دیا، کہیں کل اس نے مجھے اس طرح پدایا ہوتا تو میں ضرور رونے لگتا، اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلّی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدانے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بے عنوانی کی، اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلّی دبوچ لی ہے۔ گیا کا کہنا تھا گلّی زمین سے لگ کر اُچھلی ہے۔ اس پر دونوں میں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی، نوجوان دب گیا، گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا، میں کھیل میں نہ تھا مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آ رہا تھا جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے، اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا کل میرے ساتھ کھیلا نہیں صرف کھیلنے کا بہانہ کیا، اس نے مجھے قابلِ رحم سمجھا، میں نے دھاندلی کی، بے ایمانیاں کیں اُسے ذرا بھی غصہ نہ آیا اس لیے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا مجھے کھلا رہا تھا، میرا جی رکھ رہا تھا، وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا، میں اب افسر ہوں، یہ افسری میرے اور اس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے، میں اب اس کا لحاظ پا سکتا ہوں، ادب پا سکتا ہوں لیکن اس کا ہمجولی نہیں بن سکتا۔ لڑکپن تھا، تب میں اس کا ساتھی تھا، ہم میں کوئی بھید نہ تھا، یہ عہدہ پا کر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں، وہ اب مجھے اپنا جوڑ نہیں سمجھتا، وہ بڑا ہو گیا ہے، میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

Hardayal Municipal Public Library
Accession No.........................

○

ایک واقعہ یاد آتا ہے جب اماں تین ماہ کے لیے اپنے میکے یا میری ننھال گئی تھیں اور میں نے تین مہینے میں ایک من گُڑ کا صفایا کر دیا تھا، یہی گُڑ کے دن تھے۔ نانا بیمار تھے اماں کو بلا بھیجا تھا، میرا امتحان قریب تھا، اس لیے میں ان کے ساتھ نہ جا سکا تھا، منو کو وہ لیتی گئیں۔ جاتے وقت اُنھوں نے ایک من گُڑ لے کر ایک مٹکے میں رکھا اور اس کے منہ پر ایک سکورا رکھ کر مٹی سے بند کر دیا۔ مجھے سخت تاکید کر دی کی مٹکا نہ کھولنا، میرے لیے تھوڑا سا گُڑ ایک ہانڈی میں رکھ دیا تھا، وہ ہانڈی میں نے ایک ہفتہ میں چٹ کر دی، صبح کو دودھ کے ساتھ گُڑ، دوپہر کو روٹیوں کے ساتھ گُڑ، تیسرے پہر دانوں کے ساتھ گُڑ، رات کو پھر دودھ کے ساتھ گُڑ، یہاں تک جائز خرچ تھا جس پر اماں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا، مگر مدرسہ سے بار بار پانی پینے کے بہانے گھر آتا اور دو ایک پنڈیاں نکال کر کھا لیتا، اس کی بجٹ میں کہاں گنجائش تھی اور مجھے گُڑ کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا کہ ہر وقت وہی نشہ سوار رہتا، میرا گھر میں آنا گُڑ کے سر شامت آنا تھا، ایک ہفتہ میں ہانڈی نے جواب دے دیا، مگر مٹکا کھولنے کی سخت ممانعت تھی اور اماں کے گھر آنے میں ابھی پونے تین مہینے باقی تھے، ایک دن تو میں نے طوعاً و کرہاً صبر کیا، لیکن دوسرے دن ایک آہ کے ساتھ صبر جاتا رہا اور مٹکے کی ایک نگاہِ شیریں کے ساتھ ہوش رخصت ہو گیا۔ میں نے کسی گناہِ کبیرہ کے احساس کے ساتھ مٹکے کو کھول کر اور ہانڈی بھر کر نکال کر اسی طرح مٹکے کو بند کر دیا اور عہد کر لیا کہ اس ہانڈی کو تین مہینے چلاؤں گا، چلے یا نہ چلے مگر میں چلائے جاؤں گا، مٹکے کو منزل ہفت خواں سمجھوں گا، جسے رستم بھی نہ کھول سکا تھا، میں نے مٹکے کی پنڈلیوں کو کچھ اس طرح قینچی لگا کر رکھا جیسے بعض دوکاندار دیا سلائی کی ڈبیاں کھول کر رکھ دیتے ہیں، ایک ہانڈی گُڑ خالی ہو جانے پر بھی مٹکا لبریز تھا، اماں کو پتہ ہی نہ چلے گا مواخذہ کی نوبت کیسے آئے گی، مگر دل اور زبان میں کشمکش شروع ہوئی کہ کیا کہوں، اور ہر بار فتح زبان ہی کے ہاتھ رہتی۔ یہ دو انگل زبان دل جیسے شہزور پہلوان کو نچا رہی تھی جیسے مداری بندر کو نچائے۔ اس کو جو آسمان میں اُڑتا ہے اور فلک الافلاک کے منصوبے باندھتا ہے اور اپنے زعم میں فرعون کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ بار بار ارادہ کرتا، دن بھر میں پانچ پنڈیوں سے زیادہ نہ کھاؤں گا لیکن یہ ارادہ شرابیوں کی توجہ سے زیادہ دیرپا نہ ہوتا تھا، گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹکتا۔ اپنے آپ پر ہنستا، نفرین کرتا، گُڑ کو تو کھا رہے ہو، مگر برسات میں سارا جسم سڑ جائے گا، گندھک کا مرہم لگائے گھومو گے۔ کوئی تمھارے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہ کرے گا۔ قسمیں کھاتا، علم کی، ماں کی، مرحوم باپ کی، گئو کی، ایشور کی، مگر اُن کا وہی

حشر ہوتا۔ دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے ہانڈی ختم ہوگئی، اس دن میں نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ ایشور سے پرارتھنا کی: بھگوان یہ میرا چنچل من مجھے پریشان کر رہا ہے۔ مجھے شکتی دو کہ اس کو قابو میں رکھ سکوں۔ مجھے اشت دہات کا لگام دو جو اس کے منھ میں ڈال دوں، یہ کمبخت مجھے اماں سے پٹوانے اور گھڑکیاں سنوانے پر تُلا ہوا ہے، تم ہی میری رکشا کرو تو بچ سکتا ہوں۔ میری آنکھوں سے اس ذوقِ عبودیت میں دو چار بوندیں آنسوؤں کی بھی گریں، لیکن ایشور نے بھی کچھ سماعت نہ کی اور گڑ کی خواہش مجھ پر غالب رہی۔ یہاں تک کہ دوسری ہانڈی کی مرثیہ خوانی کی نوبت آپہنچی۔ حسنِ اتفاق سے انھیں دنوں تین دن کی تعطیل ہوئی اور میں اماں سے ملنے ننھیال گیا، اماں نے پوچھا، گڑ کا مٹکا دیکھا ہے چیونٹے تو نہیں لگے، سیل تو نہیں پہنچی، میں نے مٹکے کو دیکھنے کی بھی قسم کھا کر اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا، اماں نے مجھے غرور کی نظروں سے دیکھا اور میری حکم پروری کے صلے میں مجھے ایک ہانڈی نکال لینے کی اجازت دے دی، ہاں تاکید بھی کر دی کہ منہ اچھی طرح بند کر دینا۔ اب تو وہاں مجھے ایک دن ایک جگ معلوم ہونے لگا، چوتھے دن گھر آتے ہی میں نے پہلا کام جو کیا وہ مٹکے کو کھول کر ہانڈی بھر نکالنا تھا، یکبارگی پانچ پنڈیاں اُڑا گیا، پھر وہی ہلّو بازی شروع ہوئی، اب کیا غم ہے، اماں کی اجازت مل گئی تھی۔ سیاں بھئے کوتوال اور ہانڈی غائب۔ آخر میں نے اپنے دل کی کمزوری سے مجبور ہو کر مٹکے کی کوٹھری کے دروازہ پر قفل ڈالا۔ اور اس کی کنجی دیوار کے ایک موٹے شگاف میں ڈال دی، اب دیکھیں تم کیسے گڑ کھاتے ہو، اس شگاف میں سے کنجی نکالنے کی صورت یہ تھی کہ تین ہاتھ دیوار کھود ڈالی جائے، اور اتنی ہمت مجھ میں نہ تھی مگر تین دن میں ہی صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا، اور ان تین دنوں میں بھی دل کی جو حالت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ حجرۂ شیریں کی طرف بار بار گرتا اور بے صبر نگاہوں سے دیکھتا اور ہاتھ مل کر رہ جاتا، کئی بار قفل کھٹکھٹایا کھینچا، جھٹکے دیے مگر ظالم خود بھی نہ ہمسا۔ کئی بار اس شگاف کا جائزہ لیا، اس میں جھانک کر دیکھا۔ ایک لکڑی سے اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر اس کی تہہ نہ ملی۔ طبیعت کھوئی ہوئی سی رہتی، نہ کھانے پینے میں کچھ مزا تھا، نہ کھیلنے کودنے میں، نفس بار بار منطق کے زور سے دل کو قائل کرنے کی کوشش کرتا، آخر گڑ اور کس مرض کی دوا ہے میں اسے پھینک تو دیتا نہیں کھاتا ہی تو ہوں، کیا آج کھایا کیا ایک ماہ بعد، اس میں کیا فرق ہے، اماں جان نے ممانعت کی ہے، بیشک، لیکن انھیں مجھے ایک جائز کام سے باز رکھنے کا کیا حق ہے، اگر وہ آج کہیں کھیلنے مت جاؤ یا درختوں پر مت چڑھو یا تالاب میں تیرنے مت جاؤ یا چڑیوں کے لیے کمپا مت لگاؤ، تتلیاں مت پکڑو، تو کیا میں مانے لیتا ہوں، آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں یا نہیں، تو پھر اس ایک

معاملے میں کیوں اماں کی ممانعت پر اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو قربان کر دوں۔ آخر چوتھے دن نفس نے فتح پائی، میں نے علی الصباح ایک کدال لے کر دیوار کھودنا شروع کیا، شگاف تھا ہی، کھودنے میں زیادہ وقت نہ ہوئی، آدھ گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد دیوار سے کوئی گز بھر لمبا اور تین انچ موٹا چپڑ چھوٹ کر نیچے گر پڑا اور شگاف کی تہہ میں وہ کلید کامیابی پڑی ہوئی تھی، جیسے سمندر کی تہہ میں موتی کی سیپ پڑی ہو، میں نے جھٹ پٹ اُسے نکالا اور فوراً دروازہ کھولا، مٹکے سے گڑ نکال کر ہانڈی میں بھرا، اور دروازہ بند کر دیا، مٹکے میں اس دست برد سے قابلِ احساس کمی واقع ہوگئی تھی، ہزار ترکیبیں آزمانے پر بھی اس کا خلا پُر نہ ہو سکا مگر اب کی بار میں نے اس چٹورے پن کا اماں جان کی واپسی تک خاتمہ کر دینے کے لیے کنجی کو کنوئیں میں ڈال دیا، قصہ طویل ہے، میں نے کیسے قفل توڑا، کیسے گڑ نکالا، اور مٹکا خالی ہو جانے پر کیسے اُسے پھوڑا اور اس کے ٹکڑے رات کو کنوئیں میں پھینکے اور اماں آئیں تو میں نے کیسے رو رو کر ان سے مٹکے کے چوری جانے کی داستان کہی، یہ بیان کرنے لگا، تو یہ واقعہ جو میں آج لکھنے بیٹھا ہوں ناتمام رہ جائے گا۔

میرے والد گورکھپور میں مقیم تھے، والدہ بیمار تھی اُن کی بہن بھی۔ اس وقت میری عمر تیرہ سال کی رہی ہوگی، ہندی بالکل نہ جانتا تھا، اردو کے ناول پڑھنے کا جنون تھا، مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، مولوی محمد علی ہردوئی نو اسی اس وقت کے مقبولِ عام ناول نگار تھے، ان کی تخلیقات جہاں مل جاتی تھیں، اسکول کی یاد بھول جاتا تھا، اور کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا تھا، اس زمانے میں رینالڈ (رینالڈس) کے ناولوں کی دھوم تھی، اردو میں ان کے ترجمے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے، میں بھی ان کا عاشق تھا، مرحوم حضرت ریاض جو اردو کے باکمال شاعر تھے اور جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، نے رینالڈ کی ایک تصنیف کا ترجمہ ''حرم سرا'' کے نام سے کیا تھا، اسی زمانے میں لکھنؤ کے ہفتہ وار ''اودھ پنچ'' کے ایڈیٹر مرحوم مولانا سجاد حسین نے، جو ہاسیہ رس (مزاح) کے امر کلاکار تھے، رینالڈ کے دوسرے ناول کا ''دھوکا عرف طلسمی فانوس'' کے نام سے ترجمہ کیا تھا، یہ ساری کتابیں میں نے اسی زمانے میں پڑھیں، اور پنڈت رتن ناتھ سرشار سے تو میری سیری ہی نہ ہوتی تھی، ان کی ساری تصنیفات میں نے پڑھ ڈالیں، ان دنوں میرے والد گورکھپور میں رہتے تھے، اور میں بھی گورکھپور کے مشن اسکول میں آٹھویں میں پڑھتا تھا، جو تیسرا درجہ کہلاتا تھا۔

[آٹھویں جماعت میں دھنپت کی عمر سولہ سال سے کم نہ ہوگی، دھنپت نے تیرہ ساڑھے تیرہ برس کی عمر میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا تھا]

ریتی پر ایک بک سیلر بدھی لال نام کا رہتا تھا۔ میں اس کی دکان پر جا بیٹھتا تھا اور اس کے اسٹاک سے ناول لے لے کر پڑھتا تھا، مگر دُکان پر سارا دن تو بیٹھ نہ سکتا تھا، اس لیے میں اس کی دُکان سے انگریزی کتابوں کے خلاصے اور نوٹس لے کر اپنے اسکول کے لڑکوں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا، اور اس کے معاوضے میں دُکان سے ناول گھر لا کر پڑھتا تھا۔ دو تین برسوں میں میں نے سینکڑوں ناول پڑھ ڈالے ہوں گے۔

(پریم چند کا، اگر یہ آخری بیان درست ہے تو انھوں نے چھٹی جماعت ہی سے یہ ناول پڑھنا شروع کر دیے ہوں گے کیوں کہ آٹھویں جماعت پاس کرتے ہی منشی عجائب لال کا گورکھپور سے تبادلہ ہو گیا تھا)

جب ناولوں کا اسٹاک ختم ہو گیا، تو میں نے نول کشور پریس سے نکلے ہوئے پُرانوں کے اُردو ترجمے پڑھے، اور "طلسم ہوشربا" کے کئی حصے بھی پڑھے، اس قدیم طلسمی کتاب کے سترہ حصے اس وقت نکل چکے تھے اور ایک ایک حصہ سُپر رائل کے سائز میں دو دو ہزار صفحات سے کم نہ ہوگا، اور ان سترہ حصوں کے بعد اس کتاب کے مختلف موضوعات پر پچیسیوں حصے چھپ چکے تھے، ان میں سے میں نے کئی پڑھے جس نے اتنے بڑے گرنتھ کی تخلیق کی تھی، اس کی قوتِ تخیل کس قدر زوردار ہوگی، اس کا صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں یہ داستانیں مولانا فیضی نے اکبر کی تفریحِ طبع کے لیے فارسی میں لکھی تھیں، اس میں کس قدر صداقت ہے کہہ نہیں سکتا لیکن اتنی طویل کہانی شاید ہی دُنیا کی کسی زبان میں ہو، اسے پوری انسائیکلوپیڈیا سمجھ لیجیے، ایک آدمی اپنی ساٹھ برس کی عمر میں نقل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا، تخلیق تو دوسری بات ہے۔

(گورکھپور کے دورانِ قیام) کمرے میں ہم دونوں (دھنپت اور ان کی سوتیلی ماں کا بھائی وِجے بہادر) رات کے وقت ہی رہتے تھے، وِجے بہادر عمر میں مجھ سے کم تھے، وہ ہمارے ساتھ تھے، یہاں بھی (جمن پور کی طرح) تمباکو والے کی دکان پر چلا جاتا کیوں کہ گھر پر کوئی دلچسپی نہ تھی، وہاں مجھے لکھنے کا بھی شوق ہوا تھا، میں لکھتا اور پھاڑتا، کبھی کبھی میرے والد صاحب حقہ پیتے پیتے میری کوٹھری میں بھی آ جاتے تھے، جو کچھ میں لکھ کر رکھتا وہ دیکھ لیتے اور پوچھتے ——'نواب کچھ لکھ رہے ہو؟' میں شرما کر گزر جاتا، لیکن اس موضوع میں والد صاحب کو کوئی دلچسپی نہ تھی، کیونکہ ایک تو ان کو کام کے مارے چھٹی نہ ملتی تھی دوسرے اس موضوع کے وہ جانکار بھی نہ تھے، میں رات کو چاہے جہاں رہوں، انھیں اس سے بحث نہیں، میں باہر رہتا تھا وہ اندر۔ شاید پہلے لوگ اسے اپنی ڈیوٹی نہ سمجھتے تھے۔

ان دنوں ہندو کالج نیا نیا کھلا تھا اور امید تھی کہ وہاں داخلہ مل جائے گا

اور فیس بھی معاف ہوجائے گی وہاں اُن کی لیاقت کی جانچ کی گئی، انگریزی کے امتحان میں تو سرخرو ہو گئے۔ لیکن

علم الحساب نے 'لٹیا ڈبودی، اس زمانے میں ریاضی کا مضمون لازمی مضمون ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ناامید و نامراد گھر لوٹ آئے، حساب میرے لیے ہمالیہ کی چوٹی تھی جس پر میں کبھی نہ چڑھ سکا۔

بعد میں محکمۂ تعلیم کی نوکری کے دوران میں انھوں نے دو مرتبہ پرائیویٹ طور پر انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا مگر ریاضی کے لازمی مضمون ہونے کے باعث وہ دونوں مرتبہ فیل ہوگئے لیکن جب ریاضی کا مضمون اختیاری ہوگیا تو میں نے دوسرے سبجیکٹ لے کر آسانی س انٹرمیڈیٹ پاس کرپا۔

دھنپت/پریم چند کے دل میں آگے پڑھنے کی تمنّا باقی رہی۔ گھر بیٹھ کر بھی کیا کرتے! سوچا "کسی طرح حساب پختہ کرکے کالج میں داخل ہوجاؤں۔ یہی دُھن تھی، مگر اس کے لیے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا۔" اور وہ شہر میں منتقل ہوگئے۔ اُنھوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ خالی وقت میں لائبریری جاکر ریاضی کا مطالعہ کریں گے لیکن یہاں بھی قصے کہانیوں کی کتابوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ موصوف فرماتے ہیں:

''حساب تو بہانہ تھا، ناول وغیرہ پڑھا کرتا، پنڈت رتن ناتھ (سرشار) کا 'فسانۂ آزاد' انھیں دنوں پڑھا، چندر کانتا سنتتت بھی پڑھا، بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں ملے پڑھ ڈالے۔'' (ماھنامہ "زمانہ" پریم چند نمبر:فروری ۱۹۳۷ء، ص ٦)

اپہلے پہل یہ مضمون ہندی میں "ہنس" کے "آتم کتھا" نمبر جنوری-فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ہندی میں "کفن" اور "منگل سوتر وانیہ رچنائیں" میں بھی شامل ہے۔ "چندر کانتا سنتتی" کے بارے میں منشی دیانرائن نگم مدیر "زمانہ" نے اپنے فٹ نوٹ میں درج ذیل تفصیل دی ہے: "بابو دیو کی نندکھتری کی مشہور ناول کا نام جو اٹھائیس جلدوں میں ہے، اور جس کا نام ہندی کی سو مشہور کتابوں میں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہندی پڑھنے اور لکھنے کا شوق پبلک میں پیدا ہوا۔"]

پریم چند نے ناقص کھلونے گھڑنے اور توڑنے کا عمل تو بہت پہلے ہی سے شروع کردیا تھا۔ لکھنے پھاڑنے کی اس جھنجھلاہٹ اور چھٹپٹاہٹ کے دوران انھیں اپنے رشتے کے ایک ادھیڑ عمر کے ماموں کے رومان کا قصہ معلوم ہوا جس سے انھیں ایک ڈرامہ لکھنے کی تحریک ملی۔ یہ واقعہ منشی عجائب لال کی موت سے پہلے کا ہے، امرت رائے "قلم کا سپاہی" صفحہ نمبر ۲۷ پر ان رشتے کے ماموں کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنتے ہیں کہ منشی رُوپ نرائن نام کے ایک سجن تھے، وجے بہادر (اور پریم چند کی سوتیلی

ماں) اسی زمانے میں میرے ایک ناطے کے ماموں کبھی کبھی ہمارے یہاں آیا کرتے تھے، ادھیڑ ہو گئے تھے لیکن ابھی تک بِن بیاہے تھے۔ پاس میں تھوڑی سی زمین تھی، مکان تھا لیکن بیوی کے بغیر سب کچھ سونا تھا، اس لیے گھر پر جی نہیں لگتا تھا، ناطے داروں میں گھوما کرتے تھے، اور سب سے یہی امید رکھتے تھے کہ کوئی ان کی شادی کرادے اس کے لیے سو دو سو خرچ کرنے کے لیے بھی تیار رہتے، آخر ایک بار انھوں نے بھی وہی کیا جو مجرد لوگ اکثر کیا کرتے ہیں۔ ایک چمارن کے تیرِ نظر سے گھائل ہو گئے، وہ ان کے یہاں گوبر پاتھنے، بیلوں کو سانی پانی دینے اور اسی طرح کے دوسرے متفرق کاموں کے لیے نوکر تھی، جوان تھی، چھبیلی تھی...... ماموں صاحب کا تشنہ دل میٹھے جل کی دھارا دیکھتے ہی پھسل پڑا، باتوں باتوں میں اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ ان کا عندیہ تاڑ گئی۔ ایسی اَلھڑ نہ تھی اور نخرے کرنے لگی، بالوں میں تیل بھی پڑنے لگا، چاہے سرسوں کا ہی کیوں نہ ہو، آنکھوں میں کاجل بھی چمکا، ہونٹوں پر مستی بھی اور کام میں ڈھیل بھی شروع ہوئی کبھی دو پہر کو آئی اور جھلک دِکھا کر چلی گئی، کبھی سانجھ کو آئی، اور ایک تیر چلا کر چلی گئی۔ بیلوں کو سانی پانی خود ماموں صاحب دے دیتے، گوبر دوسرے اٹھالے جاتے (اُس سرتا پا قیامت پر) بگڑتے بھی تو کیوں کر، وہاں تو اب محبت طلوع ہوئی تھی، ہولی پر (چلی آرہی) روایت کے مطابق ایک ساڑی دی مگر اس مرتبہ گزی کی (سستی) ساڑی نہ تھی۔ خوبصورت سی ساو دروپے کی چندری تھی، ہولی کی تہواری بھی معمول سے چوگنی دی، اور یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ وہ چمارن ہی گھر کی مالکن ہو گئی۔

ایک روز شام کے وقت چماروں نے آپسی پنچایت کی، بڑے آدمی ہیں تو ہوا کریں، کیا کسی کی عزت لیں گے؟...... اس لیے طے ہوا کہ لالا صاحب کو ایسا سبق دینا چاہیے کہ ہمیشہ کے لیے یاد رہ جائے۔ عزت کا بدلہ خون ہی چکاتا ہے، لیکن مرمت سے بھی کچھ (حد تک) اس کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

دوسرے روز جب شام کو چمپا ماموں صاحب کے گھر میں آئی تو انھوں نے اندر سے دروازہ بند کر دیا، مہینوں کے تذبذب جھجک اور ذہنی کشمکش کے بعد آج ماموں صاحب نے اپنے عشق کا آخری مرحلہ طے کرنے کی ٹھان لی تھی۔

اُدھر چماروں کا جتھا تاک میں تھا، اِدھر کواڑ بند ہوئے اُدھر انھوں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا، پہلے ماموں صاحب نے سمجھا کوئی آسامی ملنے آیا ہوگا، دروازہ بند پاکر لوٹ جائے گا، لیکن جب آدمیوں کا شور غل سنا تو گھبرائے۔ جاکر کواڑ کی دراز سے جھانکا، کوئی بیس پچیس چمار لاٹھیاں لیے دروازہ روکے کھڑے کواڑوں کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب کریں تو

کیا، بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں، چمپا کو کہیں چھپا نہیں سکتے۔ سمجھ گئے کہ شامت آ گئی، عاشقی اتنی جلدی گل کھلائے گی یہ کیا جانتے تھے، ورنہ اس چمارن پر دل کو آنے ہی نہ دیتے، اُدھر چمپا اُن ہی کو کوس رہی تھی، تمھارا کیا بگڑے گا میری تو عزت لٹ گئی، گھر والے مُنڈی کاٹ کر ہی چھوڑیں گے۔ کہتی تھی کبھی کواڑ بند نہ کرو، ہاتھ پانو جوڑتی تھی مگر تمھارے سر پر تو بھوت سوار تھا، لگی منہ میں کالک کہ نہیں؟

ماموں صاحب بیچارے کبھی اس کوچے میں نہ آئے تھے، کوئی پکا کھلاڑی ہوتا تو سو اُپائے نکال لیتا، لیکن ماموں صاحب کی تو جیسے سٹی پٹی بھول گئی، دالان میں تھر تھر کانپتے ہنومان چالیسا کا پاٹھ کرتے ہوئے کھڑے تھے، کچھ نہ سوجھتا تھا۔

اور اُدھر دروازے پر شور وغل بڑھتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ سارا گانو جمع ہو گیا، باہمن، ٹھاکر، کائستھ سبھی تماشہ دیکھنے اور ہاتھ کی کھجلی مٹانے کے لیے آ پہنچے۔ اس سے زیادہ تفریحی اور دلچسپ ڈرامہ کیا ہوگا کہ ایک مرد ایک عورت کے ساتھ گھر میں بند پایا جائے۔ بڑھئی بلایا گیا، کواڑ پھوڑے گئے اور ماموں صاحب بھوسے کی کوٹھری میں چھپے ہوئے ملے۔ چمپا آنگن میں کھڑی رو رہی تھی، دروازہ کھلتے ہی بھاگی، کوئی اس سے نہیں بولا، ماموں صاحب بھاگ کر کہاں جاتے، وہ جانتے تھے ان کے لیے بھاگنے کا راستہ نہیں ہے، مار کھانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ مار پڑنے لگی اور بے بھاؤ کی پڑنے لگی، جس کے ہاتھ میں جو کچھ لگا، جوتا چھڑی چھاتا، لات، گھونسا، سبھی ہتھیار چلے، یہاں تک کہ ماموں صاحب بے ہوش ہو گئے، اور لوگوں نے انھیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اب اتنی دُرگت کے بعد وہ بچ بھی گئے، تو گانو میں نہیں رہ سکتے اور ان کی زمین پٹی داروں کے ہاتھ آئے گی۔

اس حادثے کی خبر اُڑتے اُڑتے ہمارے یہاں بھی پہنچی، میں نے بھی اس کا خوب مزا اُٹھایا، پٹتے وقت ان کی کیا رُوپ ریکھا رہی ہوگی۔ اس کا تصور کر کے مجھے ہنسی آئی۔

ایک مہینے تک وہ ہلدی اور گڑ پیتے رہے، جونہی چلنے پھرنے لائق ہوئے ہمارے یہاں آئے، یہاں اپنے گانو والوں پر ڈاکے کا استغاثہ دائر کرنا چاہتے تھے۔

اگر انھوں نے کچھ عجز دکھایا ہوتا تو شاید مجھے ہمدردی ہو جاتی، لیکن ان کا وہی دم خم تھا، مجھے کھیلتے یا ناول پڑھتے دیکھ کر بگڑنا اور رعب جمانا اور والد صاحب سے شکایت کرنے کی دھمکی دینا، یہ اب میں کیوں سہنے لگا؟ اب تو میرے پاس اُنھیں نیچا دکھانے کا کافی مسالہ تھا۔

آخر ایک دن میں نے یہ ساری دُرگھٹنا ایک ناٹک کی شکل میں لکھ ڈالی، اور اپنے دوستوں کو سنائی، سب کے سب خوب ہنسے، میرا حوصلہ بڑھا، میں نے اُسے صاف صاف لکھ کر وہ کاپی

ماموں صاحب کے سرہانے رکھ دی، اور اسکول چلا گیا، دل میں کچھ ڈرتا بھی تھا، کچھ خوش بھی تھا اور کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا، سب سے بڑا تذبذب یہ تھا کہ ڈرامہ پڑھ کر ماموں صاحب کیا کرتے ہیں، اسکول میں جی نہ لگا، دل اُدھر ہی ٹنگا ہوا تھا۔ چھٹی ہوتے ہی گھر چلا گیا، مگر دروازے کے اندر آ کر قدم رُک گئے، خدشہ ہوا کہیں ماموں صاحب مجھے مارنہ بیٹھیں، لیکن اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک آدھ تھپڑ سے زیادہ مجھے مار نہ سکیں گے کیوں کہ میں مار کھانے والے لڑکوں میں نہ تھا۔

مگر یہ معاملہ کیا ہے! ماموں صاحب چارپائی پر نہیں ہیں جہاں وہ ہمیشہ لیٹے ہوئے ملتے تھے، کیا گھر چلے گئے؟ آ کر کمرہ دیکھا، وہاں بھی سنّاٹا تھا، ماموں صاحب ضروری کام سے گھر چلے گئے کھانا تک نہیں کھایا۔

میں نے باہر آ کر سارا کمرہ چھان مارا مگر میرا ڈرامہ، میری پہلی تخلیق، کہیں نہ ملی، معلوم نہیں، ماموں صاحب نے اُسے چراغ علی کے سپرد کر دیا یا اپنے ساتھ سورگ لے گئے؟

○

شروع میں والد شاید بیس روپیہ پاتے تھے، چالیس روپیہ تک پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہو گیا، یوں تو وہ بڑے دُور اندیش محتاط اور دُنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے آدمی تھے، لیکن آخری عمر میں ایک ٹھوکر کھا ہی گئے اور خود تو گرے ہی تھے اُسی دھکے میں مجھے بھی گرا دیا۔ پندرہ برس کی عمر میں اُنھوں نے میری شادی کر دی، میرے لیے عورت دُنیا کی سب سے حسین شے تھی، جب سے ہوش سنبھالا تب ہی سے اس حسینہ کا تصور کرنا شروع کیا، جو دل کی رانی ہوگی، اس طلوعِ سحر کی شگفتگی ہوگی، پھول کی نزاکت، کندن کی چمک، بسنت کی فرحت، کوئل کی آواز، وہ سارے شاعرانہ اوصاف سے مزین ہوگی۔

شادی طے ہوگئی، میں نے عروس کو ایک نظر دیکھنے کی بہت ضد کی لیکن جب ماموں نے یقین دلایا کہ لڑکی نہایت حسین ہے تو خاموش ہو گیا، دھوم دھام سے شادی ہوگئی، دلہن زیوروں سے لدی ہوئی منڈپ میں لائی گئی تو اس کے ہاتھ پانو نظر آئے، کتنی نازک اور خوبصورت انگلیاں تھیں، اعضا کا تناسب کتنا دلکش تھا، دوسرے دن رخصتی ہوگئی۔

بار بار اپنے گھوڑے کو دلہن کی پالکی کے پاس لاتا لیکن درشن نہ ہوتے تھے، پالکی پر موٹا پردہ پڑا ہوا تھا، چلتے چلتے دوپہر ہوگئی، کہاروں نے ایک درخت کے سایہ میں پالکی اُتار دی، اور چنا چبینہ کرنے کے لیے کنوئیں پر چلے گئے، منہ مانگی مراد ملی، چپکے سے دلہن کے پاس جا پہنچا، وہ پالکی سے سر نکالے گھونگھٹ ہٹائے باہر جھانک رہی تھی، اُسے دیکھا اور سر پیٹ لیا، نفرت،

غصہ، اور مایوسی نے جیسے دل کو کچل دیا، یہ وہ حسن ونزاکت کی دیوی نہ تھی یہ ایک چوڑے منہ، چپٹی ناک اور پھولے ہوئے رخساروں والی مکروہ صورت عورت تھی، جس پر صنفِ نازک کا کسی طرح بھی اطلاق نہ ہوسکتا تھا، ساری مستی رخصت ہوگئی، آہ! اس بھاگوان کو میرے ہی گلے پڑنا تھا! کیا اس کے لیے دُنیا میں اور کوئی شوہر نہ ملتا تھا، ماموں پر غصہ آیا، جس نے عروس کی تعریفوں کی پُل باندھ دیے تھے، مگر خیریت ہوئی کہ وہ اس وقت وہاں نہ تھے، میں سوچنے لگا، میں اس عورت سے کیسے بولوں گا؟ کیسے اس کے ساتھ یہ زندگی بسر کروں گا، اس کی طرف تو تاکنے ہی سے نفرت ہوتی ہے، ایسی مکروہ صورتیں بھی دُنیا میں ہیں اس کی مجھے خبر نہ تھی، کیا منہ ایشور نے بنایا ہے، کیا آنکھیں ہیں......لاحول ولاقوۃ......

ماموں سے لڑا، سسر کو ایک طولانی عتاب نامہ لکھا، ماں باپ سے رد و کد کی، اور آخر گھر سے بھاگ جانے کے منصوبے باندھنے لگا، آشا پر مجھے رحم آتا تھا، اور اپنے تئیں سمجھاتا کہ اس میں اس غریب کی کیا خطا ہے، اس نے زبردستی تو مجھ سے شادی نہیں کی، لیکن یہ رحم اور تحمل اس نفرت پر غالب نہ آسکتا تھا، جو آشا کو دیکھتے ہی میری رگ رگ میں سرایت کر جاتی تھی، آشا اپنے اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی، طرح طرح سے بال سنوارتی، آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر سنگار کرتی، لیکن مجھے یہ شتر غمزے معلوم ہوتے تھے، کئی کئی دن گھر میں نہ آتا، بھول جانا چاہتا تھا کہ بیاہ ہوگیا ہے۔

چند سال بعد ہی والد صاحب کو سفرِ آخرت درپیش ہوگیا۔ اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا، گھر میں میری بیوی، سوتیلی ماں اور ان کے دو لڑکے تھے، مگر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی، گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہوگیا، مجھے ایم اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے شاید دس بارہ روپیہ کی کوئی جگہ پا جاتا، مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دُھن تھی، مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

پاؤں میں جوتے نہ تھے، بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے، گرانی الگ، دس سیر کے جو تھے، اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی، کوئینس کالج بنارس میں پڑھتا تھا، ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کردی تھی۔ جب والد کا انتقال ہوا میرا امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا، جاڑے کا موسم تھا، چار بجے شام کو پہنچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا، وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہنچ

سکتا، سویرے پھر آٹھ بجے گھر سے چل دیتا ورنہ وقت پر اسکول نہ پہنچتا، رات کو کھانا کھا کر کپّی کی سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔

میٹریکولیشن تو کسی طرح پاس ہوگیا لیکن سکنڈ ڈویزن میں پاس ہوا اور کوینس کالج میں داخلہ کی کوئی اُمید نہ رہی، فیس صرف اوّل درجہ میں پاس ہونے والوں کی معاف ہو سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے اُسی سال ہندو کالج کھل گیا تھا۔ میں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر رچرڈسن پرنسپل تھے، ان کے مکان پر گیا، وہ سر سے پاؤں تک ہندستانی لباس میں ملبوس تھے، اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا، میری گذارش سن کر، ابھی میں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا، بولے کہ: ''گھر پر میں کالج کی بات نہیں سنتا۔'' ناچار کالج گیا۔ ملاقات تو ہوئی مگر نا اُمیدی کے سوائے کوئی نتیجہ نہ نکلا، اب کیا کروں، اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پر غور ہوتا، لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا۔

روز گھر سے اسی ارادہ سے نکلتا کہ کہیں سے سفارش لکھالاؤں لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو یوں ہی گھر واپس آجاتا، شہر میں کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ تھا۔

کئی دنوں کے بعد ایک سفارش ملی، ایک صاحب ٹھاکر اِندر نارائن سنگھ ہندو کالج کی مجلسِ انتظامیہ کے رُکن تھے، ان سے جا کر رو دیا، اُنھیں مجھ پر رحم آ گیا اور اُنھوں نے سفارشی چٹھی لکھ دی، اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی، بہر حال خوش خوش گھر آیا، دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا لیکن گھر پہنچتے ہی مجھے بخار آ گیا اور دو ہفتہ سے پہلے نہ ٹلا، نیم کا کاڑھا پیتے پیتے ناک میں دَم آ گیا، ایک دن دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پروہت جی آ گئے، میری حالت دیکھ کر مزاج پرُسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑ کھود لائے اور اُسے دھو کر سات دانے کالی مرچ کے ساتھ پسوا کر مجھے پلا دیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا، بخار چڑھنے میں گھنٹے بھر کی دیر تھی مگر اس دوا نے گویا گھنٹہ بھر کے اندر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے پنڈت جی سے بار بار اس جڑی کا نام پوچھا مگر اُنھوں نے نہ بتایا، کہا نام بتا دینے سے اس کا اثر جاتا رہے گا۔

غرض ایک مہینہ کے بعد دوبارہ مسٹر رچرڈسن سے ملا اور اُنھیں ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط دِکھلایا، اُنھوں نے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اتنے دنوں تک کہاں تھے؟''

''بیمار ہو گیا تھا۔''

''کیا بیماری تھی؟''

میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا، اگر بخار بتاتا ہوں تو شاید صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں، بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی جس کے لیے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی، کوئی ایسی بیماری بتانے کی فکر ہوئی جو مجبوری اور تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی اُبھار سکے، اُس وقت مجھے اور کسی بیماری کا نام یاد نہ آیا، ٹھاکر اندرنارائن سنگھ سے جب میں سفارش کے لیے ملا تھا تو اُنھوں نے اپنے اختلاجِ قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا، ان کے الفاظ مجھے یاد آ گئے۔

میں نے کہا: ''پلپی ٹیشن آف ہاٹ سر۔'' (Palpitation of heart sir)

صاحب نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا: ''اب تم بالکل اچھے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا فارم داخلہ بھر کر لاؤ۔''

میں نے سمجھا بیڑا پار ہوا، فارم لیا، خانہ پُری کی اور پیش کر دیا، صاحب اُس وقت کسی کلاس میں پڑھا رہے تھے، تین بجے مجھے فارم واپس ملا، اُس پر لکھا تھا ''اس کی لیاقت کی جانچ کی جائے۔''

یہ نیا مرحلہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا، انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی اُمید نہ تھی اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی، جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا، اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے، تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا اور اپنا فارم دکھایا، پروفیسر صاحب بنگالی تھے، انگریزی پڑھا رہے تھے، واشنگٹن اورنگ کا "Rip Van Winkle" کا سبق تھا۔ میں پیچھے کی قطار میں جا کر بیٹھ گیا، اور دو ہی چار منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہونے پر انھوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کیے اور میرے جوابات سن کر میری عرضی پر ''اطمینان بخش'' کا لفظ لکھ دیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا، اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے، میں نے اپنا فارم دِکھایا، نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلبا آتے ہیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی، یہاں بھی یہی حال تھا، کلاسوں میں کم استعداد اور نا قابل طلبا بھرے پڑے تھے، پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا، بھوک میں ساگ پات بھی لذیذ معلوم ہوتا ہے، مگر اب پیٹ بھر گیا تھا، طلبا چن چن کر لیے جاتے تھے۔ اِن پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہو گیا، فارم پر حساب کے خانہ میں ''نا قابلِ اطمینان'' لکھ دیا گیا۔

میں اتنا نا اُمید ہوا کہ فارم لے کر پھر دوبارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا، سیدھا گھر چلا آیا،

حساب میرے لیے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی تھی جس پر میں کبھی نہ چڑھ سکا، انٹرمیڈیٹ میں حساب کے امتحان میں دو مرتبہ فیل ہوا اور نا اُمید ہو کر امتحان دینا چھوڑ دیا، دس بارہ سال کے بعد جب ریاضی کا مضمون اختیاری ہو گیا تو میں نے دوسرے سبجیکٹ لے کر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا، اُس وقت تک ریاضی کی بدولت صد ہا طلبا کی آرزوؤں کا خون ہوا، خیر میں نا اُمید ہو کر گھر تو لوٹ آیا لیکن پڑھنے کی تمنا باقی رہی، گھر پر بیٹھ کر کیا کرتا، کسی طرح حساب پختہ کر کے پھر کالج میں داخل ہو جاؤں، یہی دُھن تھی، مگر اس کے لیے شہر میں رہنا ضروری تھا، اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری تھی اُسی میں رہنے کی اجازت مل گئی، ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا، بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا، ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانجھ کر لائبریری چلا جاتا، حساب تو بہانہ تھا، ناول وغیرہ پڑھا کرتا، پنڈت رتن ناتھ کا ''فسانہ آزاد'' اُنھیں دنوں پڑھا، چندر کانتا سنتتی بھی پڑھا، بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے، جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا اُن کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے، انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا، اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی اُن سے پیسے اُدھار لے لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیباق کر دیتا، کبھی دو روپے ہاتھ آتے، کبھی تین، جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے میری قوتِ ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی، للچائی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھینچ لے جاتیں اور دو تین آنے کے پیسے ختم کیے بغیر واپس نہ آتا، پھر اُسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا، دوسرے دن سے پھر اُدھار لینا شروع کر دیتا لیکن کبھی کبھی اُدھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اس طرح چار پانچ مہینے گزر گئے، اسی درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے لیے تھے، روز اُدھر سے نکلنا ہوتا تھا، اس کا مجھ پر پورا بھروسہ تھا، جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں روپے نہ چکا سکا تو پھر میں نے اُدھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا، چکر دے کر نکل جاتا، تین سال بعد اُس کے روپے ادا کر سکا، اسی زمانہ میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا، اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا، ''جان لو بھیا'' اس کا تکیہ کلام تھا، چنانچہ سب لوگ اُسے ''جان لو بھیا'' ہی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اُس سے آٹھ آنے پیسے اُدھار لیے تھے۔ یہ پیسے اُس نے مجھ سے میرے گھر گاؤں میں جا کر پانچ برس کے بعد وصول کیے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی لیکن روز بروز نا اُمید ہوتا تھا، جی چاہتا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے تو کر لوں، لیکن نوکری کس طرح اور کہاں ملتی ہے، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا، مگر کوڑی پاس نہ تھی، دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھُنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے، میرے مہاجن نے اُدھار دینے سے انکار کر دیا تھا، اور میں لحاظ کے مارے اس سے مانگنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، چراغ جل چکے تھے، اس وقت میں ایک بُک سیلر کی دوکان پر ایک کتاب بیچنے گیا، جو پروفیسر چکرورتی کی بنائی ہوئی ارتھ میٹک کی شرح تھی اور جسے میں نے دو سال ہوئے خریدی تھی، اب تک اُسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا، لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوس ہو گیا تو اُسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا، کتاب کی قیمت دو روپے تھی لیکن ایک روپیہ پر سودا ہوا، میں روپیہ لے کر دُکان سے اُترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک متین شخص نے مجھ سے پوچھا۔

''تم یہاں کہاں پڑھتے ہو؟''

میں نے کہا: ''پڑھتا تو کہیں نہیں، پر کہیں نام لکھانے فکر میں ہوں۔''

''میٹریکولیشن پاس ہو؟''

''جی ہاں۔''

''نوکری تو نہیں چاہتے۔''

''نوکری کہیں ملتی ہی نہیں۔''

یہ بھلے مانس کسی چھوٹے سے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اُنھیں ایک اسسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت تھی، اٹھارہ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا، اُس وقت یہ اٹھارہ روپے میری مایوس تمنآ کی معراج تھے، میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا تو پانوں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے، میں گرد وپیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا اور اگر ریاضی کی وجہ سے اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے تک جاتا، مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملا دیے۔

○

ورنیکلر فائنل پاس کرنے کے بعد مجھے ایک پرائمری مدرسہ میں جگہ مل گئی تھی جو میرے گھر سے گیارہ میل پر تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو تعطیلوں میں بھی لڑکوں کو پڑھانے کا خبط تھا۔ رات کو لڑکے کھانا کھا کر مدرسہ میں آجاتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب چارپائی پر لیٹ کر اپنے خرّاٹوں سے انھیں پڑھایا کرتے تھے۔ جب لڑکوں میں دھول دھپّہ شروع ہو جاتا اور شور وغل ہونے لگتا تب یکایک خوابِ خرگوش سے چونک پڑتے اور لڑکوں کو دو چار طمانچے لگا کر پھر خواب

نوشی کے مزے لینے لگتے۔ گیارہ بارہ بجے رات تک بھی ڈرامہ ہوتا رہتا یہاں تک کہ لڑکے نیند سے بیقرار ہوکر وہیں ٹاٹ پر سو جاتے، اپریل میں سالانہ امتحان ہونے والا تھا اس لیے جنوری ہی سے ہائے توبہ مچی ہوئی تھی، نائٹ مدرسوں پر اتنی راحت تھی کہ رات کی کلاسوں میں انھیں نہ طلب کیا جاتا تھا مگر تعطیلیں بالکل نہ ملتی تھی، سو مہوتی اماوس آیا اور نکل گیا، بسنت آیا اور چلا گیا، شیوراتری آئی اور چلی گئی اور اتواروں کا تو ذکر ہی کیا ہے ایک دن کے لیے کوئی اتنا بڑا سفر کرتا، اس لیے کئی مہینوں سے مجھے گھر جانے کا موقع نہ ملا تھا مگر اب کے میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ہولی پر ضرور گھر جاؤں گا چاہے نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو الٹی میٹم دے دیا کہ ۲۰؍ مارچ کو میری تعطیل شروع ہوگی، اور بندہ ۱۹؍ کی شام کو رخصت ہو جائے گا، ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ ابھی لڑکے ہو تمھیں کیا معلوم نوکری کتنی مشکل سے ملتی ہے اور کتنی مشکلوں سے نبھتی ہے، نوکری پانا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کا نبھانا، ۸؍ اپریل میں امتحان ہونے والا ہے، تین چار دن مدرسہ بند رہا تو بتاؤ کیسے لڑکے پاس ہوں گے، سال بھر کی محنت پر پانی پھر جائے گا کہ نہیں، میرا کہنا مانو، اس تعطیل میں نہ جاؤ، امتحان کے بعد تعطیل پڑے اس میں ایسٹر کے چار دن کی تعطیل ہوگی، میں ایک دن کے لیے بھی نہ روکوں گا۔ میں اپنے مورچہ پر قائم رہا، فہمائش اور تخویف اور جواب طلبی کسی اسلحہ کا مجھ پر اثر نہ ہوا۔ ۱۹؍ کو جوں ہی مدرسہ بند ہوا میں نے ہیڈ ماسٹر کو سلام بھی نہ کیا اور چپکے سے اپنی جائے قیام پر چلا آیا۔ انھیں سلام کرنے جاتا تو وہ ایک نہ ایک کام نکال کر مجھے روک لیتے۔ رجسٹر میں فیس کی میزان لگاتے جاؤ، اوسط حاضری لگاتے جاؤ، لڑکوں کی مشقی کاپیاں جمع کر کے ان پر اصلاح اور تاریخ سب مکمل کر دو، گویا یہ میرا آخری سفر ہے اور مجھے زندگی کے سارے کام بھی ختم کر دینے چاہئیں۔

مکان پر آ کر ہم نے جھٹ پٹ اپنی کتابوں کا بقچہ اٹھایا، اپنا ہلکا سا لحاف کندھے پر رکھا اور اسٹیشن پر چل پڑے۔ گاڑی پانچ بج کر پانچ منٹ پر جاتی تھی، مدرسہ کی گھڑی حاضری کے وقت ہمیشہ آدھ گھنٹہ تیز اور روانگی کے وقت آدھ گھنٹہ سست رہتی تھی، چار بجے مدرسہ بند ہوا تھا۔ میرے خیال میں اسٹیشن پر پہنچنے میں کافی وقت تھا، پھر بھی مسافروں کو گاڑی کی طرف عام طور پر جو اندیشہ لگا رہتا ہے اور جو گھڑی ہاتھ میں ہونے پر بھی اور گاڑی کا وقت صحیح معلوم ہونے پر دور سے کسی گاڑی کی گڑگڑاہٹ یا سیٹی سن کر قدموں کو تیز اور دل منتشر کر دیا کرتا ہے، وہ مجھے بھی لگا ہوا تھا۔ کتابوں کا بقچہ وزنی تھا اس پر کندھے پر لحاف بار بار ہاتھ بدلتا تھا اور لپکا چلا جاتا تھا، یہاں تک اسٹیشن دو فرلانگ سے نظر آیا۔ سگنل ڈاؤن تھا۔ میری ہمت بھی اس سگنل کی

طرح پست ہو گئی۔ تقاضا عمر سے ایک سو قدم آگے دوڑا ضرور مگر یہ یاس کی ہمت تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے گاڑی آئی۔ ایک منٹ ٹھہری اور روانہ ہو گئی، مدرسہ کی گھڑی یقیناً آج معمول سے بھی زیادہ سست تھی۔

اب اسٹیشن پر جانا بے سود تھا، دوسری گاڑی گیارہ بجے رات کو آئے گی، میرے گھر والے اسٹیشن پر کوئی بارہ بجے پہنچے گی اور وہاں سے مکان پر جاتے جاتے ایک بج جائے گا۔ اس سناٹے میں راستہ چلنا بھی ایک مہم تھی جسے سر کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی، جی میں تو آیا کہ چل کر ہیڈ ماسٹر کو آڑے ہاتھوں لوں، مگر ضبط کیا اور پیدل چلنے کے لیے آمادہ ہو گیا، کل بارہ میل ہی تو ہیں، اگر دو میل فی گھنٹہ بھی چلوں تو چھ گھنٹہ میں گھر پہنچ سکتا ہوں۔ ابھی پانچ بجے ہیں ذرا قدم بڑھاتا جاؤں تو دس بجے یقیناً پہنچ جاؤں گا۔ اماں اور منو میرا انتظار کر رہے ہوں گے، پہنچتے ہی گرما گرم کھانا ملے گا، کولھواڑے میں گو پک رہا ہو گا، وہاں سے گرم گرم رس پینے کو آ جائے گا، اور جب سنیں گے میں اتنی دُور پیدل چلا کر آیا ہوں تو انھیں کتنا تعجب ہو گا، میں نے فوراً گنگا کی طرف قدم بڑھایا، یہ قصبہ ندی کے کنارے واقع تھا اور میرے گاؤں کی سڑک ندی کے اس پار سے تھی، مجھے اس راستے سے جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا مگر اتنا سنا تھا کہ کچی سڑک سیدھی چلی جاتی ہے۔ تردّد کی کوئی بات نہ تھی، دس منٹ میں ناؤ اس پار پہنچ جائے گی اور بس فراٹے بھرتا ہوا چل دوں گا، بارہ میل کہنے کو تو ہوتے ہیں تو کل چھ کوس۔

مگر گھاٹ پر پہنچا تو ناؤ میں آدھے مسافر بھی نہ بیٹھے تھے میں کود کر جا بیٹھا۔ کھیوے کے پیسہ بھی نکال کر دے دیے مگر ناؤ ہے کہ وہیں قطب بنی ہوئی ہے۔ مسافروں کی تعداد کافی نہیں ہے، کیسے کھلے، لوگ تحصیل اور کچہری سے آتے جاتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں اور میں ہوں کہ اندر ہی اندر بھنا جاتا ہوں، سورج نیچے دوڑا چلا جا رہا ہے گویا مجھ سے بازی لگائے ہوئے ہے۔ ابھی سفید تھا پھر زرد ہونا شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے سرخ ہو گیا۔ دریا کے اس پار افق پر لٹکا ہوا تھا گویا کوئی ڈول کنوئیں میں لٹک رہا ہو، ہوا میں کچھ خنکی بھی آ گئی اور بھوک بھی معلوم ہونے لگی۔ میں نے آج گھر جانے کی خوشی اور ولولے میں روٹیاں نہ پکائی تھیں، سوچا تھا کہ شام تو گھر پہنچ جاؤں گا، لاؤ ایک پیسہ کے چنے لے کر کھالوں۔ ان دانوں نے اتنی دیر تک تو رفاقت کی، اب پیٹ کی پیچیدگیوں میں جا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے مگر کیا غم ہے رستہ میں کیا دوکانیں نہ ہوں گی، دو چار پیسہ کی مٹھائی لے کر کھالوں گا۔

جب ناؤ اس کنارے پر پہنچی تو سورج کی صرف آخری سانس باقی تھی، حالانکہ ندی کا پاٹ بالکل پینڈے میں چمٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے بقچہ اٹھایا اور تیزی سے چلا۔ دونوں طرف چنے کے کھیت تھے جن کے اودے پھولوں پر شبنم کا ہلکا سا پردہ پڑ گیا تھا، بے اختیار ایک کھیت میں گھس کر پوٹ اُکھاڑ لیے اور ٹونگتا ہوا بھاگا۔

○

سامنے بارہ میل کی منزل ہے، کچا سنسان راستہ، شام ہو گئی ہے۔ مجھے پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا، مگر جوشِ طفلی نے کہا کیا مضائقہ ایک دو میل تو دوڑ ہی سکتے ہیں، بارہ کو دل میں ۱۷۶۰ سے ضرب دیا، بیس ہزار گز ہی تو ہوتے ہیں، بارہ میل کے مقابلہ ۲۰ ہزار گز کچھ ہلکے اور آسان معلوم ہوئے اور جب دو تین میل رہ جائے گا تب تو ایک طرح سے اپنے گاؤں میں ہی ہوں گا، اس کا کیا شمار۔ ہمت بندھ گئی! اِکے دُکے مسافر بھی پیچھے چلے آرہے تھے اور بھی اطمینان ہوا۔

اندھیرا ہو گیا تھا، میں لپکا جا رہا ہوں، سڑک کے کنارے دور سے ایک جھونپڑی نظر آتی ہے۔ ایک کُپّی جل رہی ہے، ضرور کسی بنیے کی دُکان ہوگی، اور کچھ نہ ہوگا تو گُڑ اور چنے تو مل ہی جائیں گے، قدم اور تیز کرتا ہوں، چار پانچ آدمی اُکڑوں بیٹھے ہیں، بیچ میں ایک بوتل ہے۔ ہر ایک کے سامنے ایک ایک کلھڑا، دیوار سے ملی ہوئی اونچی گدّی ہے، اس پر ساہو جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے سامنے کئی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں، ذرا اور پیچھے ہٹ کر ایک آدمی کڑھائی میں سوکھے مٹر بھون رہا ہے، اس کی رغبت افزا سوندھی خوشبو میرے جسم میں برقی رفتاری دوڑ جاتی ہے، اضطراری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں، اور ایک پیسہ نکال کر اس کی طرف چلتا ہوں۔

لیکن آپ ہی قدم رُک جاتے ہیں۔
خونچے والا پوچھتا ہے کیا لو گے۔؟
میں کہتا ہوں کچھ نہیں۔

اور آگے بڑھ جاتا ہوں، دوکان بھی ملی تو شراب کی، گویا دُنیا میں انسان کے لیے شراب ہی سب سے ضروری چیز ہے، یہ سب آدمی دھوبی اور چمار ہوں گے۔ دوسرا کون شراب پیتا ہے دیہات میں، مگر وہ مٹر کا دل آویز سوندھا پن میرا پیچھا کر رہا ہے، اور میں بھاگا جا رہا ہوں۔

کتابوں کا بقچہ جی کا جنجال ہو رہا ہے۔ ایسی خواہش ہوتی ہے کہ اسے یہیں سڑک پر پٹک دوں، اس کا وزن مشکل سے پانچ سیر ہوگا مگر اس وقت وہ مجھے من بھر سے زیادہ معلوم ہو رہا

ہے، جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ پورنماشی کا چاند درختوں کے اوپر جا بیٹھا ہے اور پتوں سے زمین کی طرف جھانک رہا ہے۔ میں بالکل اکیلا چلا جا رہا ہوں مگر خوف بالکل نہیں ہے، بھوک نے ساری حسیات کو دبا رکھا ہے اور خود ان پر حاوی ہو گئی ہے۔

آہا یہ گڑ کی خوشبو کہاں سے آئی، کہیں تازہ گڑ پک رہا ہے، کوئی گانو قریب ہی ہوگا۔ ہاں وہ آموں کی جھرمٹ میں روشنی نظر آ رہی ہے، لیکن وہاں پیسے دو پیسے کا گڑ کون بیچے اور یوں مجھ سے مانگا نہ جائے گا، معلوم نہیں لوگ کیا سمجھیں، آگے بڑھتا ہوں مگر زبان سے رال ٹپک رہی ہے، گڑ سے مجھے بڑی رغبت ہے، جب کبھی کسی چیز کی دُکان کھولنے کی سوچتا تھا تو وہ حلوائی کی دُکان ہوتی تھی، بکری ہو یا نہ ہو، مٹھائیاں تو کھانے کو ملیں گی، حلوائیوں کو دیکھو مارے مٹاپے کے ہل نہیں سکتے لیکن یہ بیوقوف ہوتے ہیں، آرام طلبی کے باعث توند نکال لیتے ہیں، میں ورزش کرتا رہوں گا، مگر گڑ کی وہ صبر آزما اور اشتہا انگیز خوشبو برابر آ رہی ہے مجھے۔

چنانچہ اس وقت گڑ کی اس میٹھی اور مرغوب خوشبو نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا مگر صبر کر کے آگے بڑھا۔ جوں جوں رات گزرتی تھی جسم تکان سے چور ہوتا تھا، یہاں تک کہ پانو میں لغزش ہونے لگی، کچی سڑک پر گاڑیوں کے پہیوں کی لیک پڑ گئی تھی، جب بھی لیک میں پیر پھسل جاتا تو معلوم ہوتا کسی گہرے گڈھے میں گر پڑا ہوں، بار بار جی میں آتا یہیں سڑک کنارے لیٹ جاؤں کتابوں کا مختصر سا بقچہ من بھر کا لگتا تھا، اپنے کو کوستا تھا کہ کتابیں لے کر کیوں چلا۔ دوسری زبان کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا، مگر چھٹیوں میں ایک دن بھی تو کتاب کھولنے کی نوبت نہ آئے گی، خواہ مخواہ یہ پشتارہ اُٹھائے چلا آتا ہوں، ایسا جی جھنجلاتا تھا کہ اس بارِ حماقت کو وہیں پٹک دوں۔

آخر ٹانگوں نے چلنے سے انکار کر دیا، ایک بار میں گر پڑا، اور سنبھل کر اُٹھا تو پانو تھرتھرا رہے تھے، اب بغیر کچھ کھائے قدم اُٹھانا دُشوار تھا، مگر یہاں کیا کھاؤں، بار بار رونے کو جی چاہتا تھا۔ اتفاق سے ایک ایکھ کا کھیت نظر آیا، اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، چاہتا تھا کہ کھیت میں گھس کر چار پانچ ایکھ توڑ لوں اور مزے سے رس چوستا ہوا چلوں۔ راستہ بھی کٹ جائے گا اور پیٹ میں کچھ پڑ بھی جائے گا، مگر مینڈ پر پیر رکھا ہی تھا کہ کانٹوں میں اُلجھ گیا، کسان نے شاید مینڈ پر کانٹے بکھیر دیے تھے۔ شاید بیر کی جھاڑی تھی، دھوتی کرتا سب کانٹوں میں پھنسا ہوا، پیچھے ہٹا تو کانٹوں کی جھاڑی ساتھ ساتھ چلی۔ کپڑے چھڑانے لگا تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگے۔ زور سے کھینچا تو دھوتی پھٹ گئی، بھوک غائب ہو گئی، فکر ہوئی اس نئی مصیبت سے کیوں کر نجات ہو، کانٹوں کو ایک جگہ سے الگ کرتا تو دوسرے چمٹ جاتے، جھکتا تو جسم میں چبھتے، کسی کو پکاروں تو چوری کھل جاتی ہے۔ عجیب مخمصے میں پڑا ہوا تھا، اس وقت مجھے اپنی حالت پر رونا آ گیا، کوئی

صحرانورد عاشق بھی اس طرح کانٹوں میں نہ پھنسا ہوگا، بڑی مشکل سے آدھ گھنٹے میں گلا چھوٹا، مگر دھوتی اور کرتے کے ماتھے گئی اور ہاتھ اور پاتو چھلنی ہو گئے وہ گھاٹے میں، اب ایک قدم آگے رکھنا محال تھا، معلوم نہیں کتنا راستہ طے ہوا کتنا باقی ہے، نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد، کس سے پوچھوں، اپنی حالت پر روتا ہوا جا رہا تھا، ایک بڑا گاؤں نظر آیا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کوئی نہ کوئی دُکان مل ہی جائے گی۔ کچھ کھالوں گا اور کسی کے سائبان میں پڑا رہوں گا۔ صبح دیکھی جائے گا۔

مگر دیہاتوں میں لوگ سرِ شام سونے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کنویں پر پانی بھر رہا تھا۔ اس سے پوچھا تو اس نے نہایت ہی یاس انگیز جواب دیا۔ اب یہاں کچھ نہ ملے گا۔ بنیے نمک تیل رکھتے ہیں۔ حلوائی کی دُکان ایک بھی نہیں، کوئی شہر تھوڑا ہی ہے، اتنی رات تک دُکان کھولے کون بیٹھا رہے۔

میں نے اس سے نہایت منّت آمیز لہجہ میں کہا: ''کہیں سونے کو جگہ مل جائے گی؟''

اس نے پوچھا: ''کون ہو تم؟ تمھاری جان پہچان کا یہاں کوئی ہے؟''

''جان پہچان کا کوئی ہوتا تو تم سے کون سوال کرتا۔''

''تو بھئی انجان آدمی کو یہاں نہیں ٹھہرنے دیں گے، اسی طرح کل ایک مسافر آکر ٹھہرا تھا۔ رات کو ایک گھر میں سیند پڑ گئی۔ صبح کو مسافر کا پتہ نہ تھا۔''

''تو کیا تم سمجھتے ہو، میں چور ہوں۔''

''کسی کے ماتھے پر تو لکھا نہیں ہوتا، اندر کا حال کون جانے۔''

''نہیں ٹھہرانا چاہتے نہ سہی مگر چور نہ بناؤ۔ یہ اتنا منحوس گانو ہے تو ادھر آیا ہی کیوں؟''

میں نے زیادہ خوشامد نہ کی۔ جی جل گیا۔ سڑک پر آکر پھر آگے چلا، اس وقت میرے ہوش بجا نہ تھے، کچھ خبر نہیں کس راستے سے گانو میں آیا تھا۔ اور کدھر چلا جا رہا تھا۔ اب مجھے اپنے گھر پہنچنے کی امید نہ تھی۔ رات یونہی بھٹکتے ہوئے گزرے گی۔ پھر اس کا کیا غم کہ کہاں جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی۔ دفعتاً ایک کھیت میں آگ جلتی ہوئی نظر آئی، گویا شمعِ اُمید ہو۔ ضرور وہاں کوئی آدمی ہوگا۔ شاید رات کاٹنے کو جگہ مل جائے۔ تیز قدم کیے اور قریب پہنچا کہ یکایک ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا میری طرف دوڑا۔ اتنی خوفناک آواز تھی کہ میں کانپ اُٹھا۔ ایک لمحہ میں وہ میرے سامنے آ گیا اور میری طرف لپک لپک کر بھونکنے لگا۔ میرے ہاتھوں میں کتابوں کے بقچہ کے سوا اور کیا تھا۔ نہ کوئی لکڑی نہ کوئی پتھر کیسے بھگاؤں، کہیں بدمعاش میری ٹانگ پکڑ لے تو کیا کروں، تازی نسل کا شکاری کتا معلوم ہوتا تھا میں جتنا ہی دُھت دُھت کرتا تھا اتنا ہی وہ گرجتا تھا۔ میں خاموش کھڑا ہو گیا اور بقچہ زمین پر رکھ

کر پاؤں سے جوتے نکال لیے۔ اپنی حفاظت کے لیے کوئی حربہ تو ہاتھ میں ہو، اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا کہ خوفناک حد تک قریب آئے تو اس کے سر پر اتنے زور سے نعل والا جوتا ماردوں کہ یاد ہی تو کرے لیکن اس نے شاید میری نیت تاڑ لی اور اس طرح میری طرف جھپٹا کہ مجھے رعشہ آ گیا اور جوتے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑے اور اسی وقت میں نے ہیبت زدہ آواز میں پکارا: ''ارے کھیت میں کوئی ہے۔ دیکھ یہ کتا مجھے کاٹ رہا ہے اور مہتو دیکھو، تمھارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے۔''

جواب ملا: ''کون ہے؟''

''میں ہوں راہ گیر، تمھارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے۔''

''نہیں، کاٹے گا نہیں، ڈرو مت کہاں جانا ہے۔''

''محمود نگر۔''

''محمود نگر کا راستہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے، آگے تو ندی ہے۔''

میرا کلیجہ بیٹھ گیا۔ روناسا ہو کر بولا: ''محمود نگر کا راستہ کتنی دُور چھوٹ گیا ہوگا؟''

''یہی کوئی تین میل۔''

اور ایک قد آور انسان ہاتھ میں لالٹین لیے ہوئے آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، سر پر ہیٹ تھا، ایک موٹا فوجی اوورکوٹ پہنے ہوئے، نیچے نیکر پاؤں میں فل بوٹ، بڑے قوی ہیکل بڑی مونچھیں، گورا رنگ، مردانہ وجاہت کا مجسمہ۔ بولا: ''تم تو کوئی اسکول کے لڑکے معلوم ہوتے ہو۔''

''لڑکا تو نہیں ہوں، لڑکوں کا مدرّس ہوں، گھر جا رہا ہوں آج سے تین دن کی تعطیل ہے۔''

''تو ریل سے کیوں نہیں گئے؟''

''ریل چھوٹ گئی ہے اور دوسری ایک بجے چھوٹتی ہے۔''

''وہ ابھی تمھیں مل جائے گی، بارہ کا عمل ہے، چلو میں اسٹیشن کا راستہ دِکھا دوں۔''

''کون سے اسٹیشن کا؟''

''بھگونت پور کا۔''

''بھگونت پور ہی سے تو میں چلا ہوں، وہ بہت پیچھے چھوٹ گیا ہوگا۔''

''بالکل نہیں، تم بھگونت پور اسٹیشن سے ایک میل کے اندر کھڑے ہو، چلو میں تمھیں اسٹیشن کا راستہ دِکھا دوں، ابھی گاڑی مل جائے گی، لیکن رہنا چاہو تو میرے جھونپڑے میں لیٹ رہو، کل چلے جانا۔''

اپنے اوپر غصہ آیا کہ سر پیٹ لوں۔ پانچ بجے سے تیلی کے بیل کی طرح گھوم رہا ہوں

اور ابھی بھگونت پور سے کل ایک میل آیا ہوں۔ راستہ بھول گیا۔ یہ واقعہ بھی یاد رہے گا کہ چلا چھ گھنٹے اور طے کیا ایک میل، گھر پہنچنے کی دُھن جیسے اور بھی دہک اُٹھی۔

بولا: ''نہیں، کل تو ہولی ہے مجھے رات کو پہنچ جانا چاہیے۔''

''مگر راستہ پہاڑی ہے، ایسا نہ ہو کوئی جانور مل جائے۔ اچھا چلو میں تمھیں، پہنچائے دیتا ہوں، مگر تم نے بڑی غلطی کی انجان راستے میں رات کو پیدل چلنا کتنا خطرناک ہے، اچھا چلو میں پہنچائے دیتا ہوں۔ یہیں کھڑے رہو، میں ابھی آتا ہوں۔''

کتا دُم ہلانے لگا اور مجھ سے دوستی کرنے کا خواہشمند معلوم ہوا۔ دُم ہلاتا ہوا سر جھکائے عذر تقصیر کے طور پر میرے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ میں نے بھی فیاضی سے اس کا قصور معاف کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایک لمحہ میں وہ شخص بندوق کندھے پر رکھے آ گیا اور بولا: ''چلو، مگر اب ایسی نادانی نہ کرنا، خیریت ہوئی کہ میں تمھیں مل گیا۔ ندی پر پہنچ جاتے تو ضرور کسی جانور سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔''

میں نے پوچھا: ''آپ تو کوئی انگریز معلوم ہوتے ہیں مگر آپ کا لہجہ بالکل ہمارے جیسا ہے۔''

اس نے ہنس کر کہا: ''ہاں میرا باپ انگریز تھا، فوجی افسر، میری عمر یہیں گزری ہے۔ میری ماں اس کا کھانا پکاتی تھی۔ میں بھی فوج میں رہ چکا ہوں، یورپ کی لڑائی میں گیا تھا اب پنشن پاتا ہوں، لڑائی میں میں نے جو نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جن حالات میں مجھے زندگی بسر کرنا پڑی اور مجھے اپنے انسانی جذبات کا جس حد تک خون کرنا پڑا ان سے اس پیشہ سے مجھے نفرت ہو گئی اور میں پنشن لے کر یہاں چلا آیا۔ میرے پاپا نے یہیں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ میں یہیں رہتا ہوں اور آس پاس کے کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ یہ گنگا کی گھاٹی ہے۔ چاروں طرف پہاڑیاں ہیں، جنگلی جانور بہت لگتے ہیں۔ سؤر، نیل گائے، ہرن ساری کھیتی برباد کر دیتے ہیں۔ میرا کام ہے جانوروں سے کھیتی کی حفاظت کرنا۔ کسانوں سے مجھے ہل پیچھے ایک من غلّہ مل جاتا ہے۔ وہ میرے گزر بسر کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میری بڑھیا ماں ابھی زندہ ہے، جس طرح پاپا کا کھانا پکاتی تھی اسی طرح اب میرا کھانا پکاتی ہے۔ کبھی کبھی میرے پاس آیا کرو، میں تمھیں کسرت کرنا سکھا دوں گا۔ سال بھر میں پہلوان ہو جاؤ گے۔'' میں نے پوچھا: ''آپ ابھی تک کسرت کرتے ہیں۔''

وہ بولا: ''ہاں دو گھنٹہ روزانہ کسرت کرتا ہوں۔ مگدر اور کیزم کا مجھے بہت شوق ہے۔ میرا پانچواں سال ہے۔ ایک سانس میں پانچ میل دوڑ سکتا ہوں۔ کسرت نہ کروں تو اس جنگل میں

رہوں کیسے۔ میں نے خوب کشتیاں لڑی ہیں۔ اپنی رجمنٹ میں مضبوط آدمی تھا، مگر اب اس فوجی زندگی کے حالات پر غور کرتا ہوں تو شرم اور افسوس سے میرا سر جھک جاتا ہے۔ کتنے بے گناہ میری رائفل کے شکار ہوئے۔ میرا اُنھوں نے کیا نقصان کیا تھا، میری ان سے کونسی عداوت تھی۔ مجھے تو جرمن اور آسٹرین سپاہی بھی ویسے ہی خلیق، ویسے ہی بہادر، ویسے ہی خوش مزاج، ویسے ہی ہمدرد معلوم ہوئے جیسے فرانس یا انگلینڈ کے۔ ہماری ان سے خوب بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ساتھ کھیلتے تھے ساتھ بیٹھتے تھے۔ خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے اپنے نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، کس لیے؟ اس لیے کہ بڑے بڑے انگریز سوداگروں کو خطرہ تھا کہ کہیں جرمنی ان کا روزگار نہ چھین لے۔ یہ سوداگروں کا راج ہے، ہماری فوجیں اُنھیں کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں ہیں۔ جان ہم غریبوں کی گئی جیبیں گرم ہوئیں موٹے موٹے سوداگروں کی، اس وقت ہماری ایسی خاطر ہوتی تھی، ایسی پیٹھ ٹھونکی جاتی تھی، گویا ہم سلطنت کے داماد ہیں۔ ہمارے اوپر پھولوں کی بارش ہوتی تھی۔ ہمیں گارڈن پارٹیاں دی جاتی تھیں۔ ہماری جانبازیوں کی داستانیں روزانہ اخباروں میں تصویروں کے ساتھ چھپتی تھیں۔ نازک بدن لیڈیاں اور شہزادیاں ہمارے لیے کپڑے سیتی تھیں۔ طرح طرح کے مربے اور آچار بنا بنا کر بھیجتی تھیں لیکن جب صلح ہوگئی تو اُنھیں جانبازوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھتا تھا۔ کتنوں ہی کے انگ بھنگ ہوگئے تھے، کوئی لولا ہوگیا تھا، کوئی لنگڑا، کوئی اندھا، اُنھیں ایک ٹکڑا روٹی دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ میں نے کتنوں کو ہی سڑک پر بھیک مانگتے دیکھا، تب سے مجھے اس پیشہ سے نفرت ہوگئی، میں نے یہاں آکر یہ کام اپنے ذمّہ لے لیا۔ اور خوش ہوں۔ سپہ گری کا یہی منشا ہے کہ اس سے غریبوں کی جان و مال کی حفاظت ہو۔ یہ نہیں کہ کروڑ پتیوں کی بے شمار دولت میں اضافہ ہو۔ یہاں میری جان ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ کئی بار مرتے مرتے بچا ہوں، لیکن اس کام میں مر بھی جاؤں تو مجھے افسوس نہ ہوگا، کیونکہ مجھے یہ تسکین ہوگی کہ میری زندگی غریبوں کے کام آئی اور یہ بچارے کسان میری کتنی خاطر کرتے ہیں کہ تم سے کیا کہوں۔ اگر میں بیمار پڑ جاؤں اور اُنھیں معلوم ہو جائے کہ میں اُن کے جسم کے تازہ خون سے اچھا ہو جاؤں گا تو بے دریغ اپنا خون دے دیں گے۔ پہلے میں شراب پیتا تھا، میری برادری کو تو تم جانتے ہوگے، ہم میں بہت زیادہ لوگ ایسے ہیں جن کو کھانا میسر ہو یا نہ ہو مگر شراب ضرور چاہیے۔ میں بھی ایک بوتل شراب روز پی جاتا تھا۔ باپ نے کافی پیسے چھوڑے تھے اگر کفایت سے رہنا جانتا تو زندگی بھر آرام سے پڑا رہتا، مگر شراب نے ستیاناس کر دیا۔ ان دنوں میں بڑے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ کالرٹائی لگائے چھیلا بنا ہوا، نوجوان چھوکریوں سے آنکھیں لڑایا کرتا

تھا۔ گھوڑ دوڑ میں جوا کھیلنا، شراب پینا، کلب میں تاش کھیلنا اور عورتوں سے دل بہلانا یہی زندگی کا مشغلہ تھا۔ تین چار سال میں میں نے پچیس تیس ہزار روپے اُڑا دیے، کوڑی کفن کو نہ رکھی۔ جب پیسے ختم ہو گئے تو روزی کی فکر ہوئی۔ فوج میں بھرتی ہو گیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ وہاں سے کچھ سیکھ کر لوٹا۔ یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بہادر کا کام جان لینا نہیں، بلکہ جان کی حفاظت کرنا ہے۔''

......یورپ سے آ کر ایک دن میں شکار کھیلنے نکلا اور ادھر آ گیا۔ دیکھا کئی کسان اپنے کھیتوں کے کنارے اُداس کھڑے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے، تم لوگ کیوں اس طرح اُداس کھڑے ہو۔ ایک آدمی نے کہا کیا کریں صاحب زندگی سے تنگ ہیں۔ نہ موت آتی ہے نہ پیداوار ہوتی ہے۔ سارے جانور آ کر کھیت چر جاتے ہیں۔ کس کے گھر سے لگان چکائیں، کیا مہاجن کو دیں، کیا عملوں کو دیں اور کیا خود کھائیں۔ کل انھیں کھیتوں کو دیکھ کر دل کا غنچہ کھل جاتا تھا۔ آج انھیں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ جانوروں نے صفایا کر دیا ہے۔''

......معلوم نہیں اس وقت میرے دل پر کس دیوتا یا نبی کا سایہ تھا کہ مجھے ان پر رحم آ گیا۔ میں نے کہا۔ آج سے میں تمھارے کھیتوں کی رکھوالی کروں گا۔ کیا مجال کہ کوئی جانور بھٹک سکے۔ ایک دانہ جو جائے تو جرمانہ دوں۔ پس اس دن سے آج تک میرا یہی کام ہے۔ آج دس سال ہو گئے، میں نے کبھی ناغہ نہیں کیا۔ اپنا گزر بھی ہوتا ہے اور احسان مفت ملتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کام سے دل کو خوشی ہوتی ہے۔''

ندی آ گئی، میں نے دیکھا وہی گھاٹ ہے جہاں شام کو کشتی پر بیٹھا تھا۔ اس چاندنی میں ندی مرصع زیورات پہنے جیسے کوئی سنہرا خواب دیکھ رہی ہو۔

میں نے پوچھا: ''آپ کا نام کیا ہے؟ کبھی کبھی آپ کی زیارت کو آیا کروں گا۔''

اس نے لالٹین اُٹھا کر میرا چہرہ دیکھا اور بولا: ''جیکسن ہے، ول جیکسن، ضرور آنا، اسٹیشن کے پاس جس سے میرا نام پوچھو گے، میرا پتہ بتلا دے گا۔''

یہ کہہ کر وہ پیچھے کی طرف مڑا، مگر یکایک لوٹ پڑا اور بولا: ''مگر تمھیں یہاں ساری رات بیٹھنا پڑے گا، اور تمھاری اماں گھبرا رہی ہوں گی۔ تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ تو میں تمھیں اس پار پہنچا دوں، آج کل پانی بہت کم ہے، میں تو اکثر تیر آتا ہوں۔''

میں نے احسان سے دب کر کہا: ''آپ نے یہی کیا کم عنایت کی ہے کہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا ورنہ شاید گھر پہنچنا نصیب نہ ہوتا۔ میں یہاں بیٹھا رہوں گا، اور صبح کو کشتی سے پار اُتر جاؤں گا۔''

''واہ، اور تمھاری اماں روتی ہوں گی کہ میرے لاڈلے پر جانے کیا گزری۔''

یہ کہہ کر مسٹر جیکسن نے مجھے جھٹ اُٹھا کر کندے پر بٹھالیا اور اس طرح بے خوف پانی میں گھسے، گویا سوکھی زمین ہے، میں دونوں ہاتھوں سے ان کی گردن پکڑے ہوں اور کچھ ہنس بھی رہا ہوں۔ پھر بھی سینہ دھڑک رہا ہے اور رگوں میں سنسنی سی بھی ہے، مگر جیکسن صاحب اطمینان سے چلے جارہے ہیں۔ پانی گھٹنے تک آیا۔ پھر کمر تک پہنچا۔ ان کے سینہ تک پہنچ گیا، اب صاحب کو ایک ایک قدم مشکل ہورہا ہے۔ میری جان نکل رہی ہے، لہریں ان کے گلے لپٹ رہی ہیں، میرے پانو بھی چومنے لگیں، میرا جی چاہتا تھا ان سے کہوں خدارا واپس چلیے مگر زبان نہیں کھلی، حواس نے جیسے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے سب دروازے بند کر لیے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں جیکسن صاحب پھسلے تو اپنا کام تمام ہے۔ یہ تو تیراک ہیں نکل جائیں گے، میں لہروں کی خوراک بن جاؤں گا۔ افسوس آتا ہے اپنی حماقت پر کہ تیرنا کیوں نہ سیکھ لیا۔ یکا یک جیکسن نے مجھے دونوں ہاتھوں سے کندھے کے اوپر اُٹھالیا۔ ہم دھار میں پہنچ گئے تھے۔ بہاؤ میں اتنی تیزی تھی کہ ایک ایک قدم آگے رکھنے میں ایک ایک منٹ لگ جاتا تھا۔ دن کو اس ندی میں بارہا آچکا تھا۔ لیکن رات کو اور اس منجدھار میں وہ مرگ رواں معلوم ہوتی تھی، دس بارہ قدم تک میں جیکسن کے دونوں ہاتھوں پر ٹنگا رہا پھر پانی اُترنے لگا۔ میں دیکھ نہ سکا مگر شاید پانی جیکسن کے سر کے اوپر تک آ گیا تھا۔ اسی لیے اُنھوں نے مجھے ہاتھوں پر اُٹھالیا تھا۔ جب ان کی گردن باہر نکل آئی تو زور سے ہنس کر بولے: ''لو اب پہنچ گئے۔''

میں نے کہا: ''آپ کو آج میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔''

جیکسن نے مجھے ہاتھوں سے اُتار کر پھر کندھے پر بٹھاتے ہوئے کہا: ''اور مجھے آج جتنی مسرت ہوئی اتنی آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔ جرمن کپتان کو قتل کر کے بھی نہیں اپنی ماں سے کہنا مجھے دعائیں دیں۔''

گھاٹ پر پہنچ کر میں صاحب سے رخصت ہوا۔ شرافت، بے غرض خدمت اور جانبازانہ سرفروشی کا نہ مٹنے والا نقش دل پر لیے ہوئے میرے جی میں آیا کاش میں بھی اسی طرح لوگوں کے کام آسکتا۔

تین بجے رات کو جب میں گھر پہنچا تو ہولی میں آگ لگ رہی تھی۔ میں اسٹیشن سے دو میل سرپٹ دوڑتا ہوا گیا۔ معلوم نہیں بھوکے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔

امّاں میری آواز سنتے ہی آنگن میں نکل آئیں اور مجھے سینہ سے لگالیا اور بولیں: ''اتنی رات کہاں کر دی۔ میں تو سانجھ سے تمھاری راہ دیکھ رہی تھی۔ چلو کھانا کھالو۔ کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں۔'' وہ اب جنت میں ہیں، لیکن ان کا وہ محبت بھرا چہرہ میری نظروں میں ہے اور وہ پیار

بھری آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔

مسٹر جیکسن سے کئی بار مل چکا ہوں، اس کی شرافت نے مجھے اس کا عقیدت مند بنا دیا ہے۔ میں اُسے انسان نہیں فرشتہ سمجھتا ہوں

○

میری ادبی زندگی کی شروعات ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ اُردو ہفتہ وار اخبارات میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت ماہوار شائع نہ ہوا کرتے تھے۔

مضمون نویسی کا مجھے شوق تھا میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ میں مصنف بنوں گا۔ میں سرکاری ملازم تھا اور فرصت کے وقت کچھ نہ کچھ لکھ لیتا تھا۔

ناول پڑھنے کا مجھے ایسا خبط تھا کہ طبیعت نہ بھرتی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے اور انتخاب کے جو بھی ناول ہاتھ لگ جاتا اُسے پڑھ ڈالتا۔ میرا پہلا مضمون ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا اور پہلی کتاب ۱۹۰۳ء میں۔ اپنے ذوق کی سیری کے علاوہ مضمون نویسی سے کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ شروع شروع میں مَیں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ پھر ماضی اور حال کی سرکردہ ہستیوں کے خاکے لکھنے لگا۔

میرا پہلا ناول ۱۹۰۰ء میں لکھا گیا۔ اسرار معابد بنارس کے ہفتہ وار ''آوازِ خلق'' میں قسط وار شائع ہوا۔ کشنا بنارس کے میڈیکل ہال پریس نے سوشل ریفارم سیریز (نمبر ۲۳) شائع کیا۔ اگلا ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' نول کشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا۔ ہندی میں اسے الٰہ آباد کے لا جرنل پریس نے ''پریما'' کے نام سے شائع کیا۔

۱۹۰۵ء گرمیوں کی تعطیل ہی میں گرمی کی کچھ کیفیت نہ پوچھیے۔ کہلانے کو تو صاحبِ مکان ہوں اور خدا کے فضل سے مکان بھی سارے گاؤں کا معبود ہے۔ مگر رہنے کے قابل ایک کمرہ بھی نہیں۔ کوٹھے پر آگ برستی ہے۔ جیٹھا اور پسینہ چوٹی سے ایڑی کو چلا۔ نیچے کے کمرے سب گندے۔ پریشان۔ کسی میں بیل بندھتا ہے۔ کسی میں اُپلے جمع ہیں۔ کہیں اناج کا ڈھیر ہے۔ کسی میں جانت، چکی، اوکھلی، موسلی وغیرہ جلوس فرما ہیں۔ کوئی بیٹھے کہاں۔ سوئے کہاں، مجبور اناج کے گھر میں ایک چارپائی کی جگہ نکال لی ہے۔ اُس پر دن و رات پڑا رہتا ہوں۔ اکیلے گھومنے کہاں جاؤں۔ بچے تین چار دن کے لیے آئے تھے۔ ہماری مخدومہ کو پہنچانے کے لیے بستی گئے۔ وہاں سے اپنی والدہ کے پاس چلے جاویں گے اس گرمی میں کیسا پڑھنا کیسا

لکھنا۔صبح کے وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ ورق گردانی کر لیتا ہوں۔باقی زات دن میں ہوں اور چار پائی۔سُلکڑ بڑا ہوں مگر نیند بھی کچھ میرے گھر کی لونڈی نہیں۔اُس پر تر ڈدا لگ۔کہاں ہنسی مذاق میں دن کٹتا تھا،کہاں چپ کی مٹھائی یا گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھنا پڑتا ہے،عجب ضیق میں جان مبتلا ہے۔بھائی جلدی سے چھٹی کٹے اور پھر یاروں کے جلسے اور چہچہے قہقہے ہوں۔کوئی بیس دن سے زیادہ گزرے۔مگر قسم لے لو جو زبان سے پیار الفظ بموق ایک بار بھی نکلا ہو۔

جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی تردّدات کا تانتا بندھا۔عورتوں نے ایک دوسرے کو جلی کٹی سنائی۔ہماری مخدومہ نے جل بھن کر گلے میں پھانسی لگائی۔ماں نے آدھی رات کو بھانپا۔دوڑیں۔اس کو رہا کیا۔صبح ہوئی۔میں نے خبر پائی۔جھلّایا۔بگڑا۔لعنت ملامت کی بیوی صاحبہ نے اب ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی۔میکے جاؤں گی۔میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ناچار کھیت کا منافع وصول کیا۔ان کی رخصتی کی تیاری کی۔وہ رو دھو کر چلی گئیں۔میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔آج ان کو گئے آٹھ روز ہوئے۔نہ خط ہے نہ پتر۔میں ان سے پہلے ہی خوش نہ تھا اب تو صورت سے بیزار ہوں۔غالباً اب کی جدائی دائمی ثابت ہو۔خدا کرے ایسا ہی ہو۔میں بلا بیوی کے رہوں گا۔بلی بخشے مرغا لنڈورہ ہی رہے گا ادھر ننہال سے والدہ کی طرف سے ضد ہے کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے جب کہتا ہوں میں مفلس ہوں،کنگال ہوں،کھانے کو میسّر نہیں تو والدہ صاحبہ کہتی ہیں تم اپنی رضامندی ظاہر کرو۔تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی۔سنتا ہوں بیوی حسین ہے،باشعور ہے،جیب سے خرچنے بغیر ملی جاتی ہے۔پھر طبیعت کیوں نہ بھر بھرائے۔اور گدگدی کیوں نہ پیدا ہو۔ایشور جانتا ہے۔دو تین دن اس کا خواب بھی دیکھ چکا ہوں۔بہر حال اب کی تو گلا چھڑا ہی لوں گا۔آئندہ کی بات نارائن کے ہاتھ ہے۔

(کچھ سال بعد) میں نے ایک بال ودھوا سے شادی کی اور اس کے ساتھ کافی خوشی کی زندگی گزر رہی ہے۔اس نے کچھ ادبی ذوق بھی پیدا کر لیا ہے اور کبھی کبھی کہانیاں لکھ لیتی ہیں۔وہ نڈر دلیر اور مخلص سمجھوتا نہ کرنے والی عورت ہے،اس سے غلطیاں ہو جانے کا امکان رہتا ہے،اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کام کرتی ہے۔تحریک عدمِ تعاون میں شریک ہو کر جیل بھی ہو آئی ہے۔میں اس سے خوش ہوں اور اس سے اپنی کوئی چیز حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا،جسے دینے میں وہ اہل نہ ہو۔

پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ڈاکٹر ربیندر ناتھ کی کئی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں،ان میں سے بعض کا ترجمہ کیا،میری پہلی کہانی کا نام تھا ’’دنیا

کا سب سے انمول رتن" وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ "زمانہ" میں چھپی اُس کے بعد میں نے "زمانہ" میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ ۱۹۰۹ء میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگالہ کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں "گرم دل" کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حبِ وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔

اُس وقت میں سررشتۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھا اور ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا، کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ "فوراً آ کر مجھ سے ملو۔" جاڑے کا موسم تھا میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ اُن کے سامنے "سوزِ وطن" کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی، میرا ماتھا ٹھنکا، اُس وقت میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتا تھا، مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ مل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اُن لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اُسی کی جوابدہی کے لیے مجھے بلایا ہے۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا، "کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"

صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا، اور آخر میں بگڑ کر بولے "تمھاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے، اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو، مغلوں کا راج ہوتا تو تمھارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمھاری کہانیاں یک طرفہ ہیں، تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے۔" وغیرہ۔

آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ میں "سوزِ وطن" کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لیے بغیر کچھ نہ لکھوں، میں سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا، کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں، میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس سے منگا کر صاحب کی نذر کر دیں۔

میں سمجھا بلا ٹل گئی، لیکن افسرانِ محکمہ کی اس سے سیری نہ ہوئی، چنانچہ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کلکٹر صاحب نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی میرے بارے میں مشورہ کیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس، جن کا میں ماتحت تھا، میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لے کر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں۔ محکمہ پولیس کے

خداوند نے کہا کہ ایسا خطرناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑے اُنھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریقہ پر میرے سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ دراصل اُن کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر رپورٹ میں لکھ دیں گے کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے مگر سیاسی اُمور سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمیٹی نے اس مشورہ کو پسند کیا حالانکہ پولیس کے خداوند اُس وقت بھی پینترے بدلتے رہے۔

مگر کلکٹر صاحب نے ڈپٹی صاحب سے پوچھا: ''آپ کو اُمید ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں آپ سے کہہ دے گا؟''

ڈپٹی صاحب نے کہا: ''اُن سے میری گہری دوستی ہے۔''

''آپ دوست بن کر اُس کے دل کی تھاہ لینا چاہتے ہیں، میں اسے کمینہ پن سمجھتا ہوں۔''

ڈپٹی صاحب اس جواب کے لیے تیار نہ تھے، صاحب کی باتوں سے مرعوب ہو کر بولے: ''میں تو حضور کے حکم......'' مگر صاحب نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی: ''نہیں یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں ایسا حکم نہیں دینا چاہتا۔ اگر کتاب سے سڈیشن ثابت ہوتا ہو تو مصنف پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے ورنہ تنبیہ کر کے چھوڑ دیجیے، منہ میں رام اور بغل میں چھری مجھے پسند نہیں۔''

جب کئی دن بعد یہ واقعہ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے بیان کیا تو میں نے پوچھا: ''؟ کیا آپ سچ مچ میری مخبری کرتے؟''

وہ ہنس کر بولے ''نہیں یہ ناممکن تھا کوئی لاکھ روپیہ بھی دیتا تو بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں تو صرف عدالتی کارروائی روکنا چاہتا تھا، اور میں خوش ہوں کہ وہ رُک گئی۔ مقدمہ عدالت میں جاتا تو سزا ہو جانا یقینی تھی۔ یہاں آپ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا، مگر صاحب بڑے شریف آدمی ہیں۔'' میں نے بھی منظور کیا کہ واقعی بہت شریف ہیں۔

میرے دفتر میں چار چپراسی ہیں۔ ان میں ایک کا نام غریب ہے۔ وہ بہت نیک، بہت فرمانبردار، اپنے کام کو بخوبی انجام دینے والا، گھڑکیاں کھانے کے بعد خاموش رہ جانے والا — اسم بامسمّیٰ آدمی ہے۔ مجھے اس دفتر میں ایک سال سے زائد گزر گیا۔ مگر میں نے اُسے ایک دن کے لیے بھی دفتر سے غیر حاضر نہیں پایا۔ میں اُسے نو بجے دفتر میں اپنی پھٹی وردی میں

بیٹھے ہوئے دیکھنے کا ایسا عادی ہو گیا ہوں کہ گویا وہ بھی اس عمارت کا ایک حصّہ ہے۔ سیدھا اتنا کہ کسی کی بات ٹالنا جانتا ہی نہیں۔

دفتر میں کل چار چپراسی ہیں۔ ان میں ایک مسلمان ہے۔ اس سے تمام دفتر ڈرتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ مجھے تو اس کا سبب بجز اس کی تعلّیوں کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بیان کے مطابق اس کا چچازاد بھائی ریاست رام پور میں قاضی ہے۔ پھوپھو دیا ٹونک میں کوتوال ہے چنانچہ اسی بنا پر میرے دفتر میں تمام صاحبان نے اسے قاضی کا خطاب دے رکھا ہے۔ بقیہ دو صاحب ذات کے برہمن ہیں۔ ان کے آشرباد کی قیمت ان کے کام سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ تینوں کام چور ہیں، گستاخ اور کاہل ہیں۔ معمولی سے کام بھی بغیر ناک بھوں چڑھائے نہیں کرتے۔ کلرکوں کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ صرف ایک بڑے بابو کا کسی قدر لحاظ کرتے ہیں تاہم کبھی کبھی ان سے اُلجھ پڑتے ہیں۔ مگر باوجود ان سب برائیوں کے دفتر میں کسی کی مٹی ایسی خراب نہیں ہے جتنی کہ بچارہ غریب کی۔ ترقی کا موقع آتا ہے تو یہی تینوں بازی مار لے جاتے ہیں۔ غریب کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اور سب دس دس روپیہ پاتے ہیں۔ اور یہ بیچارہ ابھی چھ ہی روپیہ میں پڑا ہے۔ صبح سے شام تک اس کا پیر ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکتا۔ یہاں تک کہ تینوں چپراسی بھی اُسی پر اپنا رعب جماتے ہیں اور اوپر کی آمدنی میں تو اس بیچارہ کا حصّہ ہی نہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ دفتر کے تمام کام پرداز، چھوٹے سے لے کر بڑے تک، سب کے سب اس سے ناراض ہی رہتے ہیں۔ اس کی کئی بار شکایتیں ہو چکی ہیں، کتنے ہی بار جرمانہ دے چکا ہے اور ڈانٹ ڈپٹ تو روزانہ ہی ہوا کرتی ہے۔ اس کا سبب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہاں مجھے اس پر ترس ضرور آتا تھا اور میں اپنے برتاؤ سے یہ دکھلانا چاہتا تھا کہ میری نظر میں اس کی عزت دوسرے چپراسیوں سے مُطلق کم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میں کئی بار اس کے پیچھے دوسرے عملوں سے الجھ بھی پڑا ہوں۔

ایک روز بڑے بابو نے غریب سے میز صاف کرنے کو کہا۔ وہ فوراً میز صاف کرنے لگا۔ اتفاقاً جھاڑن کا جھٹکا لگا تو دوات اُلٹ گئی اور روشنائی میز پر پھیل گئی۔ بڑے بابو دیکھتے ہی جامہ سے باہر ہو گئے۔ اس کے دونوں کانوں کی خوب زور سے گوشمالی کی اور ہندستان کی مروّجہ زبانوں سے مغلّظات چن چن کر سنانے لگے۔ بیچارہ غریب آنکھوں میں آنسو بھرے خاموش کھڑا سنتا رہا گویا اس نے کوئی خون کیا ہو۔ مجھے بڑے بابو کا اس ذرا سی بات پر اس قدر بگڑنا ناگوار گزرا۔ اگر کسی دوسرے چپراسی نے اس سے بھی کوئی بڑی خطا کی ہوتی تو انھیں اس پر اتنا

غیظ و غضب نہ آتا۔ میں نے انگریزی میں کہا: ''بابو صاحب! آپ اس موقع پر ناانصافی سے کام لے رہے ہیں۔ اس نے دیدہ و دانستہ تو روشنائی گرائی نہیں۔ اُس پر اس قدر عتاب سراسر نامناسب ہے۔''

بابو صاحب نے ملائمت سے کہا: ''آپ اسے نہیں جانتے یہ بڑا شریر ہے۔''

''میں تو اس کی کوئی شرارت نہیں دیکھتا۔''

''آپ ابھی اسے نہیں جانتے۔ ایک ہی پاجی ہے۔ اس کے گھروں میں دو ہلوں کی کھیتی ہوتی ہے۔ ہزاروں کا لین دین کرتا ہے۔ کئی بھینسیں لگتی ہیں۔ انھیں باتوں کا اسے گھمنڈ ہے۔''

''گھر کی ایسی حالت ہو تو بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔''

''ابھی آپ ان باتوں کو نہیں جانتے۔ کچھ روز اور رہیے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتنا کمینہ ہے۔''

ایک دوسرے صاحب بول اُٹھے: ''بھائی صاحب اس کے گھر منوں دودھ دہی ہوتا ہے، منوں مٹر جوار، چنے ہوتے ہیں لیکن اس کی کبھی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ یہ چیزیں تھوڑی بہت دفتر والوں کو بھی نذر کرے۔ یہاں ان چیزوں کو ترس کر رہ جاتے ہیں تو پھر کیوں نہ جی جلے اور یہ سب ٹھاٹھ اسی نوکری کی بدولت ہوا ہے۔ ورنہ پہلے تو گھر میں چوہے رینگتے تھے۔''

بڑے بابو کچھ شرمندہ ہو کر بولے: ''یہ کوئی بات نہیں۔ اس کی چیز ہے خواہ وہ کسی کو دے یا نہ دے۔ لیکن بالکل جانور ہے۔''

میں کسی قدر واقف ہو گیا بولا: ''اگر واقعی ایسی اوچھی طبیعت کا آدمی ہے تو دراصل جانور ہے۔ مجھے بالکل معلوم نہ تھا۔''

اب بڑے بابو بھی کھلے۔ جھینپ مٹی، بولے: ''ان سوغات سے کسی کی روٹیاں تو چلتی نہیں۔ صرف دینے والے کی سیر چشمی ظاہر ہوتی ہے اور اُمید بھی اس سے کی جاتی ہے جو اس کے قابل ہوتا ہے جس میں اس کی استعداد ہی نہیں اس سے کوئی توقع ہی نہیں کرتا۔ ننگے سے کوئی کیا لے گا۔''

معمہ حل ہو گیا۔ بڑے بابو نے معمولی طور پر ساری باتیں واضح کر دیں۔ دولت کے بھی دشمن ہوتے ہیں۔ خواہ وہ چھوٹے ہوں۔ ہماری سسرال یا ننہال غریب ہو تو ہم اس سے کوئی اُمید نہیں رکھتے۔ ہم غالباً بھول جاتے ہیں لیکن جب وہ صاحبِ ثروت ہو کر ہم سے تغافل کرتے ہیں تو ہمارے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے اور چھاتی پر سانپ لوٹتا ہے۔

ہم اپنے کسی غریب دوست کے گھر جائیں تو اس کے ایک بیڑے پان ہی سے ہماری

تسکین ہو جاتی ہے لیکن ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جو اپنے دولت مند دوست کے گھر سے بغیر منہ میٹھا کیے واپس آکر اس کا شکوہ نہ کرے۔ سداما کرشن سے اگر نامراد واپس آئے تو شاید وہ ان کے شش پال اور پھر اسندھ سے بھی بڑے دشمن ہوتے۔ یہ انسانی خاصہ ہے۔

چند روز کے بعد میں نے غریب سے پوچھا: ''کیوں جی تمھارے گھر کچھ کھیتی باڑی ہوتی ہے۔''

غریب نے لجاجت کے ساتھ کہا: ''ہاں سرکار، ہوتی ہے۔ آپ کے دو غلام ہیں وہی کرتے ہیں۔''

''گائیں اور بھینسیں بھی لگتی ہیں۔''

''ہاں ہجور بھینسیں لگتی ہیں گائیں ابھی گابھن ہیں۔ آپ لوگوں کی مہربانی سے پیٹ کی روئی چل جاتی ہے۔''

''دفتر کے بابو لوگوں کی بھی کبھی خاطر کرتے ہو۔''

غریب نے نہایت عاجزانہ لہجہ میں کہا: ''سرکار میں آپ لوگوں کی کیا کھاتر کر سکتا ہوں۔ کھیتی میں جو، چنا، مکا جوار کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ آپ لوگ رئیس ہیں۔ راجہ ہیں۔ یہ موٹے اناج کس منہ سے آپ کے بھینٹ کروں۔ ڈرتا ہوں کہ کوئی ڈانٹ نہ بیٹھے اس ٹکے کے آدمی کی یہ مجال۔ اسی لیے بابوجی کبھی ہمت نہیں پڑتی۔ نہیں تو دودھ دہی کی کیا بساط تھی، منہ کے لائق بیڑا تو ہونا چاہیے۔''

''اچھا ایک دن کچھ لا کر دو تو دیکھوں لوگ کیا کہتے ہیں۔ شہر میں یہ چیزیں کہاں میسر ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی طبیعت بھی کبھی کبھی ان چیزوں کی طرف لپکتی ہیں۔''

''اگر سرکار کوئی کچھ کہے تو! صاحب سے شکایت کر دے تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔''

''اس کا میں ذمہ دار ہوں، تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اگر کوئی کچھ کہے گا تو میں اسے سمجھا دوں گا۔''

''تو ہجور آج کل تو مٹر کا دن ہے، چنے کا ساگ بھی ہو گیا ہے اور کولھو بھی کھڑا ہو گیا ہے اور تو کچھ نہیں ہے۔''

''بس تو یہی چیزیں لاؤ۔''

''کچھ اُلٹی سیدھی پڑی تو سرکار ہی کو سنبھالنا ہوگا۔''

''ہاں جی کہہ تو دیا دیکھ لوں گا۔''

دوسرے روز غریب آیا تو اس کے ساتھ تین توانا آدمی بھی تھے۔ دو کے سر پر دو ٹوکرے تھے جن میں مٹر کی پھلیاں تھیں۔ ایک کے سر پر مٹکا تھا جس میں ایکھ کا رس تھا۔ تینوں ایکھ کا ایک ایک گٹھر بھی بغل میں دبائے ہوئے تھے۔ غریب آ کر چپکے سے برآمدہ کے سامنے درختوں کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس کی دفتر میں آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ گویا کوئی مجرم ہو۔

وہ درختوں کے نیچے کھڑا ہی تھا کہ اتنے میں دفتر کے چپراسیوں اور دوسرے عملوں نے اسے گھیر لیا۔ کوئی ایکھ لے کر چوسنے لگا، کوئی مٹر پھلیاں لے کر الگ ہو گیا۔ ایک لوٹ سی مچ گئی۔ اتنے میں بڑے بابو بھی دفتر میں وارد ہوئے اور یہ تماشہ دیکھ کر بلند آواز میں بولے "یہ کیا آفت مچا رکھی ہے، چلو اپنا کام کرو۔"

میں نے جا کر ان کے کان میں کہا: "غریب اپنے گھر سے یہ سوغات لایا ہے، کچھ آپ قبول فرمایئے، کچھ ہم لوگ۔"

بڑے بابو نے مصنوعی عتاب کر کے کہا: "کیوں غریب تم یہ چیزیں یہاں کیوں لائے؟ ابھی واپس لے جاؤ، ورنہ میں صاحب سے رپورٹ کر دوں گا۔ کیا تم نے ہم لوگوں کو کوئی مربھوکا سمجھ رکھا ہے۔"

غریب کا رنگ اُڑ گیا۔ کانپنے لگا۔ منہ سے ایک بات بھی نہ نکلی، لگا میری طرف تقصیروار نگاہوں سے دیکھنے۔

میں نے اس کی طرف سے معافی مانگی۔ بڑی گفت و شنید کے بعد بابو صاحب راضی ہوئے۔ سب چیزوں میں سے نصف گھر بھجوائیں۔ باقی نصف دوسروں کے حصہ میں آئیں۔ اس طرح یہ ناٹک ختم ہوا۔

اب دفتر میں غریب کی عزت ہونے لگی۔ اب اسے روزانہ گھڑکیاں نہ ملتیں۔ تمام دن دوڑنا نہ پڑتا۔ اہلکاروں کی خفگی اور چپراسیوں کی بدزبانیاں غائب ہو گئیں۔ چپراسی لوگ خود اس کا کام کرتے۔ اس کے نام میں بھی تھوڑی سی تبدیلی آئی۔ غریب سے غریب داس بنا۔

عادتیں بھی بدلنے لگیں۔ انکساری کی جگہ خودداری کا ظہور ہوا۔ چستی کی جگہ کاہلی آئی، وہ اب کبھی کبھی دیر کر کے دفتر آتا۔ کبھی کبھی بیماری کا حیلہ کر کے گھر بیٹھ رہتا۔ اس کے اب تمام قصور معاف ہو جاتے۔ اسے حصولِ عزت کا راز معلوم ہو گیا۔ وہ اب دسویں پانچویں دُودھ دَہی وغیرہ لا کر بڑے بابو کی نذر کرتا۔ دیوتا کو خوش کرنے کا ہنر سیکھ گیا۔ سادگی کی جگہ اب اس میں حرفت آ گئی، چالاک بن گیا۔

ایک روز بڑے بابو نے اسے سرکاری فارموں کا پارسل چھڑانے کے لیے اسٹیشن بھیجا۔ کئی بڑے بڑے پلندے تھے۔ ٹھیلے پر آئے، غریب نے ٹھیلے والوں سے بارہ آنہ مزدوری طے کی تھی۔ جب کاغذات دفتر میں پہنچ گئے تو اس نے بڑے بابو سے بارہ آنہ ٹھیلے والا کی اُجرت لی لیکن دفتر سے کچھ دور چل کر اس کی نیت بگڑی۔ اپنی دستوری مانگنے لگا۔ ٹھیلے والے راضی نہ ہوئے۔ اس پر غریب نے سب پیسے جیب میں رکھ لیے اور تند لہجے میں بولا: ''اب ایک پیسہ بھی نہ دوں گا۔ جاؤ جہاں چاہو فریاد کرو، دیکھیں کیا بنا لیتے ہو۔'' قلیوں کو جب یقین ہو گیا کہ اب بغیر دستوری دیے ایک پیسہ بھی ہاتھ نہ لگے گا، جمع ہی غائب ہو جائے گی تو مجبوراً چار پیسہ دینے پر راضی ہو گئے۔ غریب نے آٹھ آنے ان کے حوالے کیے اور بارہ آنے کی رسید پر انگوٹھے کا نشان بنا لیا۔ رسید دفتر میں داخل ہو گئی۔

یہ تماشہ دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ یہ وہی غریب ہے جو کئی مہینہ بیشتر بھولے پن اور فروتنی کی تصویر تھا، جسے دوسرے چپراسیوں سے بھی کبھی اپنے حصّہ کے پیسے مانگنے کی ہمت نہ ہوئی تھی، جو دوسروں کو کھلانا بھی نہ جانتا تھا، کھانے کا ذکر ہی کیا، اس کی فطرت میں یہ انقلاب دیکھ کر مجھے بے حد رنج ہوا۔ اس کا جوابدہ کون ہے؟ میں، جس نے اسے خود پروری اور سفلہ پن کا پہلا سبق پڑھایا تھا۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا کہ اس فتنہ پروری سے جو دوسروں کا خون کرتی ہے، وہ سادگی اور کسمپرسی کیا بری تھی جو دوسروں کا ظلم برداشت کر لیتی تھی۔ وہ منحوس ساعت تھی جب میں نے اُسے احساسِ عزّت کی راہ دِکھانی چاہی تھی۔ دراصل وہ اس کی اخلاقی پستی کی راہ تھی۔ میں نے اس کی ظاہری عزّت کے لیے اس کی روحانی عزّت کا خون کر دیا۔

○

میں ہمیر پور ہی میں تھا کہ مجھے پیچش کی شکایت پیدا ہو گئی۔ گرمی کے دنوں میں یہاں کوئی سبزی ترکاری نہ ملتی تھی۔ ایک بار کئی دن لگاتار خشک اروی کھانا پڑی۔ ایک روز پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا، چورن کھایا، پیٹ پر گرم بوتل پھیری، جامن کا عرق پیا، غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں لیکن درد کم نہ ہوا۔ دوسرے دن پیچش ہو گئی، لیکن درد جاتا رہا۔

اسی طرح ایک مہینہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد میں ایک قصبہ میں پہنچا تو وہاں کے تھانہ دار صاحب نے مجھ سے تھانہ ہی میں ٹھہرنے اور کھانے کو کہا۔ کئی دن سے مونگ کی دال کھاتے کھاتے اور پرہیز کرتے کرتے پریشان ہو گیا تھا۔ سوچا کیا حرج ہے، آج یہیں ٹھہر جاؤ کھانا تو

لذیذ ملے گا۔ تھانہ میں ہی اڑا جا دیا۔ داروغہ جی نے زمین قند پکوایا، پکوڑیاں، دہی بڑے، پلاؤ سب کچھ بنوایا، میں نے بھی خاص طور پر کھایا، لیکن کھا پی کر جب تھانے میں داروغہ جی کے پھوس کے بنگلے میں لیٹا تو دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پھر پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ساری رات اور اگلے دن بھر کراہتا رہا۔ سوڈے کی دو بوتلیں پینے کے بعد قے ہوئی تو چین ملا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ تمام زمیں قند کی خرابی ہے۔ تب سے اروی اور زمین قند دونوں کی صورت دیکھ کر کانپ جاتا ہوں۔ درد تو خیر جاتا رہا لیکن پیچش کی دائمی شکایت ہوگئی۔ پیٹ چوبیس گھنٹے تنا رہتا۔ اپھرن کی شکایت برابر قائم رہی۔ کچھ دنوں تک روزانہ بلا ناغہ چار پانچ میل ٹہلنے جاتا۔ کسرت کرتا، پرہیزی کھانا کھاتا اور کوئی نہ کوئی دوا بھی کھایا کرتا، لیکن پیچش میں کوئی کمی نہ ہوئی اور بدن بھی سوکھا جاتا تھا، کئی مرتبہ کانپور آ کر علاج کرایا۔ ایک بار مہینے بھر الہ آباد میں آیورویدک اور ڈاکٹری دوائیں کھاتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

ہمیر پور میں نے اپنے تبادلہ کی درخواست کی۔ چاہتا تو یہ تھا کہ روہیل کھنڈ میں تبدیل ہو، مگر پٹکا گیا بستی کے ضلع میں اور وہ حلقہ ملا جو نیپال کی ترائی کے قریب ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں میرا تعارف پنڈت منن دویدی گجپوری سے ہوا جو ڈمریا گنج میں تحصیل دار تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر علمی مباحث پر بات چیت ہوتی رہی۔ لیکن بستی آ کر پیچش کی شکایت اور بڑھ گئی۔ تب میں نے چھ مہینے کی چھٹی لی اور لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں علاج کرایا۔ یہاں فائدہ نہ ہوا تو بنارس کے ایک حکیم کا علاج کیا۔ تین چار مہینے کے بعد تھوڑا افائدہ معلوم ہوا لیکن بیماری جڑ سے نہ گئی۔ رخصت کے بعد جب پھر بستی پہنچا تو وہی حالت ہوگئی۔ تب میں نے دورے کی نوکری چھوڑ کر بستی ہائی اسکول میں اسکول ماسٹری قبول کر لی۔ یہاں سے تبدیل ہو کر گورکھپور پہنچا مگر پیچش کی شکایت حسب سابق قائم رہی۔

○

رفاقت حسین میرے دفتر کا دفتری تھا۔ دس روپیہ ماہوار مشاہرہ تھا۔ اور دو تین روپے متفرق جلد بندیوں سے مل جاتے تھے۔ یہی اس کی کائنات تھی۔ مگر وہ اپنی حالت پر قانع وشاکر تھا۔ اندر کے حال کا تو علم نہیں۔ پر وہ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتا۔ اور شگفتہ وخنداں رہتا۔ قرض سے جو اس طبقہ کے آدمیوں کی ایک لازمی صفت ہے۔ اس کا دامن پاک تھا۔ اُس کے سلام بھی تملق آمیز انکسار سے پاک ہوتے تھے۔ اُس کی باتوں میں عمال کی ناز برداری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اُس میں متانت اور خودداری کی ایک شان تھی۔ جس نے اُسے اُس کی حیثیت

سے زیادہ ممتاز بنا رکھا تھا۔ اس میں بے باکانہ صاف گوئی کی ایک خاص صفت تھی۔ عمال میں جو عیوب نظر آتے صاف کہہ دیتا۔ اور کسی قدر تکبر کی شان سے گویا وہ اپنے تئیں اُن سے بہتر سمجھتا تھا۔ اُسے جانوروں سے خاص اُنس تھا۔ ایک گھوڑی پال رکھی تھی۔ ایک گائے۔ دو تین بکریاں۔ ایک بلّی۔ ایک کتا۔ چند مرغے مرغیاں۔ ان جانوروں پر جان دیتا تھا۔ بکریوں کے لیے پتیاں توڑ لاتا۔ گھوڑے کے لیے گھاس کھودتا۔ اور باوجود یہ کہ اُسے ہر ماہ مویشی خانہ کی زیارت کرنا پڑتی تھی۔ اور اکثر لوگ اس کے اس خبط کا مضحکہ اُڑاتے تھے پر وہ اپنی طرز زندگی میں کوئی تغیر وضع داری کے خلاف سمجھتا تھا۔ اور اُس کا یہ شوق منافع یا تجارت کے خیال پر مبنی نہ تھا۔ کسی نے اُسے مرغیوں کے انڈے بیچتے نہیں دیکھا۔ اس کی بکریوں کے بچے کبھی بغدہ قصاب کے چھرے کے نیچے نہیں گئے۔ اور اُس کی گھوڑی نے کبھی چار جامہ یا لگام کی صورت نہیں دیکھی۔ اس سے اُس کی منشا بجز افزونیِ نسل کے اور کچھ نہ معلوم ہوتی تھی۔ خالص۔ بے غرضانہ محبت تھی۔ مرغیوں کی ایک خاصی ٹولی ہوگئی تھی۔ بکریوں کا ایک خاصا گلّہ۔ گھوڑی اور گائے بھی اس کارِ خیر میں بقدرِ ہمت شریک تھیں۔ گائے کا دودھ کتا پیتا تھا۔ بکری کا دودھ بلّی۔ جو کچھ بچتا تھا، وہ اپنے صرف میں لاتا، حق یہ ہے۔ اس کا دل وسیع تھا، اور وسائل کے ظرف تنگ میں نہ سماتا تھا۔

خوش قسمتی سے اس کی بیوی بھی نیک بخت عورت تھی۔ اور کمتر درجہ کی عورتوں کے عیوب سے مبرا۔ اگرچہ اُس کا مکان نہایت مختصر تھا۔ پر کسی نے دروازے پر اُس کی آواز نہیں سنی۔ کسی نے اُسے دروازے پر کھڑے جھانکتے نہیں دیکھا۔ وہ زیور اور کپڑے کے تقاضوں سے شوہر کی نیند حرام نہ کرتی تھی۔ ''اور! اور!!'' کی دُھن میں موجودہ عافیت اور اطمینان کا خون نہ کرتی تھی۔ دفتری اس عورت کا عاشق تھا۔ اُس کی پرستش کرتا تھا۔ اس اہلی مسرت میں اس کی شگفتہ طبعی کا راز پوشیدہ تھا۔ دفتری نیک کرے یا بد۔ اس کی بیوی اس کے ہر ایک کام میں اس سرگرمی سے شریک ہوتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، یہ اُسی کی تحریک ہے۔ وہ گائے کا گوبر اُٹھاتی۔ گھوڑی کو گھاس ڈالتی۔ بکری کے بچوں کے ساتھ کھیلتی۔ بلّی کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتی۔ یہاں تک کہ کتے کو نہلانے سے بھی اُسے پرہیز نہ تھا۔ معلوم نہیں۔ یہ اُس کا تقاضائے طبعی تھا، یا شعارِ وفا۔ پر دفتری اُسے اس کی عصمت شعاری ہی سمجھتا تھا۔

برسات کے دن تھے۔ ندیوں میں باڑھ آئی ہوئی تھی۔ دفتر کے اہلکار مچھلیوں کا شکار کھیلنے چلے۔ شامت کا مارا رفاقت بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔ دن بھر لوگ شکار کھیلا کیے۔ شام کو زور کی

بارش ہوئی۔ اہلکاروں نے ایک موضع میں رات کاٹی۔ دفتری گھر چلا۔ پر اندھیری رات تھی۔ راستہ میں گھٹنوں تک پانی۔ کچھ دُور چل کر راہ بھول گیا، اور ساری رات بھٹکتا پھرا۔ بیوی کی تنہائی اتنی پریشانیوں سے زیادہ تشویش ناک تھی۔ اُس کے دل پر ایک موہوم اضطراب حاوی تھا۔ صبح کو جب گھر پہنچا تو ابھی اندھیرا ہی تھا۔ لیکن دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اس کا کتا دُم دبائے ایک دردناک انداز سے کراہتا ہوا آ کر اس کے پیروں پر لوٹنے لگا۔ حالانکہ اس کی بیوی منہ اندھیرے اُٹھا کرتی تھی، پر آج دروازوں کو کھلا ہوا دیکھ کر اس کا کلیجہ سَن سے ہو گیا۔ گھر میں قدم رکھا تو بالکل سناٹا تھا۔ دو تین بار بیوی کو پکارا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اُسے آج در و دیوار پر ایک حسرت سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس نے دونوں کوٹھریوں میں جا کر دیکھا۔ جب وہ وہاں نظر نہ آئی تو گھبرایا ہوا جانوروں کی کوٹھریوں میں گیا۔ اندر قدم رکھتے ہوئے اُسے وہی بے معنی مہمل ہراس ہو رہا تھا، جو کسی اندھیرے غار میں جاتے ہوئے ہوتا ہے۔

اُسے دیکھتے ہی گھوڑی ہنہنائی۔ گائے اور اُس کا بچھڑا تڑ پھڑائے۔ بکریوں نے میں میں شروع کی۔ اُن کی صداؤں میں ایک خاص درد تھا۔ وہیں بیچ میں زمین پر اس کی بیوی چت پڑی ہوئی تھی۔ منہ پر مکھیاں بیٹھی ہوئی تھیں، ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے، آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ رفاقت نے زور سے ایک چیخ ماری اور چھاتی پیٹنے لگا۔ دفعتاً ایک کالا سانپ اندھیرے گوشے سے نکل کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف جاتا نظر آیا۔ دفتری کے ہاتھ میں کوئی لکڑی نہ تھی، مگر انتقام کے جوش میں اس نے لکڑی کی پروا نہ کی۔ لپک کر سانپ کی دُم پکڑ لی۔ اور اُسے اتنے زور سے گھبرا کر زمین پر پٹکا کہ وہ وہیں مر گیا۔ اُس کی آہ و زاری سن کر محلہ کے لوگ جمع ہو گئے۔ تابوت و کفن کا انتظام ہونے لگا۔ دفتری دم و بخود مبہوت اس طرح بیٹھا ہوا تھا۔ گویا اب اُسے زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ باحیا عورت شاید جانوروں کو باندھنے کے لیے اندھیری کوٹھری میں آئی تھی۔ سانپ نے کاٹا اور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ حیا کے مارے پڑوسیوں کو بھی خبر نہ دی۔ یا ممکن ہے مینہہ کے شور میں اُس کی گریہ وزاری کی آواز کسی کے کانوں میں نہ پہنچی ہو۔

دوسرے دن رفاقت دفتر آیا تو اُسے پہچاننا مشکل تھا۔ گویا برسوں کا مریض ہے۔ صورت زرد۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی۔ آنکھوں میں ایک دہشت آمیز نقشہ سا نظر آتا تھا۔ بالکل کھویا ہوا۔ گم صم بیٹھا رہا۔ گویا کسی دوسری ہی دنیا میں ہے۔ شام ہوتے ہی وہ اُٹھا اور بیوی کے مزار پر جا کر بیٹھ گیا۔ اندھیرا ہو گیا، دو تین چار گھڑی رات گزر گئی۔ پر وہ چراغ کی ٹمٹماتی

ہوئی روشنی میں اُسی مزار پر، یاس واندوہ کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ گویا موت کا انتظار کر رہا ہے۔ یا شہرِ خموشاں کی مدھم صداؤں کی طرف کان لگائے ہوئے ہے۔ معلوم نہیں کب گھر آیا۔ اب یہی اُس کا روزانہ معمول ہو گیا۔ صبح اُٹھ کر مزار پر جاتا۔ جاروب کشی کرتا۔ پھولوں کے ہار چڑھاتا۔ لوبان جلاتا۔ اور تب دو زانو بیٹھ کر نو بجے تک قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ مغرب کے وقت پھر مزار پر جا بیٹھتا۔ اور پھر وہی جاروب کشی۔ وہی تلاوت قرآن وہی شمعِ مزار، اور پھر وہی پھولوں کے ہار۔ اب یہی اس کی زندگی کا نظام تھا۔ وہ اب عالمِ ارواح میں بستا تھا، جہاں ملائک اُس کے انیس و غمگسار تھے۔ دنیائے ظاہر سے اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ جہاں رنج و محن کے سوا اور کچھ نہیں۔ اُس کی باتوں سے روحانیت ٹپکتی تھی اور بشرہ سے ایک تقدس کی شان نمایاں تھی۔ غم نے مجذوب بنا دیا تھا۔

کئی ماہ تک یہی کیفیت رہی۔ اہلکاروں کو اس سے ایک خاص ہمدردی ہو گئی تھی۔ اُس کے کام بھی اکثر لوگ اپنے ہاتھوں کر لیتے، اُسے تکلیف نہ دیتے۔ اُس کی وفا پرستی پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ اور گو کتنے ہی حضرات دل میں اسے حماقت سمجھتے تھے، پر یہ خیال اُن کی زبان تک نہ آتا تھا۔ یہ حماقت ہی سہی، لیکن کتنی پاکیزہ کتنی علوی تھی۔!

مگر انسان عالمِ ارواح میں مستقل سکونت اختیار نہیں کر سکتا۔ وہاں کی آب و ہوا اُس کے موافق نہیں۔ وہاں مادّی۔ مرئی۔ قابلِ احساس کیفیات کہاں۔ اجتہاد میں وہ خوشیاں، وہ فکریں۔ وہ مشغلے۔ وہ دل بستگیاں کہاں۔ دفتری کو آدھی رات تک مزار کی جاروب کشی کے بعد چولھا جلانا پڑتا۔ علی الصباح جانوروں کی خدمت کرنا پڑتی۔ حقیقت نے جذبات پر فتح پائی۔ ریگستان کے پیاسے مسافر کی طرح رفاقت پھر متاہل زندگی کے چشمۂ شیریں کی طرف دوڑا۔ وہ پھر زندگی کا وہی دلچسپ ڈراما دیکھنا چاہتا تھا۔ کوئی مضائقہ نہیں، اگر وہ ایکٹرس نہ تھی۔ ایکٹرس کی تبدیلی ڈراما کی دلآویزی میں بارج کیول ہو۔ تماشے کی یاد جب تک تازہ تھی، ایکٹرس کے خط و خال، ناز و ادائے اور ڈھن کی تصویر آنکھوں کے سامنے تھی۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا تھا، تماشے کا لطف ایکٹرس کے حسن و ادا سے بے نیاز ہوتا جاتا تھا۔ بیوی کی یاد اہلیت کے مزوں کی صورت میں قائم ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ چھ مہینہ میں تجربہ نے اپنا عمل پورا کر دیا۔ بیوی کی محبت تاہل کی خوشیوں کی یاد میں فنا ہو گئی۔

اس محلہ کے دوسرے سرے پر بڑے صاحب کا ایک اردلی رہتا تھا۔ اس کے یہاں سے شادی کی بات چیت شروع ہوئی۔ میاں رفاقت پھولے نہ سمائے۔ اردلی صاحب محلہ میں کسی

وکیل سے کم ممتاز نہ تھے۔ سارے محلہ پر اُن کا رُعب حاوی تھا۔ ان کے وسائل آمدنی لال بجھکڑوں کے لیے بھی ایک عقدہ تھے۔ اس پر صرف ''غیر محدود'' کا اطلاق کیا جا سکتا تھا، اور اس کی عامیانہ زبان میں تفسیریں کی جاتی تھی کہ جو کچھ مل جائے، وہ تھوڑا ہے۔ اردلی صاحب خود اپنی زبان مبارک سے فرماتے تھے کہ تکادی کے موسم میں انھیں جیب کی جگہ تھیلیاں رکھنا پڑتی تھیں۔ دفتری نے سمجھا سونے کی چڑیا پھنس گئی۔ اس طرح ٹوٹا جیسے بچّے کھلونے پر ٹوٹتے ہیں۔ ایک ہفتہ میں سارے مرحلے طے ہو گئے، اور بیوی گھر میں آ گئی۔ جو شخص ابھی ایک ہفتہ قبل دُنیا سے منہ موڑے ہوئے اعتکاف میں بیٹھا ہو۔ اُسے منہ پر سہرا ڈالے، گھوڑے پر سوار دیکھنا خواصِ انسانی کا ایک دلچسپ مطالعہ تھا۔ لیکن دفتری اس وقت ایسا شاداں و خنداں تھا گویا قیدِ تاریک سے نکل آیا ہو۔ نقد و جنس بھی جہیز میں اس قدر ملا تھا، جو اردلی صاحب کو چاہے گراں نہ گزرا ہو، پر رفاقت کے پیمانہ اُمید سے کہیں زیادہ تھا۔ چنانچہ کئی دن تک خوب جشن رہے۔ اہلکاروں کی دعوت ہوئی۔ فقراء کو کھچڑی کھلائی گئی۔ سارے محلہ میں شیرینی تقسیم ہوئی۔ چشمہ حیات پا کر بھی انسان اس سے زیادہ شادکام نہیں ہو سکتا۔

مگر ایک ہی ہفتہ میں نئی بیوی کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ خدا نے اُسے نگاہ ظاہر کے بدلے نگاہِ باطن عطا کی تھی۔ اس کا ثبوت اُس کی وہ روانیِ بیان تھی جو اب اکثر پڑوسیوں کو محظوظ اور رفاقت کو منکوب کیا کرتی تھی۔ قناعت کی جیتی جاگتی مورت تھی۔ گلی کے باہر تو کیا اس کے اندر بھی پاؤں نہ پھیلاتی۔ گھسٹ گھسٹ کر چلتی۔ ایک مجسمۂ فروتنی تھا جو کھڑے ہونے کو بھی گردن کشی سمجھتا تھا۔ اُس نے ایک ہفتہ تک فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ دفتری کے عادت و اطوار کا مطالعہ کیا، اور تب اُس کی تنبیہ و تلقین شروع کی۔

''تم بھی عجیب طرح کے آدمی ہو۔ انسان جانور پالتا ہے اپنے آرام کے لیے۔ نہ کہ محض دردِ سر کے لیے۔ یہ کیا کہ گائے کا دودھ کتّے پئیں۔ بکریوں کا دودھ بلّیاں چٹ کر جائیں، اور گھر کے آدمیوں کے حلق تلے ایک قطرہ بھی نہ جائے، نجس کتّا تو دودھ میں نہائے اور گھر کے آدمی ترسیں۔ آج سے سب دودھ گھر میں لایا کرو، اور ان موذیوں کو میرے سامنے سے دفان کرو۔ مسلمان کا گھر ہے یا کوئی سرائے۔ آخر دین بھی تو کوئی چیز ہے۔ جس کا سایہ پڑنا شرع میں منع ہے اُسے پال کر میں عذاب نہ لوں گی۔''

دفتری لاجواب ہو گیا۔ دوسرے دن سے گھوڑی کا دانہ بند ہو گیا۔ وہ اب بھاڑ میں بھنتا اور نمک مرچ سے کھایا جاتا تھا۔ صبح کو تازہ دودھ کا ناشتا ہوتا۔ آئے دن کھیر پکتی۔ اور لوازمات

بھی بھی بڑھے۔ بڑے گھر کی بیٹی تھی، زردے اور پان بغیر کیوں کر رہتی۔ گھی گوشت مسالہ بھی ضروری مدیں تھیں۔ اور خادمہ کے بغیر تو زندہ رہنا محال تھا۔ پہلے ہی مہینہ میں دفتری کو معلوم ہوگیا کہ موجودہ آمدنی گزر کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ اُس کی حالت اُس آدمی کی سی تھی، جو شکر کے دھوکے میں کونین پھانک گیا ہو۔ معلوم نہیں اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی، مگر ماتھے پر شکن نہ تھی۔ دو چار منچلے اہلکاروں نے ایک دن اس سے مزاح آمیز ہمدردی ظاہر کی تو وہ بڑی متانت سے بولا: ''آخر اس اللہ کی بندی کا بھی تو کہیں گزر ہونا چاہیے تھا۔ اُس کا کون پرسانِ حال ہوتا۔ اور پھر بلا خدا کی مرضی کے تو کچھ ہوتا نہیں۔ میں اس کی مرضی میں دخل دینے والا کون؟''

مردانہ توکّل کا نظارہ کتنا دردناک ہے۔ یہ وہ نغمۂ درد ہے جسے سن کر دل ہل جاتا ہے۔ یہ وہ سُرخیِ چشم ہے، جو سوز دروں کا پتہ دیتی ہے۔ یہ تبسم بشاشتِ قلب کی نہیں، سوزِ دل کی خبر دیتا ہے۔ اس شفق کی اوٹ میں شبِ تار چھپی ہوتی ہے۔ ڈراؤنی اور سنسان۔

وہ دفتری جو افلاس میں تموّل کا لطف اُٹھاتا تھا، اب آشفتہ حالی کی ایک زندہ تصویر تھا۔ کپڑے میلے، سر کے بال پریشان، چہرہ پر اُداسی چھائی ہوئی۔ شب و روز فکرِ معاش کی چکی جتا ہوا۔ ''اور! اور!'' کی فکر میں پریشان اسے دیکھ کر آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ اُس کی گائے اب ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ گھوڑی نیم جان۔ بلّی پڑوسیوں کے چھینکوں پر الجھتی۔ اور کتا گھوروں اور کوڑے کے ڈھیروں پر اپنا آذوقہ تلاش کرتا۔ سڑک پر پڑی ہوئی ہڈیاں چچوڑتا۔ مگر اب بھی وہ ہمت کا دھنی ان رفقائے قدیم کو الگ نہ کرتا تھا۔ اب ان سب مصیبتوں پر مزید یہ کہ اُسے دونوں وقت چولھے کی آنچ میں جلنا پڑتا تھا۔ مگر سب سے بڑی مصیبت بیوی کی وہ زبان درازی تھی جس کے سامنے کبھی کبھی اس کا مردانہ استقلال، اُس کا دلیرانہ توکّل، اس کی ستم ظریفانہ خندہ جبینی رخصت ہوجاتی، اور وہ اندھیری کوٹھری کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ لطفِ قناعت سے محروم ہوکر رفاقت کا دل پُر داغ لاپروائی اور وارفتگی کی جانب مائل ہوگیا۔ وہ فکرِ فردا سے آزاد ہوگیا۔ خودداری جو قناعت کی برکت ہے، اس کے دل سے محو ہوگئی۔ شمع سوزاں کے بجھنے کے بعد وہ جگنو کی طرف لپکا۔ اُس نے فاقہ مستی کی روش اختیار کی۔ چونکہ اب پانی رکھنے کے لیے کوئی برتن نہ تھا، وہ اُسے کنوئیں سے کھینچ کر اُسی وقت پی جانا چاہتا تھا تاکہ وہ زمین پر نہ بہہ جائے۔ تنخواہ پا کر اب وہ مہینہ بھر کا سامان نہ جمع کرتا۔ نانِ گرم اور آبِ سرد سے اب اُسے تسکین نہ ہوتی تھی۔ بازار سے فیرنی کی پیالیاں لاتا، سیخ کے کباب اور بالائی کے دونے اور قلمی آم کی طرف لپکتا۔ دس روپیہ کی بساط ہی کیا۔ ایک ہفتہ میں غائب ہوجاتے۔ تب جلد بندیوں کے پیشگی روپوں پر گزران ہوتی۔ بعدازاں ایک دن فاقہ

کشی کی نوبت آئی۔ تب قرض مانگنے لگتا۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ تنخواہ کے روپے قرض خواہوں ہی کے ہاتھوں میں چلے جاتے۔ اور وہ پہلے ہی دن سے پھر اُسی فکر میں پریشان دوڑنے لگتا۔ وہ پہلے دوسروں کو کفایت شعاری کے وعظ سنایا کرتا تھا، اب لوگ اُسے سمجھاتے، پر وہ فقیرانہ بے نیازی سے کہتا: "صاحب! آج ملتا ہے، کھاتے ہیں، کل خدا حافظ ہے، ملے گا کھائیں گے، نہیں پڑ کر سو رہیں گے۔" اس کی حالت اب اُس مریض کی سی ہوگئی تھی جو شفا سے مایوس ہو کر ہر ایک قسم کی بد پرہیزی اور بے احتیاطی کرنے لگے، تاکہ موت کے آنے تک وہ نعمت ہائے دُنیا سے سیر ہو جائے۔

مگر شاید ابھی تک وضع داری کا احساس باقی تھا۔ لوگوں کے بہت اصرار کرنے پر بھی وہ گھوڑے یا گائے کے بیچنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ خریدار آآ کر اُس کے دروازے سے لوٹ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ہفتہ تک روپیہ کی فکر میں سرگرداں رہا۔ خوراک اور تاوان کے روپے بڑھتے گئے، اور بالآخر دونوں جانور سرکاری قاعدہ کے مطابق نیلام ہوگئے۔ دفتری نے کئی دن تک ان کا ماتم کیا۔ بکریاں بھی گرگ قرض کا شکار ہوگئیں۔ زردہ اور پلاؤ، فیرنی اور کباب کے چسکے نے نانبائی کا مقروض بنا دیا تھا۔ جب اُس نے نقد وصولی کی کوئی صورت نہ دیکھی تو ایک دن دفتر کے دروازہ پر آکر ساری بکریاں ہانک لے گیا۔ بیچارہ منہ تاکتا رہ گیا۔ بلّی نے بھی اب رسم وفا کو ترک کیا۔ گائے اور بکریوں کے جانے کے بعد اُسے دودھ کے برتنوں کو چاٹنے کی بھی آس نہ رہی، جو اُس کی وفاداری کا آخری رشتہ تھا۔ ہاں کتا ابھی تک عنایات قدیم کو یاد کر کے رفاقت کا دم بھرتا تھا۔ مگر اس کی زندہ دلی رخصت ہوگئی تھی۔ یہ وہ کتا نہ تھا۔ جس کے سامنے دروازہ پر سے کسی اجنبی آدمی یا کتے کا نکل جانا محال تھا۔ وہ اب بھی بھونکتا تھا، لیکن لیٹے لیٹے اور بسا اوقات پہلو میں سر چھپائے ہوئے گویا موجودہ بے اعتنائیوں اور نیرنگی فلک کا گلہ کر رہا ہو۔ یا تو اُس میں اب اُٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی یا وہ نوازش ہائے دیرینہ کا اتنا ہی تشکر کافی سمجھتا تھا۔

اگرچہ رفاقت کی وہ صاف گوئی ابھی تک باقی تھی لیکن اب اس کی کسی کی نگاہ میں کچھ وقعت نہ تھی۔ وہ ہرزہ سرائی سمجھی جاتی تھی۔ جیسے کسی بیوہ کی گالیاں۔ ایک روز چند پڑوسیوں نے اُس پر نئی بیوی کے متعلق کوئی پھبتی کہی۔ زود رنجی بدنوائی کی ایک خاص صفت ہے۔ دفتری جامہ سے باہر ہوگیا، نیم برہنہ ایک پھٹا پاجامہ پہنے ہوئے وہ تند و گرم ہو رہا تھا۔ گلے کی رگیں تنی جاتی تھیں۔ پنڈلیوں میں رعشہ تھا۔ منہ میں کف۔ مگر اہل خطاب بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ گویا کوئی کتا بھونک رہا ہو۔ وہ ذلت کی اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ لوگ اس کے غصہ کو بھی حقیر سمجھنے

لگے تھے۔

ایک بار میری تحریک سے دفتر کے اہلکاروں نے ازراہِ ہمدردی اس کے لیے مہینہ بھر کی جنس خرید کر رکھ دی۔ مگر مہینہ بھر کی جنس ایک ہفتہ میں غائب ہوگئی۔ چاول کے بدلے آم لیے گئے، دال کے بدلے جامن۔ دن میں تین تین بار چولھا جلا۔ اور پھر وہی فاقہ مستی اور تنگدستی شروع ہوگئی۔ انجام کار لوگوں کے دل اس کی طرف سے سخت ہوگئے۔ کوئی اُسے ایک پیسہ قرض نہ دیتا۔ وہ سامنے کھڑا عاجزانہ صورت بنائے منّتیں کرتا، دُعائیں دیتا، پر کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ میں دفتر سے آ کر دروازے پر بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا اور تفریح کے طور پر حقّہ کے کش بھی لیتا جاتا تھا۔ معلوم نہیں اوروں کا کیا خیال ہے، پر مجھے تو تمباکو تکانِ دماغ کا بہترین مصلح معلوم ہوتا ہے کہ دفعتاً میں نے میاں رفاقت کو آتے ہوئے دیکھا۔ شاید کوئی دیہاتی آدمی سمن والے چپراسی سے بھی اس قدر خائف نہ ہوتا ہوگا۔ لڑکے ٹیکا لگانے والے سے بھی اس قدر نہ ڈرتے ہوں گے۔ میں ایک عالم وحشت میں کرسی سے اُٹھا اور چاہا کہ اندر جا کر دروازہ بند کرلوں۔ مگر بدقسمتی سے چلم اس پریشانی میں دامن سے اُلجھ کر زمین پر گر پڑی اور میں اُسے اُٹھانے میں مصروف ہوگیا۔ اتنے میں دفتری دروازہ کے سامنے آ گیا۔ اب میرے لیے راہِ فرار بند تھی۔ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پر ناک بھوں چڑھائے ہوئے دفتری کس لیے آ رہا ہے۔ اس میں مجھے ذرّہ بھر بھی شک نہ تھا۔ استقراء اس میں میرا مشیر تھا۔ قرض گیروں کی غرض اُن کے چہرہ پر، اُن کے حرکات وسکنات پر، جلی خطوں میں، روشن رنگوں سے کھنچی ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص قسم کی خفت آمیز لجاجت ہوتی ہے۔ جسے ایک بار دیکھ کر پھر نہیں بھلایا جا سکتا۔

دفتری نے آتے ہی آتے بغیر کسی دیباچہ یا تمہید کے اپنا مدعا بیان کر دیا جس کا مجھے پہلے ہی سے علم تھا۔

میں نے ترشی سے جواب دیا۔ ''میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

دفتری نے سلام کیا اور اُلٹے قدم لوٹا۔ اُس کے چہرہ پر ایسی حسرت، ایسی بے کسی چھائی ہوئی تھی کہ مجھے بے اختیار اس پر رحم آیا۔ اُس کا اس طرح لوٹنا کتنا پُر معنی تھا۔ اس میں تقصیر کا اعتراف، گزشتہ کی ندامت، اپنی معذوری کا اظہار یہ سب جذبات چھپے ہوئے تھے۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ لیکن اُس کا چہرہ مجسّم بیان ہوکر کہہ رہا تھا— 'مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے یہی جواب دیں گے۔ اس میں مجھے ذرّہ بھر بھی شک نہ تھا۔ لیکن باوجود اس یقین کے

میں یہاں تک آیا۔ معلوم نہیں کیوں۔ خود میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید آپ کی درد رسی کا خیال، آپ کی نگاہِ ترحم کی اُمید مجھے یہاں تک لائی۔ اب جاتا ہوں، وہ منّہ ہی نہیں رہا کہ عرض حال کروں۔ اس تکلیف دہی کے لیے معاف فرمایئے گا۔"

میں نے دفتری کو آواز دی۔ "ذرا سنو تو۔ کیا ضرورت ہے؟"

دفتری کی اُمید کچھ تازہ ہو گئی، بولا: "حضور آپ سے کیا عرض کروں۔ دو دن سے لگاتار فاقہ ہو رہا ہے۔"

میں نے بہت ملائم انداز سے سمجھایا: "مگر اس طرح قرض دام لینے سے کتنے دنوں تک کام چلے گا۔ اپنا خرچ سمیٹتے کیوں نہیں ہو۔ جتنا پاتے ہو، اس سے کم خرچ کرو۔ خواہ کتنی ہی ضرورت کیوں نہ درپیش ہو۔ پھر روزِ اوّل سے کیوں قرض کی فکر سوار ہو۔ اسی خیال سے میں نے ایک بار تمھارے لیے مہینہ بھر کے خرچ کا انتظام کر دیا تھا۔ مگر تم نے پھر وہی پُرانی روش اختیار کی۔ تم سمجھ دار آدمی ہو، جانتے ہو کہ اس زمانہ میں کسی کے پاس ہر وقت روپے موجود نہیں رہتے۔ ہر شخص اپنی اپنی فکروں میں مبتلا ہے۔ اور بالفرض کسی کے پاس ہوں بھی تو وہ 'قرض دادن و در دِسر خریدن' کے مصداق کیوں عمل کرنے لگا۔ دس دروازوں کا چکّر لگاتے ہو تب کہیں ایک جگہ مراد بر آتی ہے۔ بتلاؤ یہ کتنی شرمناک بات ہے! آخر معاملہ کیا ہے۔ تمھاری یہ حالت میں دو ڈھائی سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے قبل تو تم بہت فارغ البال نظر آتے تھے۔"

دفتری نے متوکلانہ انداز سے کہا: "حضور تقدیر کی گردش ہے، اور کیا عرض کروں۔ آپ پر تو سب روشن ہے۔ میں اپنی اہلیہ کے ہاتھوں خستہ اور خوار ہوں، میں حلفیہ کہتا ہوں۔ مجھے اس کے اندھی اور لنگڑی ہونے کا شمہ بھر بھی ملال نہیں ہے۔ یہ تو مولیٰ کی مرضی ہے۔ افسوس مجھے اُس کے چٹورے پن کا ہے۔ میری تقدیر کی گردش، میری بدنصیبی، میری خانہ بربادی، میرے نحس ستارے، سب کچھ اس شکم پرستی کے نام ہیں۔ یہی میری نحوست کی گھٹا ہے۔ میں نے کئی بار چاہا کہ ماہوار انتظام کروں۔ پر جو چیز مہینہ بھر کے لیے لاتا ہوں، وہ ایک دن میں اُڑ جاتی ہے۔ اگر ایک دن دودھ نہ ملے تو جناب مہنا متھ مچا دے۔ صبح کو ناشتے کے لیے امرتیاں نہ لاؤں تو گھر میں قیامت برپا ہو جائے۔ اگر گوشت نہ پکے تو میری بوٹیاں نوچ کھائے۔ خاندان کا شریف ہوں۔ یہ بے حرمتی نہیں برداشت ہوتی کہ کھانے پینے کے لیے بیوی سے بم چخ کروں۔ اُس کی بدزبانی کے خوف سے تھر تھر کانپتا رہتا ہوں۔ اُس کی جو کچھ اُلٹی سیدھی فرمائش ہوتی ہے، سر کے بل بجالاتا ہوں۔ جناب ایسی تند مزاج ہے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ بس اب خدا سے یہی دُعا ہے۔ کہ مجھے دُنیا سے اُٹھا لے۔ اور اس عذاب سے نجات دے۔ اس

کے سوا مجھے تو کوئی اور صورت نہیں نظر آتی۔ میں سب کچھ کر کے ہار گیا۔"

میں لاجواب ہو گیا۔ صندوق سے پانچ روپے نکالے۔ اور اُسے دے کر بولا۔ "یہ لو! یہ تمھاری غیرت مندانہ مستقل مزاجی کا انعام ہے، قرض نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمھارا دل اتنا وسیع ہے۔"

دفتری نے زمین دوز سلام کیا اور چلا گیا۔

O

(پریم چند اکثر بیمار رہتے تھے۔ الٰہ آباد لکھنؤ بنارس کانپور وغیرہ جاکر علاج معالجہ کراتے رہتے تھے۔ مگر کہیں تسلّی بخش علاج نہیں ہوا۔ ان کے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے اس لیے ان کی خواہش تھی کہ جیتے جی اپنے پسماندگان کے لیے ایک مکان اور مستقل آمدنی کا انتظام کردیں تاکہ انہیں کسی کا دست نگر نہ رہنا پڑے۔
معاش کے لیے اپنا ایک پریس ہو۔ جہاں کتابیں بھی شائع ہوں اور ایک رسالہ بھی نکالا جاسکے۔ میری تنخواہ ستر روپے ماہوار تھی۔ افسانوں اور مضامین سے آمدنی بہت کم تھی۔ سوتیلے بھائی مہتاب رائے کو بیس پچیس روپے ماہوار لکھنؤ بھیجنے پڑتے۔ والدہ کو بھی گزر مشکل سے ہوتا تھا اس لیے لاٹری میں قسمت آزمائی کے لیے ایک بار شرکت میں لاٹری کی ٹکٹ لی۔ نگم کو لکھ کر پوچھا لاٹریوں کی فہرست چھپ گئی۔ کیا خبریں ہیں۔ اوّل، دوم، سوم سہی۔ ہزار دو ہزار کچھ ہاتھ لگا۔ دوستوں میں کوئی سرخرو ہوا۔

لاٹری تو نہیں آئی۔ مگر شرکت کے بارے میں بہت سے خیالات دماغ میں آئے۔)

جلدی سے مالدار بن جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی۔ ان دنوں جب فرنچ لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے عزیز دوست بکرم کے والد، چچا، بھائی، ماں سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا۔ کون جانے کس کی تقدیر زور کرے۔ روپے رہیں گے تو گھر ہی میں کسی کے نام آ جائیں۔

مجھے بھی اپنی تقدیر آزمانے کی سوجھی۔ اس وقت تک زندگی کا مجھے جو تھوڑا بہت تجربہ ہوا تھا وہ بہت ہمت افزا نہ تھا لیکن بھئی تقدیر کا حال کون جانے گا۔ باشد کہ کودک ناداں۔ ایک بار اپنی تقدیر آزمانے کو دل بے تاب ہو گیا، اور بکرم بھی دوسروں کا دست نگر نہ بننا چاہتا تھا۔ جس کے نام روپے آئیں گے وہ خوب موج اُڑائے گا۔ اسے کون پوچھتا ہے، بہت ہو گا دس پانچ ہزار اس کے حصہ میں آ جائیں گے، مگر اس سے کیا ہوگا۔ اس کی زندگی میں بڑے بڑے

منصوبے تھے۔ پہلے تو اسے ساری دنیا کی سیاحت کرنی تھی۔ ایک ایک کونے کی۔ عام سیاحوں کی طرح نہیں کہ تین ہفتہ میں ساری دنیا میں آندھی کی طرح اُڑ کر گھر آ پہنچے۔ وہ ایک ایک خطہ میں کافی عرصہ تک رہ کر وہاں کے باشندوں کی معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ پیرو، برازیل مڈغاسکر اور ابی سینیا، یہ سبھی دشوار گذار خطے اس کے پروگرام میں تھے۔ پھر اسے ایک بہت بڑا کتب خانہ تیار کرانا تھا، جس میں ساری دنیا کی کتابیں رکھی جائیں۔ اس کے لیے دو لاکھ تک خرچ کرنے کے لیے تیار تھا۔ والد یا چچا کے ہاتھ روپے آئے تو شاید دو چار ہزار مل جائیں۔ بڑے بھائی کے نام آئے تو دھیلا بھی نہ ملے گا۔ ہاں اماں کے ہاتھ آئے تو بیس ہزار یقینی ہیں، مگر اس سے کہیں پیاس بجھتی ہے، منصوبے تو اتنے اونچے تھے، لیکن روپے نہ ان کے پاس تھے نہ میرے گھر میں۔ روپے ملنے کی اسے امید نہ تھی۔ ممکن تھا بہت ضد کرتا تو مل بھی جاتے۔ مگر وہ اس امر کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

میرے پاس بھی روپے تھے، میں اسکول میں ماسٹر تھا۔ بیس روپے ملتے تھے۔ دس گھر بھیج دیتا تھا۔ دس میں لشتم پشتم اپنا گذارہ کرتا تھا۔ ایسی حالت میں پانچ روپے کے ٹکٹ خریدنا میرے لیے مشکل ہی نہیں محال تھا۔

بکرم نے کہا: ''کہو تو میں اپنی انگوٹھی بیچ دوں، کہہ دوں گا اُنگلی سے پھسل پڑی۔'' میں نے منع کیا: ''نہیں چوری فوراً کھل جائے گی اور مفت میں شرمندگی ہوگی۔ ایسا کام نہ کرو کہ بعد کو خفت ہو۔'' یہ تجویز ہوئی کہ ہم دونوں اپنی اپنی پُرانی کتابیں کسی سکنڈ ہینڈ کتابوں کے دوکاندار کو بیچ ڈالیں اور اس روپے سے ٹکٹ خریدیں۔ ہم دونوں کے پاس اسکول کی کتابیں ارتھمیٹک، الجبرا، جیومیٹری، جاگرفی کی موجود تھیں۔ میں تو ماسٹر تھا کسی بک سیلر کی دوکان پر جاتے جھینپتا تھا۔ قریب قریب سبھی مجھے پہچانتے تھے۔ اس لیے یہ خدمت بکرم کے سپرد ہوئی اور وہ آدھ گھنٹے میں پانچ روپے کا ایک نوٹ لیے آ پہنچا۔ کتابیں پچیس سے کم نہ تھیں مگر یہ پانچ اس وقت میرے لیے پانچ ہزار کے برابر تھے۔ فیصلہ ہوگیا، ہم دونوں ساجھے میں ایک ٹکٹ لیں گے۔ آدھا میرا ہوگا آدھا بکرم کا۔ دس لاکھ میں پانچ لاکھ میرے حصہ میں آئیں گے پانچ لاکھ بکرم کے۔ ہم اپنے اسی میں خوش میں تھے۔ ہاں بکرم کو اپنی سیاحت والی اسکیم میں کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ کتب خانہ کی تجویز میں کسی قسم کا قطع وبرید ناممکن تھی۔ یہ بکرم کی زندگی کا مقصد دلی تھا۔

میں نے اعتراض کیا: ''یہ لازمی نہیں کہ تمہارا کتب خانہ شہر میں سب سے زیادہ شاندار ہو، ایک لاکھ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔''

بکرم مستقل تھا: ''ہرگز نہیں۔ کتب خانہ تو شہر میں لاثانی ہوگا۔ کیوں تم کچھ مدد نہ کرو

گے؟"

میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا: "بھئی میری ضرورتیں مقابلتاً کہیں زیادہ ہیں۔ تمہارے گھر میں کافی جائداد موجود ہے، والدین بھی زندہ ہیں کسی قسم کا بار تمہارے اوپر نہیں، میرے سر پر تو سارے گرہستی کا بوجھ ہے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہیں، دو بھائیوں کی تعلیم ہے، نیا مکان بنوانا ہی پڑے گا۔ میں تو ایسا انتظام کروں گا کہ سارے مصارف سود سے نکل آئیں اور اصل کو داغ نہ لگنے پائے۔ کچھ ایسی قیدیں لگا دوں گا کہ میرے بعد کوئی اصل کو نہ نکال سکے۔"

"تم نے سوچی تو بہت دور کی ہے لیکن بینکوں کا شرح سود بہت گرا ہوا ہے۔"

"پانچ لاکھ کی رقم بھی تو کچھ کم نہیں، اگر پانچ فیصدی بھی ملے ۲۵ ہزار سالانہ ہوئے، تھوڑے ہیں۔"

ہم نے کئی بینکوں کا شرح سود دیکھا۔ واقعی بہت کم تھا، خیال آیا کیوں نہ لین دین کا کاروبار شروع کر دیا جائے۔ بکرم اور میں دونوں کی مشترکہ کمپنی ہو۔ لین دین میں سود بھی اچھا ملے گا اور اپنا رعب داب بھی رہے گا۔ اچھے اچھے گھٹنے ٹیکیں گے۔ ہاں جب تک اچھی جائداد نہ ہو کسی کو روپیہ نہ دیا جائے چاہے کتنا ہی معتبر آسامی ہو، مجبوری معتبروں کو بھی غیر معتبر بنا دیتی ہے۔ جائداد کی کفالت پر رہن نامہ لکھا کر روپیہ دینے میں کوئی اندیشہ نہیں رہتا، روپے نہ وصول ہوں تو جائداد تو مل جاتی ہے۔

مگر لاٹری کے ٹکٹ پر دو نام نہیں رہ سکتے، کس کا نام دیا جائے؟

بکرم نے کہا: "میرا نام رہے۔"

"کیوں میرا کیوں نہ رہے گا؟"

"تمہارا ہی نام سہی لیکن میری بہت دل شکنی ہوگی۔ اگر روپے مل گئے تو میں گھر والوں پر بم گولا چھوڑ دوں گا۔ اور لوگوں کو خوب چڑاؤں گا، بالکل طفلانہ خواہش ہے۔"

میں مجبور ہو گیا۔ بکرم کے نام سے ٹکٹ لیا گیا۔

ایک ایک کر کے انتظار کے دن کٹنے لگے، صبح ہوتے ہی میری نگاہ کیلنڈر پر جاتی میرا مکان بکرم کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اسکول جانے سے قبل اور اسکول سے آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ بیٹھے اپنے اپنے منصوبے باندھا کرتے اور سرگوشیوں میں کہ کوئی سن نہ لے، ایک دن شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

بکرم نے فلسفیانہ انداز سے کہا: "بھئی میں شادی وادی کا خلجان نہیں پالنا چاہتا۔ خواہ

مخواہ کی کوفت اور پریشانی، بیوی کی ناز برداری ہی میں بہت سے روپے اُڑ جائیں گے۔ ہم بقائے نسل کے کوئی ٹھیکہ دار ہیں؟"

میں نے شادی کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا: "ہاں یہ تو درست ہے مگر جب تک شادی وغم میں کوئی رفیق نہ ہو، دولت کا لطف ہی کیا۔ تنہا خوری سے انسان کی طبیعت خود نفرت کرتی ہے، میں تو بھئی عیال داری سے اتنا بیزار نہیں، ہاں رفیق ایسا چاہتا ہوں جو سچے معنوں میں رفیق ہو، اور وہ بیوی کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔"

بکرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے، بولا: "خیر اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے، آپ کو عیال داری مبارک بندہ تو آزاد رہے گا۔ اپنے مزے سے جہاں چاہا اُڑ گئے۔ اور جب جی چاہا سو گئے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت ایک پاسبان آپ کی ہر ایک حرکت پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہے۔ ذرا سی دیر ہوئی اور فوراً جواب طلب، آپ کہیں چلے اور فوراً سوال کہاں جاتے ہو؟ کیوں کسی کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق ہو؟ میں نہ کسی سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں، اور نہ چاہتا ہوں مجھ سے کوئی یہ سوال کرے۔ نا بابا آپ کو شادی مبارک! بچے کو ذرا سا زکام ہوا اور آپ اڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے پاس ذرا عمر کھسکی اور لونڈے منتیں ماننے لگے کہ کب آپ راہیِ عدم ہوں اور وہ گلچھرے اُڑائیں۔ نہ نہ میں اس وبال میں......"

بکرم کی بہن کانتی نے اتنے دھماکے سے دروازہ کھولا کہ ہم دونوں چونک پڑے، کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی مگر بڑی خوش مزاج اور انتہا درجے کی شوخ۔

بکرم نے ڈانٹا: "تو بڑی شیطان ہے کانتی، میں تو ڈر گیا۔ کس نے بلایا تجھے یہاں۔"

کانتی نے مشتبہ نظروں سے بکرم کو دیکھا۔ جیسے کوئی تحقیق کر رہی ہو، اور بولی:

"تم لوگ ہر دم یہاں بیٹھے کیا باتیں کرتے ہو۔ جب دیکھو یہیں جمے ہو، نہ کوئی کام نہ دھندا۔ کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے۔ ایسے اچھے اچھے تماشے آئے اور چلے گئے، تم گئے ہی نہیں۔ آخر میں کس کے ساتھ جاؤں۔ کوئی جادو منتر جگا رہے ہو۔"

"ہاں! جادو جگا رہے ہیں۔" بکرم ہنس کر بولا "جس سے تجھے ایسا دولہا ملے جو گن گن کر روز پانچ ہنٹر لگائے۔"

کانتی نے پیٹھ کی طرف سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولی: "مجھے اپنا بیاہ نہیں کرنا ہے۔ اماں سے پچاس ہزار روپے لے لوں گی اور مزے سے عیش کروں گی۔ کیوں کسی مرد کو غلامی کروں۔ کھلائے گا تو دو روٹیاں، اور حکومت ایسی جتائے گا گویا اس کی زرخرید لونڈی ہوں۔ بندی باز آئی ایسی شادی سے، میں روز اماں کے ٹکٹ کے لیے ایشور سے پرارتھنا

کرتی ہوں۔ اماں کہتی ہیں کنواری لڑکیوں کی دُعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ میرا تو دل کہتا ہے، للتاں کو ضرور روپے ملیں گے۔"

مجھے اپنی ننھیال کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بار دیہات میں بارش نہ ہوئی تھی۔ بھادوں کا مہینہ آ گیا اور پانی کی ایک بوند نہیں۔ تب گاؤں والوں نے چندہ کرکے گاؤں کی سب کنواری لڑکیوں کی دعوت کی تھی اور دوسرے ہی دن موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی، ضرور کنواریوں کی دُعا میں تاثیر ہوتی ہے۔

میں نے بکرم کو پُر معنی نظروں سے دیکھا، بکرم نے مجھے، نظروں ہی نظروں میں ہم نے فیصلہ کرلیا، ایسا شفیع پاکر کیوں چوکیے۔

بکرم بولا: "اچھا بیٹی! تجھ سے ایک بات کہیں، کسی سے کہے گی تو نہیں۔ اگر کہا تو حلال ہی کر دوں گا۔ اب کے میں تجھے خوب دل لگا کر پڑھاؤں گا، اور پاس کرا دوں گا، ہم دونوں نے لاٹری کا ٹکٹ لیا ہے۔ ہم لوگوں کے لیے بھی ایشور سے دُعا کر، اگر روپے ملے تو تجھے ہیرے جواہرات سے مڑھ دیں گے۔ سچ، مگر خبردار کسی سے کہنا مت!" مگر کانتی کا ہاضمہ اتنا مضبوط نہ تھا۔ یہاں سے تو وعدہ کرگئی مگر اندر جاتے ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔ ایک لمحہ میں سارے گھر میں خبر پھیل گئی۔ اب جسے دیکھیے ہم دونوں کو آنکھیں دکھا رہا ہے، پانچ روپے لے کر پانی میں ڈال دیے۔ گھر میں چار ٹکٹ تو تھے ہی پانچویں کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ماسٹر اسے خراب کر رہا ہے، نہ کسی سے پوچھا، نہ گچھا، لے کے روپے پھینک دیے۔ خود رافضیحت والی کہاوت سامنے آئی۔ گھر کے بزرگ چاہے گھر میں آگ لگا دیں، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بیچارے چھوٹے ان کی مرضی کے خلاف آواز بھی نکالیں تو کہرام مچ جاتا ہے۔

بکرم کے والد "بڑے ٹھاکر" کہلاتے تھے، چچا چھوٹے ٹھاکر تھے، دونوں ہی ملحد تھے، پکے ناستک، دیوتاؤں کے دشمن، پوجا پاٹ کا مذاق اُڑانے والے، گنگا کو پانی کی دھارا اور تیرتھوں کو سیر کے مقامات سمجھنے والے، مگر آج کل دونوں ہی معتقد ہو گئے تھے۔ بڑے ٹھاکر صاحب علیٰ الصبح ننگے پاؤں گنگا اشنان کرنے جاتے اور ادھر سے سارے شہر کے دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہوئے کوئی گیارہ بجے گھر لوٹتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر گھر ہی میں بیٹھے ہوئے روز ایک لاکھ نام لکھ کر تب جل پان کرتے۔ دونوں صاحب شام ہوتے ہی ٹھاکر دوارے میں جا بیٹھتے اور بارہ بجے رات تک بھگوت گیتا کی کتھا سنا کرتے۔ بکرم کے بڑے بھائی صاحب کا نام تھا پرکاش۔ انھیں سادھو سنتوں سے عقیدت ہوگئی تھی انھیں کی خدمت میں دوڑتے رہتے۔ انھیں

یقین ہو گیا تھا کہ جہاں کسی مہاتما نے آشیر باد دیا اور ان کا نام آیا۔ رہیں بکرم کی اماں جی! ان میں کوئی خاص تغیر نہ تھا۔ ہاں آج کل خیرات زیادہ کرتی تھیں اور برت بھی زیادہ رکھتی تھیں، درگا پاٹھ کا بھی انتظام کیا تھا۔ لوگ ناحق کہتے ہیں کہ مادّہ پرستوں میں اعتقاد نہیں ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں ہم میں جو اعتقاد اور پرستش اور دینداری ہے وہ ہماری مادّہ پرستی کے طفیل ہے۔ ہمارا دین اور مذہب ہماری دنیاداری کے بل پر لٹکا ہوا ہے۔ ہوس انسان کی رائے اور دماغ میں اتنی روحانیت پیدا کر سکتی ہے یہ میرے لیے پہلا تجربہ تھا اور محض روحانیت کا ملمع نہ تھا۔ وہی خلوص، وہی نشہ، وہی انہماک گویا طبیعت ہی بدل گئی ہو۔ رہے ہم دونوں ساجھے دار، ہمارے پاس روپے نہ تھے، نہ اتنا وقت تھا۔ مجھے نوکری بجانی تھی، بکرم کو کالج جانا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ مل کر رہ جاتے۔ ہاں جوتشیوں کی تلاش میں رہتے تھے مگر ان کے لیے بھی ہمارے پاس نیازمندی اور خدمت گذاری کے سوا اور کیا تھا۔

جوں جوں "قتل کی رات" قریب آتی جاتی تھی ہمارا سکونِ خاطر غائب ہوتا جاتا تھا، ہمیشہ اسی طرف دھیان لگا رہتا۔ میرے دل میں خواہ مخواہ یہ شبہ ہونے لگا کہ اگر بکرم نے مجھے حصہ دینے سے انکار کر دیا تو کیا کروں گا۔ صاف انکار کر جائے کہ تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا، نہ کوئی تحریر ہے نہ کوئی دوسرا ثبوت، سارا دارومدار بکرم کی نیت پر ہے۔ اُس کی نیت میں ذرا بھی خلل آیا اور میرا کام تمام۔ کہیں فریاد نہیں کر سکتا، زبان تک نہیں کھول سکتا۔ اب اگر تحریر کے لیے کہوں تو بدمزگی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں۔ اگر اس کی نیت بگڑ گئی ہے تب تو وہ ابھی سے انکار کر دے گا اور اگر درست ہے تو اس شبہ سے اسے روحانی صدمہ ہوگا۔ آدمی تو ایسا نہیں ہے، لیکن بھئی دولت پا کر ایمان سلامت رکھنا مشکل ہے، ابھی تو روپے نہیں ملے ہیں۔ اس وقت ایماندار بننے میں کچھ حرج نہیں ہوتا۔ آزمائش کا وقت تو جب آئے گا جب روپے مل جائیں گے۔ میں نے اپنے باطن کا جائزہ لیا۔ اگر ٹکٹ میرے نام کا ہوتا اور حسنِ اتفاق سے میرا نام آ جاتا تو کیا میں نصف رقم بے چون و چرا بکرم کے حوالے کر دیتا؟ کہتا، تم نے مجھے ڈھائی روپے قرض دیے تھے ان کے بدلے پانچ لے لو، دس لے لو، سو لے لو، اور کیا کرو گے؟ مگر نہیں شاید اتنی بددیانتی کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی۔ اگر دیتا بھی تو خوش معاملگی سے نہیں بلکہ بدنامی اور تشہیر کے خوف سے۔ ایک دن ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ یکایک بکرم نے کہا: "ہمارا ٹکٹ اگر نکل آئے تو مجھے دل میں یہ افسوس ضرور ہوگا کہ ناحق تم سے ساجھا کیا۔"

میں نے چونک کر کہا: "اچھا! مگر اسی طرح کیا مجھے افسوس نہیں ہو سکتا؟"

"لیکن ٹکٹ تو میرے نام کا ہے۔"

''اس سے کیا ہوتا ہے۔''

''اچھا مان لو، میں کہہ دوں تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا۔''

میرے خون کی حرکت بند ہوگئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

''میں تمھیں اتنا بدنیت نہیں سمجھتا۔''

''مگر ہے بہت ممکن، پانچ لاکھ، سوچو۔''

''تو آؤ لکھا پڑھی کرلیں، جھگڑا کیوں کر رہے ہو۔''

بکرم نے ہنس کر کہا: ''تم بڑے شکی ہو یار! میں تمھارا امتحان لے رہا تھا۔ بھلا ایسا کہیں ہوسکتا ہے۔ پانچ لاکھ نہیں پانچ کروڑ کا معاملہ ہو تب بھی ایشور چاہے گا تو نیت میں فتور نہ آنے دوں گا۔''

مگر مجھے، ان اعتماد انگیز باتوں سے تسکین نہ ہوئی۔ دل میں ایک تشویش آگ کی چنگاری کی طرح سلگنے لگی: کہیں سچ مچ انکار کر جائے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔

میں نے کہا: ''یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمھاری نیت میں فتور نہیں آسکتا لیکن تحریر سے پابند ہو جانے میں کیا حرج ہے۔''

''فضول ہے۔''

''فضول ہی سہی۔''

''تو پکّے کاغذ پر لکھنا پڑے گا دس لاکھ کی کورٹ فیس ہی دس ہزار ہو جائے گا۔ کس خیال میں ہو آپ۔''

میں نے تامّل کر کے کہا: ''مجھے سادے کاغذ ہی سے اطمینان ہو جائے گا۔''

''جس معاہدے کی کوئی قانونی اہمیت نہ ہو، اسے لکھ کر کیوں وقت ضائع کریں؟''

''قانونی اہمیت نہ ہو، اخلاقی اہمیت تو ہے۔''

''اچھا لکھ دوں گا، جلدی کیا ہے۔''

مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا، بگڑ کر بولا: ''تمھاری نیت تو ابھی سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔''

''تو کیا تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایسی حالت میں تمھاری نیت فاسد ہو جاتی۔''

''میری نیت اتنی کمزور نہیں۔''

''اجی رہنے بھی دو، بڑے نیت والے دیکھے ہیں۔''

''مجھے اب تمھارے اوپر اعتبار نہیں رہا۔ میں تم سے معاہدہ لکھوا کر چھوڑوں گا، چاہے

دوستی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

بڑے نشست خانے میں، جہاں دونوں ٹھاکر بیٹھا کرتے تھے، اسی طرح کا مناظرہ چھڑا ہوا تھا۔ جھڑپ کی آواز سن کر ہمارا دھیان ادھر لگا۔ دیکھا تو دونوں بھائیوں میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے، بیچ بیچ دونوں اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر پینترے بدل رہے تھے۔

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ "مشترکہ خاندان میں کسی کے نام سے روپے آئیں ان پر سب کا مساوی حق ہے۔"

بڑے ٹھاکر نے بگڑ کر جواب دیا۔ "ہرگز نہیں، جا کر قانون دیکھو، اگر میں کوئی جرم کروں تو مجھے سزا ہوگی۔ مشترکہ خاندان کو نہیں، یہ انفرادی معاملہ ہے۔"

"اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔"

"شوق سے عدالت جائیے، اگر میرے لڑکے کی بیوی یا خود میرے نام لاٹری نکلی تو آپ کو اس سے اسی طرح کوئی تعلق نہ ہوگا جیسے آپ کے نام لاٹری نکلے تو مجھ سے یا میرے لڑکے سے یا میری بیوی سے۔"

"اگر میں جانتا، آپ یہ پہلو اختیار کریں گے تو اپنی بیوی بچوں کے نام سے ٹکٹ لے لیتا۔"

"تو یہ آپ کا قصور ہے۔"

"اسی لیے کہ مجھے خیال تھا کہ آپ میرے حقیقی بھائی ہیں اور ایک جا معاملہ ہے۔"

"یہ جوا ہے، یہ آپ کو سمجھ لینا چاہیے۔"

بکرم کی ماں نے دونوں بھائیوں کو شمشیر بکف دیکھا تو دوڑی ہوئی باہر آئیں اور دونوں کو سمجھانے لگیں۔

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔ "آپ مجھے کیا سمجھاتی ہیں۔ انھیں سمجھائیے جو بھائی کی گردن پر چھری پھیر رہے ہیں۔ آپ کے پاس چار ٹکٹ ہیں، میرے پاس صرف ایک، میرے مقابلے آپ لوگوں کو روپے ملنے کا چوگنا چانس ہے۔"

بڑے ٹھاکر سے نہ رہا گیا، بولے: "ہم نے بیس روپے نہیں دیے ٹھناٹھن۔"

امّاں نے انھیں ملامت کے انداز میں دیکھا، اور چھوٹے ٹھاکر صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ بولیں: "تم میرے روپے سے آدھے لے لینا۔ میں اپنے بیٹے......"

بڑے ٹھاکر نے زبان پکڑ لی۔ "کیوں واہیات قسم کھا رہی ہو۔ وہ کیوں آدھا لے لیں گے۔ میں ایک دھیلہ نہ چھونے دوں گا۔ اگر ہم انسانیت سے کام لیں تو بھی انھیں پانچویں حصے سے زائد کسی طرح نہ ملے گا۔ آدھے کا دعویٰ کس بنا پر ہو سکتا ہے۔"

چھوٹے ٹھاکر نے خونی نظروں سے دیکھا: "ساری دنیا کا قانون آپ ہی جانتے ہیں۔"

"جانتے ہیں، بیس سال تک وکالت نہیں کی ہے؟"

"یہ وکالت نکل جائے گی، جب سامنے کلکتہ کا بیرسٹر کھڑا کردوں گا۔"

"بیرسٹر کی ایسی تیسی۔"

"اچھا زبان سنبھالیے، میں نصف لوں گا۔ اسی طرح جیسے گھر کی جائیداد میں میرا نصف ہے۔"

بڑے ٹھاکر صاحب کوئی توپ چھوڑنے والے ہی تھے کہ مسٹر پرکاش سر اور ہاتھ میں پٹی باندھے خوش خوش لنگڑاتے ہوئے آ کر کھڑے ہو گئے۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر پوچھا: "یہ تمھیں کیا ہو گیا۔ ارے، یہ چوٹ کیسی، کسی سے جھگڑا ہو گیا یا گر پڑے۔ ارے مہنگو! جاؤ ذرا ڈاکٹر صاحب کو بلا لا۔"

امّاں جی نے پرکاش کو ایک آرام کرسی پر لٹا دیا۔ اور فرطِ اشک سے کچھ پوچھ نہ سکتی تھیں۔

پرکاش نے کراہ کر حسرتناک لہجے میں کہا۔ "کچھ نہیں، ایسی کچھ چوٹ نہیں لگی۔"

بڑے ٹھاکر صاحب نے، جو غم و غصّے سے کانپ رہے تھے، کہا: "کیسے کہتے ہو چوٹ نہیں لگی سارا ہاتھ اور سر سوج گیا ہے۔ کہتے ہو چوٹ نہیں لگی، کس سے جھگڑا ہوا، کیا معاملہ ہے بتلاتے کیوں نہیں۔ میں جا کر تھانے میں رپٹ کرتا ہوں۔"

"آپ ناحق گھبراتے ہیں معمولی چوٹ ہے۔ دو چار روز میں اچھی ہو جائے گی۔"

اس کے چہرے پر اب بھی ایک مسرّت آمیز امید جھلک رہی تھی۔ ندامت، غصّہ یا انتقام کی خواہش کا نام تک نہ تھا۔

امّاں نے آواز کو سنبھال کر پوچھا۔ "بھگوان کریں، جلد اچھے ہو جاؤ۔ لیکن چوٹ لگی کیسے، کیا کسی تانگے سے گر پڑے؟"

پرکاش نے درد سے ناک سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں، نہ کسی تانگے سے گرا نہ کسی سے جھگڑا ہوا، ذرا جھگڑو بابا کے پاس چلا گیا تھا، یہ اُنھی کی دُعا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں۔ وہ آدمیوں کی صورت سے بھاگتے ہیں، اور پتھر لے کر مارنے دوڑتے ہیں جو ڈر کر بھاگا وہ نامراد رہ جاتا ہے۔ جو پتھر کی چوٹیں کھا کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا، اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجیے کہ چوٹ کھائی اور پاس ہوئے۔ آج میں وہاں پہنچا تو ایک میلہ لگا ہوا

تھا۔ کوئی مٹھائیاں لیے، کوئی پھولوں کی مالا کوئی شال دوشالے لیے جھگڑو بابا استغراق کی حالت میں بیٹھے تھے۔ یکایک انھوں نے آنکھیں کھولیں اور یہ مجمع دیکھا تو گالیاں بکتے ہوئے کئی پتھر اُٹھا کر دوڑے، مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی، لوگ گرتے پڑتے بھاگے۔ لیکن بندہ وہاں قطب مینار کی طرح ڈٹا رہا۔ بس انھوں نے پتھر چلا ہی تو دیا، پہلا پتھر سر میں لگا، کھوپڑی بھنا گئی۔ معلوم ہوا، جیسے گولا لگ گیا ہو۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا پتھر ہاتھ میں لگا۔ بس وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بابا گالیاں بکتے ہوئے لوٹ گئے۔ ادھر گھنٹہ بھر تک مجھ سے اُٹھا ہی نہ گیا، آخر ہمت باندھ کر اُٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ انھوں نے کہا: 'فریکچر ہو گیا ہے، پٹی باندھ دی، بڑی شدت کا درد ہے مگر مراد پوری ہو گئی۔ اب لاٹری میرے نام آئی رکھی ہے، مطلق شبہ نہیں۔ سب سے پہلے جھگڑ بابا کی کٹی بناؤں گا۔ ان کی مار کھا کر آج تک کوئی نامراد نہیں لوٹا۔''

بڑے ٹھاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ للاں جی کا اندیشہ بھی دور ہو گیا، سر پھٹا تو کیا ہوا، ہاتھ بھی ٹوٹا، کیا غم ہے، لاٹری تو اپنی ہو گئی۔''

شام ہو گئی تھی، بڑے ٹھاکر صاحب مندر کی طرف چلے گئے، بھگوت سننے کا وقت آ گیا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے بولے۔

''جھگڑ بابا تو وہیں رہتے ہیں، ندی کے کنارے بغیچے میں۔''

پرکاش نے بے اعتنائی سے کہا: ''جی ہاں۔''

''کیا بہت زور سے مارتے ہیں؟''

پرکاش نے ان کا عندیہ سمجھ لیا۔

''آپ زور سے کہتے ہیں، ارے صاحب ایسا پتھر مارتے ہیں کہ بم گولے سا لگتا ہے دیو سا قد ہے اور شہ زور اتنے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ شیروں کو گھونسے میں مار ڈالتے ہیں۔ اُف سر پھٹا جاتا ہے۔ ان کا نشانہ ایسا بے خطا ہوتا ہے کہ آدمی بچ نہیں سکتا۔ ایک دو پتھر سے زیادہ کھانے کی کسی میں تاب ہی نہیں اور یہ نہیں کہ ایک دو پتھر مار کر رہ جائیں۔ جب تک آپ دوڑتے جائیں گے، مارتے جائیں گے، جب تک گر نہ پڑیں۔ مگر راز یہی ہے کہ آپ جتنے زیادہ پتھر کھائیں گے اتنا ہی اپنے مقصد سے قریب پہنچیں گے۔ ایک چوٹ کھا کر جان بچانے کے لیے کوئی بہانہ کر کے گر پڑے تو اس کا پھل بھی اتنا ہی ملتا ہے۔ آدھا یا اس سے بھی کم میں نے تو ٹھان لیا تھا کہ چاہے مر ہی جاؤں لیکن جب تک نہ گر پڑوں پیچھا نہ چھوڑوں گا۔''

پرکاش نے ایسا ہیبت ناک مرقع کھینچا کہ چھوٹے ٹھاکر صاحب کانپ گئے۔ جھگڑو بابا کی خدمت میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔

آخر جولائی کی بیسویں تاریخ آئی۔ سویرے ہی سے ڈاک خانے کے سامنے کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ تار کا انتظار ہونے لگا۔ دونوں ٹھاکروں نے گھڑی رات رہے گنگا اشنان کیا اور مندر میں بیٹھ کر پوجا کرنے لگے۔ ہم دونوں ساجھے داروں نے اپنا اپنا کام تقسیم کر لیا۔ بکرم تو ڈاکخانہ گیا، میں مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جا بیٹھا۔ دونوں ٹھاکر بھی بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ بالکل بچوں کی سی کیفیت تھی جو ذرا سی بات میں ہنس دیتے ہیں اور ذرا سی بات میں رو دیتے ہیں۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا: ''بھگوان تو اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں، کیوں پجاری جی؟'' پجاری جی نے فرمایا: ''ہاں سرکار! گج (روایت ہے کہ ایک بار ہاتھی (گج) ندی میں پانی پینے گیا۔ ندی میں ایک مگرمچھ تھا اس نے ہاتھی کی ٹانگ پکڑ لی۔ ہاتھی نے تب بھگوان کی یاد کی اور بھگوان اپنی جائے قیام سے ہاتھی کی مدد کو آئے) کو گراہ کے منہ سے بچانے کے لیے بھگوان چھیر ساگر سے دوڑے تھے۔''

چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا: ''بھگوان تو انتر جامی (عالم الغیب) ہیں کس میں کتنی بھگتی ہے، یہ کیا ان سے چھپا رہتا ہوگا۔''

پجاری نے فرمایا: ''نہیں سرکار ان سے کیا چھپا ہے۔''

ادھر پوجا ہو رہی تھی۔ ادھر مندر کے باہر مساکین کو غلہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔

بڑے ٹھاکر نے پھر پوچھا: ''تمھارا دل کیا کہتا ہے پجاری جی۔''

پجاری نے فرمایا: ''آپ کی بجے (فتح) ہوگی سرکار۔''

چھوٹے سرکار نے پوچھا: ''اور میری۔''

پجاری نے بے تکلف کہا: ''آپ کی بھی بجے ہوگی۔''

دونوں آدمیوں کی فتح کیسے ہوگی، اس پر غور کرنے کی وہاں کسے فرصت تھی۔

کتھا ختم ہوگئی تو بڑے ٹھاکر صاحب نشۂ عقیدت سے سرشار مندر سے نکلے بھجن گاتے ہوئے:

پربھو میں تو تیری چرنوں میں آیا

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھبھوت لپیٹے حمد و ثنا میں مصروف تھے۔

پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پہ لاجوردی کیا آسماں بنایا

زندگی میں جب ترا ہم کو ہمیشہ تھا خیال
بعد مردن بھی ہوس دل میں وہی لے جائیں گے

پرکاش بابو پٹیاں باندھے غریبوں کو غلّہ بانٹ رہے تھے، اور بار بار فون پر جا کر پوچھتے تھے، کیا خبر ہے۔

ہر شہر کے چہرے پر اُمید وبیم کا رنگ تھا۔ اُمید رگوں میں، آنکھوں میں، ہونٹوں میں اُمڈی پڑتی تھی، اور بیم دل میں، دماغ میں، جگر میں رعشہ پیدا کر رہا تھا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجی، سب کے سب دوڑے، ریسیور پرکاش بابو کے ہاتھ لگا

''کون ہے؟''

''میں ہوں بکرم۔''

''کیا خوشخبری ہے۔''

''اس شہر کا صفایا ہے۔ شہر ہی کافی نہیں، سارے ہندستان کا۔ امریکہ کے ایک آدمی کا نام آیا ہے۔''

پرکاش بابو زمین پر گر پڑے۔ بڑے ٹھاکر صاحب پر جیسے فالج گر گیا ہو۔ بے حس و حرکت نقشِ دیوار کی طرح کھڑے رہ گئے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب سر پیٹ کر رونے لگے۔

رہا میں، مجھے مایوسی کے ساتھ ایک حاسدانہ مسّرت ہو رہی تھی کہ مجھے بکرم کی خوشامد کرنے کی ذلّت نہیں اُٹھانی پڑی۔ لتاں جان باہر نکل آئیں۔ اور کہہ رہی تھیں: ''سبھوں نے بے ایمانی کی، کون وہاں دیکھنے گیا تھا۔''

اس روز رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے پجاری جی پر غصّہ اُتارا۔ اور اُنھیں برخاست کر دیا: ''اسی لیے تمھیں اتنے دنوں سے پال رکھا ہے، حرام کا مال کھاتے ہو اور چین کرتے ہو۔''

اتنے میں بکرم روحانی صورت لیے آ کر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا: ''اب تو معاملہ ختم ہو گیا۔ مگر سچ کہنا، تمھاری نیت فاسد تھی یا نہیں؟''

بکرم بے غیرتی کے ساتھ مسکرایا: ''اب کیا کرو گے پوچھ کر، پردہ ڈھکا رہنے دو۔''

○

[ایک اور لاٹری کی ٹکٹ لی، مگر لاٹری نے پھر دھوکہ دیا، اس کا افسوس رہا۔ ٹھاکر جی کی بھگتی کس امید پر کی جائے۔ پریم پچیسی پریس میں چلی گئی۔

بہت اچھا ہوا۔]

گورکھ پور میں میرا تعارف مہابیر پرشاد جی پوتدار سے ہوا جو ہندی لٹریچر کے فاضل مادر وطن کے سچے خادم اور بڑے جفاکش و محنتی شخص ہیں۔ میں نے بستی میں ہی ہندی کے رسالہ ''سرسوتی'' میں کئی کہانیاں چھپوائیں۔ پوتدار جی کی صلاح سے میں نے ''سیواسدن'' نامی ناول لکھا۔ گورکھپور ہی میں میں نے پرائیویٹ طور پر بی۔اے بھی پاس کیا۔ ''سیواسدن'' کی جو قدر و منزلت ہوئی اُس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے دوسرا ناول ''پریم آشرم'' لکھا۔ اس اثنا میں کہانیاں بھی برابر لکھتا رہا۔

پوتدار جی کے مشورے سے میں نے پانی کا علاج شروع کیا لیکن تین چار مہینے کے غسل اور پرہیز کا اُلٹا اثر یہ ہوا کہ میرا پیٹ بڑھ گیا اور مجھے پیدل چلنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ ایک مرتبہ کئی دوستوں کے ساتھ مجھے ایک زینہ پر چڑھنا پڑا، اور لوگ تو دھڑا دھڑ چڑھ گئے مگر میرے پاؤں اُٹھتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکل سے ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہنچا۔ اُسی دن مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا، سمجھ گیا کہ اب تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں، پانی کا علاج بند کر دیا۔

ایک دن شام کے وقت اُردو بازار میں شری بجت دشرتھ پرشاد جی دویدی ایڈیٹر ''سودیش'' سے ملاقات ہوگئی، کبھی کبھی اُن سے بھی لٹریچر کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ انھوں نے میری زرد صورت دیکھ کر کہا: ''بابو جی آپ تو بالکل ہی پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کا علاج کیجیے۔''

مجھے اپنی بیماری کا ذکر بہت بُرا لگتا تھا۔ میں اپنی بیماری کو بھول جانا چاہتا تھا۔ جب دو ہی چار مہینے کی زندگی ہے تو پھر کیوں نہ ہنستے ہوئے مروں، میں نے چڑ کر کہا: ''مرہی تو جاؤں گا بھائی یا اور کچھ؟ میں موت کے خیر مقدم کو تیار ہوں۔'' بیچارے دویدی جی نے ندامت سے سر نیچے کرلیا، بعد کو مجھے بھی اپنی اس تلخ گفتاری پر بڑا افسوس ہوا۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم اشتراکِ عمل زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا، انھیں دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا، غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا، دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی، ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آ گئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

جناب من! میرا عقیدہ ہے کہ نظامِ سلطنت مشیتِ ایزدی کی ظاہری صورت ہے۔ اور اس کے قوانین بھی رحم حق اور انصاف پر قائم ہیں۔ میں نے بیس سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانتداری سے انجام دیا۔ ممکن ہے حکام بعض موقعوں پر مجھ سے خوش نہ رہے ہوں۔ اس لیے کہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہ سمجھا۔ جب کبھی میرے احساس قانون اور حکم حاکم میں تناقض ہوا میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمتِ ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا۔ لیکن مراسلہ نمبر...... مورخہ...... میں جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں۔ اور میرے خیال میں ان میں ناحق پروری کا اتنا دخل ہے کہ میں اپنے تئیں ان کی تعمیل کے لیے کسی حالت میں آمادہ نہیں کر سکتا۔ وہ احکام رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری کے قاتل ہیں۔

ان حالات پر نظر کر کے میرا اس نظامِ حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنی ہے۔

دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا حق بھی حاصل ہے اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے درپے ہے۔ لہٰذا میں ہندستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا مزید تاخیر اس عہدہ سے سبکدوش کیا جائے۔

احباب نے استعفیٰ کی خبر سنی تو سمجھانے لگے۔ مگر وہ اپنے ارادے پر ثابت قدم رہے۔ استعفی داخل کردیا۔ اب بھی لوگوں کو اُمید تھی کہ شاید حکام اسے جلد نہ منظور کریں لیکن دوسرے ہی دن تار کے ذریعے سے منظوری آگئی۔ علی الصبح خوش خوش دفتر گئے اور ہنس ہنس کر چارج دیا۔ مگر شام ہوتے ہوتے ان کی زندہ دلی غائب ہوگئی اور گونا گوں تفکرات نے آگھیرا۔ بزاز کے کئی سو روپے باقی تھے، ملازموں کی تنخواہیں باقی پڑی ہوئی تھیں۔ مکان کا کرایہ چھ مہینے سے نہ دیا تھا۔ حلوائی اور گوالے کا حساب بھی چکانا تھا۔ ان حساب داروں کا مجمع دیکھ کر ان کا دل بیٹھ گیا۔ وہ ماہوار ادائیگی کے ایسے عادی ہوگئے تھے۔ ایک معین تاریخ پر ایک معین رقم کا ہاتھ آجانا ان کے لیے ایسا فطری عمل ہوگیا تھا کہ آج دوران ماہ میں یہ حساب کتاب کرنا انھیں بلائے جان معلوم ہورہا تھا اور وہ بھی تہی دستی کی حالت میں۔ مجبوراً سیونگ بینک سے روپے منگوانے اور حساب بیباق کردیا۔ یوں معمولاً وہ کچھ اور باقی ملاکر اپنے سبیتھے کے مطابق روپے دیا کرتے تھے۔ لیکن آج حال اور باقی کی رقمیں مل کر اس طرح بڑھیں جیسے صاف فرش اُٹھا دینے سے نیچے خاک کا ایک انبار نظر آنے لگتا ہے۔ انھیں اب تک گمان بھی نہ ہوا تھا کہ میں اس حد تک مقروض ہوگیا ہوں۔ پاس بک میں ایک

تشویش ناک تخفیف ہو گئی۔

بیوی نے ہمدردانہ انداز سے کہا: "ناحق دل اتنا چھوٹا کرتے ہو۔ رنجیدہ ہونے کی کون سی بات ہے یہ تو اور خوشی کی بات ہے کہ جس کام کے کرنے میں ادھرم ہوتا تھا اس سے نجات مل گئی۔ اب کسی کا گلا کاٹنے کے لیے کوئی تمھیں مجبور تو نہ کرے گا۔ روزی کا ایک یہی وسیلہ نہیں ہے بھگوان نے منہ چیرا ہے تو اہار بھی دیں گے۔ آخر اپنے بھائی بندوں پر ظلم کرتے تو اس کا دوش پاپ ہمارے ہی بال بچوں پر پڑتا۔ بھگوان کو کچھ اچھا ہی کرنا تھا۔ تبھی اس نے تمھارے من میں یہ بات ڈالی ہے۔"

شوہر کی روحانی کشمکش کا خاتمہ کرنے کے ارادے نے اس کی قناعت اور توکل کو بیدار کر دیا تھا۔

○

۲۰/فروری ۱۹۲۱ء کو سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوا غلامی سے نجات پاتے ہی میں نو سال کے پرانے مرض سے چھٹکارا پا گیا۔ ایک ہی ہفتہ بعد میری پیچش کم ہو گئی یہاں تک کہ ایک مہینے کے اندر بالکل صحت ہو گئی۔ اس تجربہ نے مجھے پورے طور پر قسمت پرست بنا دیا۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ جو مالک کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کی کوئی کوشش اس کی مرضی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی۔

اب دیہات میں کچھ کام کرنے کی طبیعت ہوئی۔ پوتدار جی کا دیہات ہی میں ایک مکان تھا۔ ہم اور وہ دونوں وہاں چلے گئے اور چرخے چلانے لگے۔ دیہات میں خوب آرام سے دن کٹتے تھے۔ ہم آزادی کا لطف اٹھا رہے تھے۔

میرے دل و دماغ میں ترک موالات کے مسائل گونجا کرتے میرے قصوں میں بھی وہی خیالات جھلکتے ہیں۔

نزدیک کے ایک گانو میں جوکھو بھگت اور بے جن چودھری میں تین پشتوں سے عداوت چلی آتی تھی۔ کچھ ڈانڈ مینڈ کا جھگڑا تھا۔ ان کے پرداداوں میں کئی بار خون خچر ہوئے۔ باپوں کے وقت سے مقدمہ بازی شروع ہوئی۔ دونوں کئی بار ہائی کورٹ تک گئے۔ لڑکوں کے وقت میں جنگ میں اور تیزی آئی، یہاں تک کہ دونوں ہی کمزور ہو گئے۔ پہلے دونوں اسی گانو میں آدھے آدھے کے حصے دار تھے، اب اُن کے پاس اس جھگڑے والے کھیت کو چھوڑ ایک انگل زمین بھی نہیں تھی۔ زمین گئی دولت گئی، عزت گئی مگر وہ جھگڑا ویسا کا ویسا ہی بنا رہا۔ ہائی کورٹ کے بڑے بڑے مصلحت اندیش ایک معمولی سا جھگڑا طے نہیں کر سکے۔

ان دونوں شرفا نے گاؤں کو دو مخالف دھڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک دھڑے کی بھنگ بوٹی چودھری کے دروازے پر چھنتی تو دوسرے دھڑے کے چرس گانجے کے دم بھگت کے دروازے پر لگتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کے بھی دو گروپ ہو گئے تھے۔

یہاں تک کہ دونوں "شریف لوگوں" کے مذہبی اور سماجی خیالات میں بھی تفریق کی لائن کھنچی ہوئی تھی۔ چودھری کے کپڑے پہنے ہوئے ستو کھا لیتے تھے اور بھگت کو ڈھونگی کہتے۔ بھگت کپڑے اُتارے بغیر پانی بھی نہ پیتے اور چودھری کو گمراہ بتاتے۔ بھگت سناتن دھرمی بنے تو چودھری آریہ سماج کے زیر سایہ آ گئے۔ جس بجاج، پنساری یا کنجڑے سے چودھری سودا لیتے، اس کی طرف بھگت دیکھنا بھی گناہ سمجھتے اور بھگت جی کے حلوائی کی مٹھائیاں، ان کے گوالے کا دودھ اور تیلی کا تیل چودھری کے لیے حرام تھے۔ یہاں تک کہ ان کے صحت کے اصولوں میں بھی فرق تھا۔ بھگت جی وید کے قائل تھے، چودھری یونانی حکیم کے ماننے والے دونوں چاہے بیماری سے مر جاتے مگر اپنے اصولوں کو توڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جب ملک میں سیاسی تحریکیں شروع ہوئیں تو اس کی بھنک اس گاؤں میں بھی پہنچی۔ چودھری نے تحریک کی حمایت کی، بھگت اس کے مخالف ہو گئے۔ ایک صاحب نے آ کر گاؤں میں کسان سبھا کھولی۔ چودھری اس میں شریک ہوئے، بھگت الگ رہے۔ بیداری بڑھی اور سوراجیہ کا تذکرہ ہونے لگا۔ چودھری سوراجیہ وادی ہو گئے، بھگت نے حکومت کی طرف داری کی چودھری کا گھر سوراجیہ وادیوں کا اڈّہ ہو گیا۔ بھگت کا گھر حکومت نوازوں کا کلب بن گیا۔

چودھری جنتا میں سوراجیہ کا پرچار کرنے لگے:

"دوستو، سوراجیہ کا مطلب ہے اپنا راج۔ اپنے ملک میں اپنی حکومت ہو تو اچھا ہے کہ کسی دوسرے کی حکومت ہو وہ؟"

عوام نے کہا: "اپنی حکومت ہو تو اچھا ہے۔"

چودھری: "تو وہ سوراجیہ کیسے ملے گا۔ خود اعتمادی سے، میل سے، ایک دوسرے سے نفرت کرنا چھوڑ دو۔ اپنے جھگڑے آپ مل کر نپٹا لو۔"

ایک شخص: "آپ تو روزانہ عدالت میں کھڑے رہتے ہیں۔"

چودھری: "ہاں۔ مگر آج سے عدالت جاؤں تو مجھے گئو ہتیا کا پاپ لگے۔ تمھیں چاہیے کہ تم اپنی گاڑھی کمائی اپنے بال بچوں کو کھلاؤ اور بچے تو دوسروں کی بھلائی میں لگاؤ۔ وکیل مختاروں کی جیب کیوں بھرتے ہو، تھانیدار کو رشوت کیوں دیتے ہو، عمّال کی خوشامد کیوں کرتے ہو؟

پہلے ہمارے لڑکے اپنے دھرم کی تعلیم پاتے تھے، وہ باکردار، باایثار اور نیک بنتے تھے۔ اب وہ بدیشی مدرسوں میں پڑھ کر چاکری کرتے ہیں، رشوت کھاتے ہیں۔ شوق کرتے ہیں۔ وہ اپنے دیوی دیوتاؤں اور بزرگوں کی برائی کرتے ہیں۔ سگریٹ پیتے ہیں، بال بناتے ہیں اور حاکموں کے پیر دباتے ہیں۔ کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے دھرم کے مطابق تعلیم دیں۔"

جنتا: ''چندہ کرکے مدرسہ کھولنا چاہیے۔''

چودھری: ''ہم پہلے شراب کو چھوٹا پاپ سمجھتے تھے اب گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں شراب کی دوکانیں ہیں۔ ہم اپنی گاڑھی کمائی کے کروڑوں روپے گانجا اور شراب میں اُڑا دیتے ہیں۔''

جنتا: ''جو دارو، شراب پیے اُس پر جُرمانہ ہونا چاہیے۔''

چودھری: ''ہمارے دادا نانا چھوٹے بڑے گاڑھا گزی پہنتے تھے، ہماری دادیاں نانیاں چرخا کاتا کرتی تھیں۔ سب دھن دیش میں رہتا تھا۔ ہمارے جولاہے بھائی چین کی بانسری بجاتے تھے۔ اب ہم دودیش کے بنے ہوئے رنگین کپڑوں پر جان دیتے ہیں، اس طرح دوسرے دیش والے ہماری دولت ڈھولے جاتے ہیں۔ بیچارے جولاہے کنگال ہو گئے۔ کیا ہمارا یہی دھرم ہے کہ اپنے بھائیوں کی تھالی چھین کر دوسروں کے سامنے رکھ دیں۔''

جنتا: ''گاڑھا کہیں ملتا ہی نہیں۔''

چودھری: ''اپنے گھر کا بنا ہوا گاڑھا پہنو، عدالتوں کو تیاگ دو، نشہ بازی چھوڑو، اپنے لڑکوں کو دھرم کرم سکھاؤ، میل سے رہو، بس یہی سوراجیہ ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ سوراجیہ کے لیے خون کی ندی بہے گی وہ پاگل ہیں ان کی باتوں پر دھیان مت دو۔''

جنتا یہ باتیں بڑے چاؤ سے سنتی تھی اور دنوں دن سننے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی چودھری سب کے لیے قابلِ احترام بن گئے۔

بھگت جی بھی راج بھگتی کا اُپدیش دینے لگے:

''بھائیو، راجا کا کام راج کرنا اور رعایا کا کام اس کے حکم کو ماننا ہے۔ اسی کو راج بھگتی کہتے ہیں۔ ہماری مذہبی کتابوں میں ہمیں اسی راج بھگتی کی تعلیم دی گئی ہے۔ راجا خدا کا نمائندہ ہے، اس کے حکم کے خلاف چلنا بہت بڑا پاپ ہے۔ بادشاہ کا مخالف جہنم کا حقدار ہے۔''

ایک شخص: ''بادشاہ کو بھی تو اپنے دھرم پر چلنا چاہیے۔''

دوسرا شخص: ''ہمارے راجا تو نام کے ہیں۔ اصلی راجا تو ولایت کے بنیے مہاجن ہیں۔''

تیسرا شخص: ''بنیے دولت کمانا جانتے ہیں حکومت کرنا کیا جانیں۔''

بھگت: ''لوگ تمھیں تعلیم دیتے ہیں کہ عدالتوں میں مت جاؤ پنچایت میں مقدمے لے جاؤ لیکن ایسے پنچ کہاں ہیں جو پورا انصاف کریں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں۔ یہاں منہ دیکھی باتیں ہوں گی۔ جن کا دباؤ ہے ان کی جیت ہوگی جن کا کچھ دباؤ نہیں ہے وہ بیچارے مارے جائیں گے۔ عدالتوں میں سب کارروائی قانون پر ہوتی ہے۔ وہاں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ شیر بکری سب ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔''

ایک اور شخص: ''عدالتوں کا انصاف کہنے کو ہی ہے جس کے پاس بنے ہوئے گواہ اور داؤ پیچ کھیلے ہوئے وکیل ہوتے ہیں اسی کی جیت ہوتی ہے وہی جھوٹے سچے کی پرکھ کرتا ہے۔ ہاں پریشانی البتہ ہے۔''

بھگت: ''کہا جاتا ہے کہ غیر ملکی چیزیں استعمال مت کرو۔ یہ غریبوں کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔ ہم کو بازار میں جو چیز سستی اور اچھی ملے وہ لینا چاہیے، چاہے وہ ملکی ہو چاہے غیر ملکی۔ ہمارا پیسہ مفت میں نہیں آتا کہ اسے رد‌ّی بھدی سودیشی چیزوں پر پھینکیں۔''

ایک شخص: ''اپنے ملک میں تو رہتا ہے دوسرے کے ہاتھ میں تو نہیں جاتا۔''

دوسرا شخص: ''اپنے گھر میں اچھا کھانا نہ ملے تو کیا دوسری ذات والوں کے گھر کا کھانا کھانے لگیں گے۔''

بھگت: ''لوگ کہتے ہیں کہ لڑکوں کو سرکاری مدرسوں میں مت بھیجو۔ سرکاری مدرسوں میں نہ پڑھتے تو آج ہمارے بھائی بڑی بڑی نوکریاں کیسے پاتے، بڑے بڑے کارخانے کیسے بنا لیتے۔ نئی تعلیم حاصل کیے بغیر اب دنیا میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ پرانی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پترا دیکھنے اور کتھا کرنے کے علاوہ اور کیا آتا ہے۔ راج کاج کیا پٹی پوتھی دیکھنے والے کریں گے۔''

ایک شخص: ''ہمیں راج کاج نہیں چاہیے۔ ہم اپنی کھیتی باڑی میں ہی مگن ہیں۔ کسی کے غلام تو نہیں۔''

دوسرا شخص: ''جو تعلیم مغرور بنا دے اس سے بے وقوف رہنا ہی اچھا۔ نئی تعلیم حاصل کر کے تو لوگ سوٹ بوٹ، گھڑی چھڑی، ہیٹ کیٹ لگانے لگتے ہیں اور اپنے شوق کے پیچھے اپنے ملک کی دولت غیر ملکی لوگوں کی جیب میں بھرتے ہیں یہ ملک کے غدار ہیں۔''

بھگت: ''گانجا، شراب کی طرف آج کل لوگوں کی کڑی نگاہ ہے۔ نشہ بری لت ہے، اسے سب جانتے ہیں۔ سرکار کو نشے کی دوکانوں سے کروڑوں روپیہ سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ اگر دکانوں میں نہ جانے سے لوگوں کی نشے کی لت چھوٹ جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔ وہ

دوکان پر نہ جائے گا تو چوری چھپے کسی نہ کسی طرح دونے چوگنے دام دے کر، سزا کاٹنے پر تیار ہوکر اپنی لت پوری کرے گا تو ایسا کام کیوں کرو کہ سرکار کا نقصان الگ ہو اور غریب رعایا کا نقصان الگ ہو۔ پھر کسی کسی کو نشہ کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ میں ہی ایک دن افیم نہ کھاؤں تو گانٹھوں میں درد ہونے لگے، دم اکھڑ جائے اور سردی پکڑ لے۔"

ایک آواز: "شراب پینے سے بدن میں پھرتی آجاتی ہے۔"

ایک شخص: "سرکار ادھرم سے روپیہ کماتی ہے، اسے یہ زیبا نہیں۔ اُدھرمی کے راج میں رہ کر رعایا کی بھلائی کیسے ہو؟"

دوسرا شخص: "پہلے دارو پلا کر پاگل بنا دیا۔ لت پڑی تو پیسے کی چاٹ ہوئی۔ اتنی مزدوری کس کو ملتی ہے کہ روٹی کپڑا بھی چلے اور دارو بھی اُڑے۔ یا تو بال بچّوں کو بھوکوں مارو یا چوری کرو، جوا کھیلو اور بے ایمانی کرو۔ شراب کی دُکان کیا ہے ہماری غلامی کا اڈّہ ہے۔"

چودھری کے اُپدیش سننے کے لیے جنتا ٹوٹتی تھی۔ لوگوں کو کھڑے ہونے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ دنوں دن چودھری کی عزّت بڑھنے لگی۔ ان کے یہاں روزانہ پنچایتوں اور ملک کی ترقی کا چرچا رہتا۔ جنتا کو ان باتوں میں بڑا مزا آتا اور جوش پیدا ہوتا۔ ان کی سیاسی معلومات میں اضافہ ہوتا۔ جنتا اپنی اہمیت سمجھنے لگی تھی، اسے اپنے اقتدار کا احساس ہونے لگا تھا۔ مطلق العنانی اور بے انصافی پر اب اس کی تیوریاں چڑھنے لگی تھیں۔ اسے آزادی کا مزا ملا۔ گھر کی روٹی، گھر کا سوت، گھر کا کپڑا، گھر کا کھانا، گھر کی عدالت، پولیس کا ڈر نہ عہدیداروں کی خوشامد۔ سکھ اور شانتی سے زندگی گزرنے لگی۔ کتنوں نے ہی نشہ بازی چھوڑ دی اور خیر سگالی کی ایک لہر سی دوڑنے لگی۔

لیکن بھگت جی اتنے خوش قسمت نہیں تھے۔ جنتا دنوں دن ان کے اُپدیشوں سے بیزار ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ اکثر ان کے سامعین میں پٹواری، چوکیدار، مدرّس اور ان ملازمین کے دوستوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا تھا، کبھی کبھی بڑے حاکم بھی آنکلتے اور بھگت جی کی بڑی خاطر مدارات کرتے۔ ذرا دیر کے لیے بھگت جی کے آنسو پچھ جاتے لیکن ذرا دیر کی عزّت آٹھوں پہر کی بے عزّتی کا مقابلہ کیسے کرتی۔ جدھر نکل جاتے ادھر ہی انگلیاں اُٹھنے لگتیں۔ کوئی کہتا خوشامدی ٹٹو ہے، کوئی کہتا خفیہ پولیس کا مخبر ہے۔ بھگت جی اپنے حریف کی بڑائی اور اپنی بُرائی پر دانت پیس پیس کر رہ جاتے تھے۔ زندگی میں یہ پہلا ہی موقع تھا کہ انھیں سب کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ مدّتوں سے جس خاندانی شان کی حفاظت کرتے آئے تھے اور جس پر اپنا سب کچھ قربان کر چکے تھے وہ دھول میں مل گئی۔ یہ جلا دینے والی فکر ایک پل کے لیے بھی انھیں

چین نہ لینے دیتی۔ ہر روز یہی مسئلہ سامنے رہتا کہ اپنا کھویا ہوا وقار کیسے پاؤں۔ اب حریف کو کیوں کر گمراہ کروں، اس کا غرور توڑ دوں۔ آخر انھوں نے شیر کو اس کی ماند میں ہی پچھاڑنے کا فیصلہ کیا۔

شام کا وقت تھا۔ چودھری کے دروازے پر ایک بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ آس پاس کے دیہات کے کسان بھی آ گئے تھے۔ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ چودھری انھیں سوراجیہ سے متعلق اُپدیش دے رہے تھے۔ بار بار بھارت ماتا کی جے جے کار کی صدا ہوتی تھی ایک طرف خواتین کا جماؤ تھا۔ چودھری نے اُپدیش ختم کیا اور اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ رضا کاروں نے سوراجیہ فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا کہ اتنے میں بھگت جی نہ جانے کدھر سے لپکے ہوئے آئے اور حاضرین کے سامنے کھڑے ہو کر اونچی آواز میں بولے:

''بھائیو! مجھے یہاں دیکھ کر تعجب مت کرو۔ میں سوراجیہ کا مخالف نہیں ہوں۔ اتنا گرا ہوا کون سا انسان ہوگا جو سوراجیہ کی بُرائی کرے لیکن اس کو حاصل کرنے کا وہ طریقہ نہیں ہے جو چودھری نے بتایا ہے اور جس پر تم لوگ لٹو ہو رہے ہو۔ جب آپس میں پھوٹ اور لڑائی ہے تو پنچایتوں میں کیا ہوگا۔ جب عیش و عشرت کا بھوت سر پر سوار ہے تو نشہ کیسے چھوٹے گا۔ شراب کی دُکانوں کو کیسے چھوڑا جائے گا۔ سگریٹ، صابن، موزے، بنیائن، اڈھی، تن زیب سے کیسے پنڈ چھوٹے گا۔ جب رُعب اور حکومت کا لالچ بنا ہوا ہے تو سرکاری مدرسے کیسے چھوڑو گے۔ لامذہبیت سکھانے والی تعلیم کی بیڑی سے کیسے نجات پاؤ گے۔ سوراجیہ لینے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ خود اپنے اوپر قابو۔ یہی مجرب نسخہ تمھاری تمام بیماریوں کو جڑ سے ختم کر دے گا آتما کو طاقتور بناؤ۔ خواہشات کو سادھو، مَن کو بس میں کرو تبھی تم میں بھائی چارہ پیدا ہوگا، تبھی عیش و عشرت سے من ہٹے گا۔ تبھی نشے بازی ختم ہوگی۔ اپنے پر قابو کیے بغیر سوراجیہ کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ خود غرضی سب پاپوں کی جڑ ہے۔ یہی تمھیں عدالتوں میں لے جاتی ہے، سب جانتے ہیں کہ میں چالیس سال سے افیم استعمال کرتا ہوں آج سے افیم کو گائے کا خون سمجھوں گا۔ چودھری سے میری تین پشتوں سے عداوت ہے، آج سے چودھری میرا بھائی ہے۔ آج سے میرے گھر کے کسی شخص کو گھر کے کتے سوت سے بُنے ہوئے کپڑے کے علاوہ کچھ اور پہنے دیکھو تو مجھے جو سزا دینا چاہو دو۔ بس مجھے یہی کہنا ہے پرماتما! ہم سب کی تمنا پوری کرے۔''

یہ کہہ کر بھگت جی گھر کی طرف چلے کہ چودھری دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گئے۔ تین نسلوں کی عداوت ایک پل میں ختم ہوگئی۔

اس دن سے چودھری اور بھگت ساتھ ساتھ سوراجیہ کا اُپدیش کرنے لگے۔ ان میں گہری دوستی ہوگئی اور یہ طے کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں سے جنتا کس کی زیادہ عزت کرتی ہے۔

خیر سگالی وہ چنگاری تھی جس نے دونوں آدمیوں کے دل کے چراغ کو روشن کر دیا تھا۔

○

دیہات میں میں نے ایک کپڑے کا کارخانہ کھولا جس میں آٹھ چرخے چل رہے تھے۔ کچھ اور چرخے وغیرہ بھی بنوائے جارہے تھے۔ ایک منیجر پچیس روپیہ ماہوار پر رکھا۔ گواس سے مجھے ماہوار کچھ نہ کچھ منافع ضرور ہوگا لیکن اتنا نہیں کہ میں اس پر تکیہ کرسکوں۔ باوجود نان کوآپریشن کرنے کے ابھی تک دولت کی طرف سے بالکل مستغنی نہیں ہوں میں ذاتی طور پر ہو بھی جاؤں اور میری بیوی کو یقین ہوجائے کہ اب اس طرح اس کی زندگی بسر ہوگی تو وہ مجھے ہرگز معاف نہ کرے گی۔

اس کے بعد میں لمہی چلا آیا۔ اور اپنے دیہات میں بیٹھ کر پرچار اور ادبی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک قصّہ "بعد از مرگ"، "صبحِ اُمید" میں شائع ہوا دوسرا "نوک جھونک"، "زمانہ" میں۔ ایک اور قصّہ "سیرتِ حیات" "زمانہ"۔ ایک چوتھا "دست غیب" تھا۔ پانچویں میں بھی نان کوآپریشن کا رنگ تھا۔

زمانہ، کہکشاں، سو دیش اور بنارس کے "آج" کے لیے لکھا "مریادا" کا ایڈیٹوریل چارج بھی سنبھالا۔ "گوشۂ عافیت" کا ہندی ایڈیشن تیار کیا، مگر لمہی اور بنارس میں بات ہی نہیں بنی تب کانپور کے مارواڑی اسکول میں نوکری کی، ہیڈماسٹر کے عہدے پر۔

○

یہاں میری کلاس میں سورج پرکاش سے زیادہ شریر لڑکا نہ تھا بلکہ یوں کہو اپنی ملازمت کے دس سالوں میں مجھے ایسے ناہموار طالب علم سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ فتنہ انگیزی میں اس کی جان بستی تھی۔ مدرسوں کو بنانے اور چڑھانے، سرگرم طلبا کو ذلیل کرنے اور رلانے میں اُسے مزا آتا تھا۔ ایسی ایسی سازشیں کرتا، ایسے ایسے پھندے ڈالتا، ایسی ایسی بندشیں کرتا کہ عقل دنگ ہوجاتی تھی۔ گروہ بندی میں اُسے خداداد ملکہ تھا۔ خدائی فوجداروں کی ایک فوج بنالی تھی اور اس کے زور سے اسکول پر حکومت کرتا تھا۔ پرنسپل کا حکم ٹل جائے مگر کیا مجال کہ کوئی اس کے حکم سے سرمُو انحراف کرسکے۔ جینا محال کر دیتا تھا۔ اسکول کے چپراسی اور اردلی اس سے تھر تھر کانپتے تھے۔ انسپکٹر کا معائنہ ہونے والا تھا۔ پرنسپل صاحب نے حکم دیا کہ لڑکے معیّن وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے آجائیں۔ منشا یہ تھا کہ لڑکوں کو معائنہ کے متعلق کچھ ضروری ہدایتیں

کردیں۔ مگر دس بج گئے انسپکٹر صاحب آ کر بیٹھ گئے اور مدرسہ میں ایک لڑکا بھی نہیں! گیارہ بجے خود بخود سب لڑکے اس طرح نکل پڑے، جیسے کوئی پنجرہ کھول دیا گیا ہو۔ انسپکٹر صاحب نے کیفیت میں لکھا: ڈسپلن بہت خراب ہے۔ پرنسپل صاحب کی کرکری ہوئی، مدرسین بدنام ہوئے۔ اور یہ ساری شرارت سورج پرکاش کی تھی۔ مگر ہر چند تحقیقات کی گئی، سورج پرکاش کا کسی نے نام تک نہ لیا۔ مجھے اپنی تنظیم پر غرہ تھا۔ ٹریننگ کالج میں اس صیغہ میں میں نے امتیاز حاصل کیا تھا مگر یہاں میری ساری تنظیمی قابلیت میں زنگ سا لگ گیا تھا۔ کچھ عقل ہی کام نہ کرتی کہ اس شیطان کو کیسے راہِ راست پر لاؤں۔ کئی بار مدرسوں کی میٹنگ ہوئی پر یہ عقدہ نہ حل ہوا نئے اصول تعلیم کے مطابق میں جورِ اُستاد کا قائل نہ تھا پر یہاں ہم اس طرز عمل سے محض اس لیے محترز تھے کہ کہیں علاج مرض سے بدتر نہ ہو جائے۔ سورج پرکاش کو اسکول سے نکال دینے کی تجویز بھی کی گئی پر اسے شکست کا اعتراف سمجھ کر ہم اس پر عمل کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بیس بائیس سند یافتہ آزمودہ کار آمد مدرس ایک بدمعاش بارہ تیرہ سال کے لڑکے کی اصلاح نہ کر سکیں، یہ خیال حد درجہ شرمناک تھا، یوں تو سارا اسکول اس سے بیزار تھا مگر سب سے زیادہ پریشان میں تھا، کیونکہ وہ میرے درجہ کا طالب علم تھا اور اس کی شرارتوں کا خمیازہ زیادہ تر مجھے اُٹھانا پڑتا تھا۔ اسکول آتا تو یہ اندیشہ لگا رہتا کہ دیکھیں آج کیا شگوفہ کھلتا ہے۔ ایک دن اپنی میز کی دراز کھولی تو اس میں سے ایک بڑا سا مینڈک نکل پڑا۔ میں چونک کر پیچھے ہٹا تو گرتے گرتے بچا، کلاس میں ایک شور برپا ہو گیا۔ ''مگر قہر درویش بر جان درویش'' سورج پرکاش کی طرف غضب ناک معذوری کی نگاہ ڈال کر رہ گیا سارا گھنٹہ پند و نصیحت میں گزر گیا اور بدمعاش سر جھکائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ نیچے کی جماعتوں سے پاس ہو کر کیونکر میرے درجہ تک آیا تھا۔ اس میں ابتدائی درجوں تک کی لیاقت بھی نہ تھی۔ آٹھویں درجہ تک آ پہنچا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر سال پاس ہوتا چلا آتا ہے پاس کیونکر ہوتا تھا، خدا ہی جانے۔

ایک دن میں نے غصہ سے کہا: ''تم اس درجہ سے عمر بھر پاس نہیں ہو سکتے۔''

سورج پرکاش نے پُر اطمینان اور لاپرواہی سے کہا: ''آپ میرے پاس ہونے کی فکر نہ کریں، میں ہمیشہ پاس ہوتا رہا ہوں اور اب کے بھی پاس ہوں گا۔''

''غیر ممکن۔''

''غیر ممکن، ممکن ہو جائے گا۔''

میں استعجاب سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ذہین سے ذہین لڑکا بھی اپنی کامیابی کا دعویٰ اتنے استحکام کے ساتھ نہ کر سکتا تھا۔ معاً خیال آیا یہ امتحانی پرچے اُڑا لیتا ہو گا محکموں کے نوکروں یا

لڑکوں سے مل کر کچھ لالچ دے کر پرچے نقل کر لیتا ہوگا۔ میں نے عہد کیا۔ اب کے میں اس کی ایک بھی چال نہ چلنے دوں گا۔ دیکھوں کتنے دن اس درجہ میں پڑا رہتا ہے آپ گھبرا کر نکل بھاگے گا۔

سالانہ امتحان کے موقعہ پر میں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا مگر سورج پرکاش کی کاپی دیکھی تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، میرے دو پرچے تھے دونوں ہی میں اس کے نمبر درجہ میں سب سے زیادہ تھے اور محنتوں کے پرچے شاید اتنے اچھے نہ کیے تھے مگر پاس سب پرچوں میں تھا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ میرے کسی پرچے کا کوئی سوال بھی حل نہیں کر سکتا۔ میں اسے ثابت کر سکتا تھا مگر اس کے جوابی پرچوں کو کیا کرتا۔ تحریر میں اتنا فرق نہ تھا جو کوئی شبہ پیدا کر سکتا امتحان میں اکثر لڑکوں کی تحریر عجلت کے باعث کچھ نہ کچھ مختلف ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا وہ بھی چکرا گئے مگر انھیں بھی دیدہ و دانستہ مکھی نگلنی پڑی۔ میں شاید معمول سے زیادہ مایوس طبیعت ہوں اور مدرسوں کو میں سورج پرکاش کے بارے میں ذرا بھی متردد نہ پاتا تھا۔ گویا ایسے لڑکوں کا اسکول میں آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر میرے لیے وہ ایک ہیجان انگیز معمہ تھا۔ اگر اس کے اطوار یہی رہے تو ایک دن یا تو جیل میں ہوگا یا جیل کے راستہ میں۔

مارواڑی اسکول چھٹا تو سورج پرکاش سے میری گلوخلاصی ہوئی، لڑکے مجھ سے مایوس ہو گئے تھے۔ ان کی طرف سے مجھے رخصتی دعوت دی گئی اور سب کے سب مجھے اسٹیشن تک پہنچانے آئے اس وقت سبھی لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں بھی اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا اتفاق سے اسی وقت میری نگاہ سورج پرکاش پر پڑی، جو سب سے پیچھے کچھ نادم کھڑا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اُس کی آنکھ میں بھی آنسو بھرا ہوا تھا۔ میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ اس سے چلتے چلتے دو چار باتیں کر لوں، شاید وہ بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نہ میں نے پیش قدمی کی اور نہ اُس نے، حالانکہ مجھے بہت دنوں تک اس کا افسوس رہا۔ اس کا حجاب قابلِ معافی ہے اس نے مجھے ناراضگی کے بیشمار موقع دیے تھے میرا احتراز ناقابلِ عفو تھا۔ ممکن تھا کہ اس وقت اور ندامت کے عالم میں دو چار خلوص کی باتیں اس کے دل پر اثر کر جاتیں مگر انھی کھوئے موقعوں کا نام تو زندگی ہے۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلی۔ لڑکے کئی قدم اس کے ساتھ دوڑے میں کھڑکی کے باہر سے سر نکالے کھڑا تھا کچھ دیر تک مجھے اُن کے ہلتے ہوئے رومال نظر آئے پھر وہ صورتیں حباب کی طرح مٹ گئیں مگر ایک ننھی سی مورت اب بھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے قیاس کیا وہ سورج پرکاش ہے۔ اس وقت میرا دل کسی بے تاب قیدی کی طرح نفرت کدورت اور مغائرت کی بندشوں کو توڑ توڑ کر اس سے گلے ملنے کے لیے تڑپ اُٹھا۔

کئی سال بعد ایک روز میں اپنی کلاس پڑھا رہا تھا کہ موٹر آ کر رُکی۔ معلوم ہوا کہ یہ اس ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ میں اس وقت محض ایک کرتہ اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ اس ہیئت میں ایک حاکم سے ملتے ہوئے شرم آ رہی تھی، مگر کپڑے منگانے کا موقعہ نہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اپنی موٹر سے اُتر پڑے اور میری طرف بڑھے۔ میں نے جھینپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا مگر مجھ سے ہاتھ ملانے کے بدلے میرے پیروں کی طرف جھکے اور ان پر سر رکھ دیا۔ میں کچھ ایسا سٹپٹا گیا کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں انگریزی اچھی لکھتا ہوں۔ فلسفہ میں مجھے اچھا دخل ہے تقریر بھی خوب کر لیتا ہوں۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی تقدس کے قابل نہیں وہ درجہ تو عارف اور کامل کو ہی ہے اگر میں برہمن ہوتا تو بھی ایک بات تھی۔ حالانکہ ایک سویلین کا کسی برہمن کے پیروں پر سر رکھنا خیال میں بھی نہیں آتا۔ میں ابھی اسی حیرت میں پڑا ہوا تھا کہ اس نے سر اُٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں؟''

اب میں نے اس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ صورت مانوس معلوم ہوئی اسے ضرور کہیں دیکھا ہے۔

دفعتاً حافظہ کی آنکھیں کھل گئیں، بولا: ''آپ کا نام پرکاش تو نہیں ہے؟''

''جی ہاں! میں آپ کا وہی نالائق شاگرد ہوں مگر آپ نے خوب پہچانا۔ مجھے اُمید نہ تھی۔''

''میں ۱۶ء میں اس اسکول میں تھا۔ بارہ تیرہ سال ہو گئے!''

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا۔ ''ماسٹر لڑکوں کو بھول جاتے ہیں مگر لڑکے انھیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔''

میں نے اسی مذاق کے انداز سے جواب دیا: ''تم ایسے لڑکوں کو بھولنا مشکل ہے۔''

سورج پرکاش: ''انھیں خطاؤں کی معافی مانگنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں ہمیشہ آپ کا سراغ لگاتا رہتا تھا۔ جب آپ پرنسپل ہوئے اس وقت میں انگلینڈ جانے کو تیار تھا ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔ وہاں میں آپ کے مضامین اخباروں میں پڑھتا تھا۔ جب لوٹا تو معلوم ہوا کہ آپ نے استعفیٰ دے دیا اور کہیں دیہات میں چلے گئے ہیں۔ اس ضلع میں آئے مجھے ایک سال سے زیادہ ہوا مگر اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ آپ اس ویرانے میں پڑے ہوئے ہیں، آج باتوں ہی باتوں میں کسی زمیندار نے آپ کا ذکر کیا۔ آپ کا نام تو اُسے معلوم نہ تھا مگر اس نے جو حلیہ بیان کیا اس سے مجھے معاً آپ کا خیال آیا۔ ڈاکخانہ میں دریافت کیا تو آپ کے نام کی بھی تحقیق ہو گئی دوڑا چلا آ رہا ہوں، آپ تو بالکل تارک الدنیا ہو گئے اس کوردیہہ میں آپ کی طبیعت کیسے لگتی

ہے ابھی تو آپ کی عمر ۴۶ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ بان پرست کا زمانہ تو ۶۰ کے بعد آتا ہے۔"
میں نہیں کہہ سکتا کہ سورج پرکاش کا عروج دیکھ کر مجھے کتنی استعجاب آمیز مسرت حاصل ہوئی، اگر وہ میرا اپنا ہوتا تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی میں اُسے اپنے جھونپڑے میں لایا اور اس سے چند لفظوں میں اپنی رام کہانی سنائی۔

سورج پرکاش نے کہا: "تو یہ کہیے کہ آپ اپنے ہی ایک بھائی کی بے وفائی کا شکار ہوئے۔ میرا تجربہ تو ابھی بہت ہی مختصر ہے مگر اتنے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہم لوگ ابھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور اپنے قول کو نبھانا نہیں جانتے۔ جہاں دیکھیے وہاں خود غرضی منسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو پوچھوں گا۔ یہی انسانیت اور ہمدردی کا تقاضا تھا؟"

میں نے جواب دیا: "بھئی ان کی کوئی خطا نہیں، ممکن ہے اس حالت میں میں بھی وہی کرتا جو انھوں نے کیا۔ مجھے اپنی ہوس پروری کی سزا مل گئی ہے اور اس کے لیے میں اُن کا مشکور ہوں۔ تصنع نہیں، میں دل سے کہتا ہوں کہ یہاں مجھے جتنا سکون اور اطمینان ہے اتنا کبھی نہ تھا۔ اس گوشۂ قناعت میں مجھے حقائقِ زندگی کا وہ علم ہوا جو ثروت اور جاہ کی دوڑ میں کسی طرح ممکن نہ تھا۔ فلسفہ اور تاریخ کے دفتر چاٹ کر اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی خوشہ چینی کر کے بھی میں اپنی خود پروری کا ازالہ نہ کر سکا۔ بلکہ یہ مرض روز بروز زیادہ سنگین ہوتا جاتا تھا آپ زینوں پر پاؤں رکھے بغیر سقف کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔ ثروت کی دوڑ میں دوسرے انسانوں کی زندگیاں ہی زینوں کا کام دیتی ہیں، آپ انھیں کچلے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے وہاں انسانیت شرافت اور ہمدردی کا ذکر ہی کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت میں درندوں کے بیچ میں تھا اور میری ساری قوتیں اپنی حفاظت کرنے میں صرف ہو جاتی تھیں۔ یہاں میں اپنے چاروں طرف خلوص اور سادگی دیکھتا ہوں، میرے پاس جو لوگ آتے ہیں کوئی کمینہ غرض لے کر نہیں آتے اور نہ میری خدمات میں صلہ یا ستائش کی تمنا ہے میں بھی کسی کے پاس جاتا ہوں تو کوئی غرض لے کر نہیں جاتا مجھے یہاں کے در و دیوار اور برگ و بار میں بھی خلوص کی جھلک نظر آتی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے سورج پرکاش کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا جہاں شرارت آمیز تبسم کی جگہ پشیمانی کا رنگ تھا۔ مجھ سے قناعت کا سبق لینے وہ میرے پاس نہ آیا تھا شاید یہ دکھانے آیا تھا کہ آپ نے جسے اتنا حقیر سمجھا تھا وہ اب اس درجہ پر ہے، وہ مجھ سے اپنے سعی جمیل کی داد چاہتا تھا۔ مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایک صاحب ثروت کے روبرو ثروت وجاہ کی مذمت زیبا نہیں۔ میں نے فوراً سلسلۂ تقریر بدل کر کہا: "مگر تم اپنا حال تو کہو، تمھاری یہ کایا پلٹ

کیونکر ہوئی۔ تمھاری شرارتوں کو یاد کرتا ہوں تو اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یکا یک یہ انقلاب کیسے ہوا؟ کسی فقیر کے سوا اور تو کوئی طاقت یہ معجزہ نہ دکھا سکتی تھی۔"

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا: "آپ کی دُعا تھی۔"

"دُعا نہیں بددُعا ہو سکتی تھی۔"

"ابھی اس حد تک دُنیا سے بیزار نہیں ہوا ہوں۔"

آخر میرے بار بار اصرار کرنے پر سورج پرکاش نے اپنا قصّہ کہنا شروع کیا۔

"آپ کے چلے آنے کے کئی روز بعد میرا ماموں زاد بھائی اسکول میں داخل ہوا، اس کی عمر آٹھ نو سال سے زائد نہ تھی۔ پرنسپل صاحب اُسے ہوسٹل میں نہ لیتے تھے اور نہ ماموں صاحب اس کے رہنے کا کوئی دوسرا انتظام کر سکتے تھے۔ انھیں اس پریشانی میں دیکھ کر میں نے پرنسپل صاحب سے کہا اسے میرے کمرے میں ٹھہرا دیجیے پرنسپل صاحب اس پر راضی نہ ہوئے کہنے لگے یہ قاعدے کے خلاف ہے۔ میں بھلا ان کی حکومت کب برداشت کر سکتا تھا، میں نے اسی دن ہوسٹل چھوڑ دیا اور اپنے ماموں زاد بھائی کو لے کر ایک دوسرے مکان میں رہنے لگا۔ زائد خرچ کا بار ماموں صاحب نے لیا۔ لڑکے کا نام موہن تھا۔ اس کی ماں کئی سال پہلے ہی مر چکی تھی۔ وہ اتنا دُبلا پتلا کمزور اور غریب لڑکا تھا کہ پہلے ہی دن سے مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ کبھی اس کے سر میں درد ہوتا کبھی بخار آتا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت ہوتی رہتی تھی۔ سر شام سو جاتا اور اُسے کھانے کے لیے مجھے اس کی منّتیں کرنی پڑتیں دن چڑھے تک سوتا رہتا اور جب تک میں گود میں اُٹھا کر بٹھا نہ دیتا اُٹھنے کا نام نہ لیتا۔ رات کو چونک پڑتا — اپنی چارپائی سے اُٹھ کر میری چارپائی پر آ جاتا اور میرے گلے سے لپٹ کر سوتا۔ مجھے اُس پر کبھی غصہ نہ آتا کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس سے اتنا اُنس ہو گیا میں جو نو بجے سو کر اُٹھا کرتا تھا تڑکے اُٹھ بیٹھتا اور اس کے لیے دودھ گرم کرتا۔ پھر اُسے اُٹھا کر ہاتھ منہ دھلاتا اور اس کی صحت کا خیال کر کے ساتھ سیر کرانے لے جاتا۔ میں، جو کبھی کتاب لے کر نہ بیٹھتا تھا اُسے گھنٹوں پڑھایا کرتا۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس کیونکر ہو گیا، اس کا اب تک مجھے تعجب ہے۔ اُسے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی تو میری جان ناخن میں سما جاتی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس دوڑتا، دوائیں لاتا اور موہن کی خوشامد کر کے اُسے دوا پلاتا۔ ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی کہ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے اس غریب کا یہاں میرے سوا دوسرا کون ہے، ماموں صاحب اُسے میرے بھروسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بچارا بے ماں کا لڑکا ہے۔ میرے بدمعاش دوستوں میں کوئی اُسے چڑاتا یا چھیڑتا تو میری تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ کئی لڑکے تو مجھے بوڑھی دایہ کہہ کر چڑاتے تھے پر میں

ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ میں اس کے سامنے کوئی بیہودہ حرکت نہ کرتا تھا، ایک بھی ناشائستہ لفظ منہ سے نہ نکالتا یہ خیال ہوتا تھا کہ میری دیکھا دیکھی یہ بھی خراب ہو جائے گا۔ میں اُس کے سامنے اس طرح رہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنا نمونہ سمجھے اور اس کے لیے لازمی تھا کہ پہلے میں اپنی اصلاح کروں۔ وہ نو بجے سو کر اُٹھتا۔ وہ بارہ بارہ بجے تک سیر گشت کرتا۔ وہ نئی نئی شرارتوں کے منصوبے باندھنا، ماسٹروں کی آنکھ بچا کر اسکول سے اُڑ جانا آپ ہی آپ جاتا رہا۔ صحت اور اخلاق کے آئین کا میں دشمن تھا پر اب مجھ سے بڑھ کر اُن کا پابند دوسرا نہ تھا۔ میں ایشور کا مذاق اڑایا کرتا تھا مگر اب پکا خدا دوست ہو گیا تھا وہ بڑی سادگی سے پوچھتا تھا۔ 'پر ماتما سب جگہ رہتے ہیں تو میرے پاس بھی رہتے ہوں گے۔' اس سوال کا مذاق اُڑانا میرے لیے غیر ممکن تھا۔ میں کہتا۔ 'ہاں پر ماتما تمھارے ہمارے سب کے پاس رہتے ہیں اور ہماری حفاظت کرتے ہیں۔' اس کا چہرہ نورانی مسرت سے چمک اُٹھتا تھا۔ شاید وہ پر ماتما کے وجود کو محسوس کرنے لگتا تھا۔ ماسٹر صاحب! یقین مانیے۔ سال بھر میں ہی موہن کچھ سے کچھ ہو گیا — وہ مخنی غریب صورت۔ کاہل بے خبر لڑکا اب توانا۔ شگفتہ رو۔ چاق و چست اور بشاش ہو گیا، ماموں صاحب دوبارہ آئے تو اُسے دیکھ کر حیرت میں آ گئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے:

'بیٹا تم نے اسے جلا لیا ورنہ میں تو مایوس ہو چکا تھا، اس کا صلہ تمھیں ایشور دیں گے اس کی ماں جنت میں بیٹھی ہوئی تمھیں دُعائیں دے رہی ہے۔''

سورج پرکاش کی آنکھیں اس وقت بھی آبگوں ہو گئی تھیں۔

میں نے پوچھا: ''موہن بھی تمھیں پیار کرتا ہوگا؟''

سورج پرکاش کی آبگوں آنکھوں میں ایک حسرتناک مسرت جلوہ افروز ہوئی۔ بولا:

''جناب وہ مجھے ایک منٹ کے لیے بھی نہ چھوڑتا تھا میرے ساتھ کھاتا میرے ساتھ بیٹھتا۔ میرے ساتھ سوتا۔ میں ہی اس کا سب کچھ تھا افسوس وہ آج اس دُنیا میں نہیں ہے مگر میں اُسے ہمیشہ زندہ محسوس کرتا ہوں، میں جو کچھ ہوں اسی کا بنایا ہوا ہوں۔ اگر وہ فرشتہ غیب کی طرح میرا رہنما نہ ہو جاتا تو شاید آج میں کسی جیل میں پڑا ہوتا۔ ایک دن میں نے کہہ دیا تھا: 'اگر تم روز نہا نہ لیا کرو گے تو میں تم سے نہ بولوں گا۔' نہانے سے وہ نہ جانے کیوں جی چراتا تھا۔ میری اس دھمکی کا یہ اثر ہوا کہ وہ روزانہ علی الصبح نہانے لگا۔ کتنی ہی سردی کیوں نہ ہو، کتنی ہی ٹھنڈی ہوا چلے لیکن وہ نہانے میں غفلت نہ کرتا۔ دیکھتا رہتا تھا کہ میں کس بات سے خوش ہوتا ہوں ایک روز میں چند احباب کے ساتھ تھیئٹر دیکھنے چلا گیا۔ تاکید کر گیا تھا کہ تم کھانا کھا کر سو رہنا۔ تین بجے رات کو لوٹا تو دیکھا وہ بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا: 'تم سوئے نہیں؟' بولا: 'نیند نہیں آئی۔' اُس

دن سے میں نے تھیٹر جانے کا نام نہ لیا۔ بچوں میں پیار کی جو ایک بھوک ہوتی ہے۔ دودھ اور مٹھائی اور کھلونوں سے بھی زیادہ مرغوب۔ جو ماں کی گود کے سامنے دنیا کی کسی چیز کی ہستی کو خیال میں نہیں لاتی۔ موہن میں اس بھوک نے کبھی سیری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ پہاڑوں سے ٹکرانے والی سارس کی صدا کی طرح وہ ہمیشہ اس کی ایک ایک رگ میں گونجا کرتی تھی۔ جیسے زمین پر پھیلی ہوئی لتا کوئی سہارا پاتے ہی اس سے چمٹ جاتی ہے۔ وہی حال موہن کا تھا وہ مجھ سے ایسا چمٹ گیا کہ اس کی نازک بیلوں نے مجھ پر بندشوں کا کام کیا اور مجھے استوار کر دیا۔ اس کی وفات کا قصہ نہایت دردناک ہے میرے دل پر اس کا غم اس وقت بھی تازہ ہے اور مجھ میں اتنا ضبط نہیں کہ میں اس کا ذکر کروں۔ وہ میرے ساتھ تین سال رہا۔ شاید غیب سے میری ہدایت کے لیے جو مشغل عطا ہوا تھا وہ مقصد پورا ہو جانے کے بعد مجھ سے چھین لیا گیا اس ننھے سے دل میں کیا کیا ارمان بھرے ہوئے تھے۔ بی اے پاس کرنا۔ ایم اے پاس کرنا۔ وظیفہ پانا۔ ولایت جانا۔ وہاں سے سول سروس کا امتحان پاس کر کے لوٹنا — یہی اس کے زندگی کے خواب تھے۔ جو مرگ بے ہنگام نے پریشان کر دیے۔''

''گرمیوں کی تعطیلات تھیں۔ دو تعطیلوں میں موہن میرے ساتھ رہا تھا۔ ماموں صاحب کے اصرار کرنے پر بھی گھر نہ گیا۔ تیسری تعطیل میں میری کالج پارٹی نے کشمیر کی سیاحت کا فیصلہ کیا اور مجھے اس کا کپتان بنایا کشمیر کی سیر کی تمنا مدت سے تھی اس موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ موہن کو ماموں صاحب کے پاس بھیج کر میں کشمیر چلا گیا دو مہینے کے بعد لوٹا تو معلوم ہوا موہن بیمار ہے کشمیر میں مجھے بارہا موہن کی یاد آتی تھی اور جی چاہتا تھا لوٹ جاؤں، مجھے اس سے اتنی محبت ہے اس کا اندازہ مجھے کشمیر جا کر ہوا۔ مگر احباب سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا اس کی بیماری کی خبر پاتے ہی میں اس کے پاس گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے زرد چہرے پر مسرت کی تازگی جھلک پڑی میں دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ وہ دُور نظری اور چہرے پر وہ روحانیت تھی، جو منڈلاتی ہوئی موت کی خبر دیتی تھی۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے پوچھا: 'تمھاری کیا حالت ہے موہن —! دو ہی مہینہ میں یہ نوبت پہنچ گئی۔'

موہن نے معصوم تبسم کے ساتھ کہا: 'آپ کشمیر کی سیر کرنے گئے تھے۔ میں آسمان کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔'

''مگر اس قصہ غم کو بیان کر کے میں رونا اور رُلانا نہیں چاہتا میرے چلے جانے کے بعد موہن اس طرح پڑھنے لگا جیسے تپسیا کر رہا ہو اسے یہ خبط پیدا ہو گیا کہ سال بھر کا کورس دو مہینہ میں ختم کرے اور جب مجھ سے ملاقات ہو تو اپنی کارگذاری کی داد وصول کر لے۔ اس اشتیاق

نے محویت کی صورت اختیار کرلی۔ میں کس طرح اس کی پیٹھ ٹھونکوں گا۔ شاباشی دوں گا۔ اپنے دوستوں سے اس کی تعریف کروں گا۔ یہ خیالات اپنی ساری طفلانہ سرگرمی اور انہماک کے ساتھ اس پر غالب آگئے۔ ماموں صاحب کو دفتر کے کام سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ اس کی تفریح کی فکر کریں شاید اُسے ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے دیکھ کر دل میں وہ خوش ہوتے تھے۔ ایسا کون باپ ہے جو لڑکے کے شوقِ طلب میں مخل ہو؟ موہن کو کھیلتے دیکھ کر وہ ضرور ڈانٹتے: 'کتاب لے کر کیوں نہیں بیٹھتے۔' پڑھتے دیکھ کر بھلا کیا کہتے۔ کسی باپ نے بھلا لڑکے کو پڑھنے کے لیے نہیں ڈانٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موہن کی نازک صحت یہ ریاضتِ شاقہ برداشت نہ کرسکی۔ اُسے ہلکا بخار آنے لگا مگر اس حالت میں بھی اس نے پڑھنا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ کئی اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ مگر اس وقت بھی جب بخار کچھ ہلکا ہوجاتا تو وہ کتابیں دیکھنے لگتا تھا۔ اکثر بخار کے عالم میں بھی نوکروں سے پوچھتا۔ 'بھیا کا خط آیا؟ وہ کب آئیں گے؟' اس وقت اس کے سوا اُسے کوئی دوسری تمنا نہ تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری سیر کشمیر اتنی مہنگی پڑے گی تو میں اس کا نام بھی نہ لیتا۔ میں نے اُسے سنبھالنے کی حتی الامکان بڑی کوشش کی۔ مگر بخار ٹائیفائیڈ تھا اس کی جان لے کر ہی اُترا۔ پہلی بار میں نے موت کی صورت دیکھی اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کی زندگی کے خواب ایک جان سے پیارے عزیز کی وصیت بن کر مجھے تحریکِ عمل کرنے لگے اور یہ اُسی کا اثر ہے کہ آج آپ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ موہن نے زندگی کا جو خیالی معیار قائم کیا تھا اُس پر عمل کرکے مجھے یہ مسرت ہوئی ہے کہ شاید اس کی معصوم روح مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہو۔ یہی تحریک تھی جس نے ایم اے سول سروس کی آزمائشوں میں مجھے کامیاب بنایا۔ ورنہ میں آج بھی وہی نالائق گستاخ اور غبی سورج پرکاش ہوں جس کی صورت سے بھی آپ بیزار تھے۔"

اس دن سے میں کئی بار سورج پرکاش سے مل چکا ہوں۔ وہ جب اس گردونواح میں آجاتا ہے تو مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتا۔ موہن اب بھی اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ ایک ایسا معمہ ہے۔ جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

ایک طرف سورج پرکاش کی محبت اور دوسری طرف ادیبوں کا تلخ تجربہ۔

ہمیشہ سے ادب کی خدمت کرنے والوں کی زندگی میں ایک ایسا موقع آتا ہے، جب قارئین اُن کے پاس عقیدت بھرے خطوط بھیجنے لگتے ہیں۔ کوئی ان کے طرزِ تحریر کی تعریف کرتا ہے، کوئی ان کے اندازِ تخیل پر فدا ہوجاتا ہے۔ ایسے خطوط کو پڑھ کر ادیب کا دل کتنا خوش ہوجاتا ہے، اسے کسی ادب نواز سے پوچھیے۔ اپنے پھٹے کمبل پر بیٹھا ہوا وہ غرور اور خود اعتمادی کی لہروں

میں ڈوب جاتا ہے۔ بھول جاتا ہے کہ رات کو گیلی لکڑی سے کھانا پکانے کی وجہ سے سر میں کتنا درد ہورہا تھا۔ کھٹملوں اور مچھروں نے رات بھر کیسے نیند حرام کردی تھی۔ 'میں بھی کچھ ہوں' یہ احساس اُسے کچھ لمحات کے لیے مست بنادیتا ہے۔ گذشتہ برس ساون کے مہینے میں مجھے ایک ایسا ہی خط ملا۔ اس میں میری معمولی تصنیفات کی دل کھول کر داد دی گئی تھی۔

خط بھیجنے والے صاحب خود ایک اچھے شاعر (کوی) تھے۔ میں اُن کی کویتائیں اکثر رسائل میں دیکھا کرتا تھا۔ یہ خط پڑھ کر پھولے نہ سمایا۔ اُسی وقت خط لکھنے بیٹھا۔ اُس ترنگ میں جو کچھ لکھا گیا، اس وقت یاد نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ خط شروع سے آخر تک جذباتِ محبت سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کبھی نظم نہیں کہی اور نہ کوئی مجموعۂ کلام لکھا۔ پر زبان کو جتنا سنوار سکتا تھا، اتنا سنوارا۔ یہاں تک کہ جب خط ختم کرکے نظرِ ثانی کی تو نظم کا مزا آیا۔ سارا خط خیالی تصورات سے بھرا تھا۔ پانچویں دن شاعر صاحب کا دوسرا خط آ پہنچا وہ پہلے خط سے بھی زیادہ تعریفی تھا۔ 'پیارے بھیا!' کہہ کر مجھے مخاطب کیا گیا تھا۔ میری تصنیفات کی فہرست اور پبلشروں کے نام و پتہ پوچھا تھا۔ آخر میں یہ خوشخبری کہ 'میری بیوی کو آپ سے ہمدردی ہے۔ وہ بڑی محبّت سے آپ کی تصنیفات کو پڑھتی ہیں۔ وہی پوچھ رہی ہیں کہ آپ کا بیاہ کہاں ہوا ہے۔ آپ کی اولادیں کتنی ہیں اور آپ کا کوئی فوٹو بھی ہے؟ ہو تو مہربانی کرکے بھیج دیجیے۔' میری جائے پیدائش خاندان کا پتہ بھی پوچھا گیا تھا۔ اس خط، خاص کر اس کی آخری خبر نے مجھے خوش کردیا۔

یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مجھے کسی عورت کے منہ سے، چاہے وہ قاری کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو، اپنی تعریف سننے کا موقع ملا تھا۔ غرور کا نشہ چھا گیا۔ خدا! شکر ہے تیرا۔ اب خواتین بھی میری تخلیقات کی تعریفیں کرنے لگیں۔ میں نے فوراً خط لکھا۔ جتنے بھی محبّت بھرے الفاظ میرے ذہن میں محفوظ تھے سب صرف کردیے۔ دوستی اور اپنے پن سے تمام خط بھرا ہوا تھا۔ اپنے خاندانی شجرے کا بیان کیا، حالانکہ کبھی بھی میرے بزرگوں کی تعریف کے گیت بھانڈوں نے بھی نہیں گائے ہوں گے۔ میرے دادا ایک زمیندار کے کارندے تھے، میں نے انھیں ایک بڑی ریاست کا منیجر بتایا۔ اپنے والد کو، جو ایک دفتر میں کلرک تھے، اس دفتر کا ناظمِ اعلیٰ بنادیا۔ اور کاشتکاری کو زمینداری بنادینا تو معمولی بات تھی۔ اپنی تصنیفات کی تعداد تو نہ بڑھا سکا۔ پر ان کی اہمیت، عزت اور پروپیگنڈہ کا بیان ایسے الفاظ میں کیا کہ جو ملائمیت کی آڑ میں غرور کو چھپاتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ اکثر 'جھوٹ' کا مطلب اس کے اُلٹا ہوتا ہے، اور 'دین' کے معنی کچھ اور سمجھے جاتے ہیں۔ صفائی سے اپنی بڑائی کرنا سب سے بڑی بات ہے مگر اشاراتی الفاظ سے آپ اسی کام کو بڑی آسانی سے پورا کرسکتے ہیں۔ خیر، میرا خط ختم ہوگیا اور فوراً ہی لیٹر بکس

کے پیٹ میں پہنچ گیا۔

اس کے بعد دو ہفتے تک کوئی خط نہ آیا۔ میں نے اس خط میں اپنی شریک حیات کی طرف سے بھی دو چار باتیں موقع کی نزاکت کے تحت لکھ دی تھیں۔ اُمید تھی، دوستی اور بھی گہری دوستی میں بدلے گی۔ کہیں نظم میں میری تعریف ہو جائے، تو کیا پوچھنا! پھر تو ادب کی دنیا میں ہی نظر آؤں گا۔ اس خاموشی سے کچھ مایوسی ہونے لگی۔ لیکن اس ڈر سے کہیں شاعر صاحب مجھے مطلبی اور سینٹی مینٹل نہ سمجھ لیں، کوئی خط نہ لکھ سکا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا اور تیسرا پہر، رام لیلا کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ میں اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ تاش کی بازی ہو رہی تھی۔ اچانک ایک صاحب میرا نام پوچھتے ہوئے آئے اور میرے پاس کی کرسی پر بیٹھ گئے اور میرا ان سے کبھی تعارف نہ ہوا تھا۔ سوچ رہا تھا یہ کون آدمی ہے اور یہاں کیسے آیا؟ یار لوگ ان صاحب کی طرف دیکھ کر آپس میں اشارہ بازیاں کر رہے تھے۔ اُن کے ڈیل ڈول میں کچھ نیا پن ضرور تھا۔ کالا رنگ، ناٹا قد، چہرے پر چیچک کے داغ، ننگا سر، بال سنورے ہوئے۔ صرف سادی قمیض گلے میں پھولوں کی مالا، پیروں میں بوٹ اور ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ کی تعریف؟''

جواب ملا۔ ''مجھے اُماپتی نارائن کہتے ہیں۔''

میں اُٹھ کر اُن کے گلے سے لپٹ گیا۔ یہ وہی شاعر صاحب تھے جن کے کئی محبت نامے مجھے مل چکے تھے۔ خیریت دریافت کی۔ پان الائچی سے خاطر کی۔ پھر پوچھا: ''آپ کا آنا کیسے ہوا۔''

انھوں نے کہا۔ ''مکان پر چلیے تو سب حال کہوں گا۔ میں آپ کے گھر گیا تھا۔ وہاں معلوم ہوا، آپ یہاں ہیں۔ پوچھتا ہوا چلا آیا۔''

میں اُماپتی جی کے ساتھ گھر چلنے کو اُٹھ کھڑا ہوا! جب وہ کمرے کے باہر نکل گئے تو میرے دوست نے پوچھا: ''یہ کون صاحب ہیں؟''

میں: ''میرے ایک نئے دوست ہیں۔''

دوست: ''ذرا ان سے ہوشیار رہیے گا۔ مجھے تو اچکّے سے معلوم ہوتے ہیں۔''

میں: ''آپ کا اندازہ غلط ہے۔ آپ ہمیشہ آدمی کی خوش پوشی پر کھا کرتے ہیں۔ پر انسان کپڑوں میں نہیں، دل میں رہتا ہے۔''

دوست: ''خیر یہ غیب کی باتیں تو آپ جانیں۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں۔''

میں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ اُماپتی جی کے ساتھ گھر پر آیا۔ بازار سے کھانا منگوایا۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ انھوں نے مجھے کئی نظمیں سنائیں۔ آواز بہت صاف اور میٹھی تھی۔ نظمیں تو میری سمجھ میں خاک نہ آئیں، پر میں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ جھوم جھوم کر واہ واہ کرنے لگا۔ جیسے مجھ سے بڑھ کر کوئی شاعری کا مداح دُنیا میں نہ ہوگا۔ شام کو ہم لوگ رام لیلا دیکھنے گئے۔ لوٹ کر انھیں پھر کھانا کھلایا۔

اب اُنھوں نے اپنا حال سُنانا شروع کیا۔ اس وقت وہ اپنی شریکِ حیات کو لینے کے لیے کانپور جارہے ہیں۔ اُس کا مکان کانپور میں ہی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ایک ماہانہ رسالہ نکالیں۔ اُن کی نظموں کے لیے ایک پبلشر ایک ہزار روپے دیتا ہے۔ پر اُن کی خواہش تو یہ ہے کہ انھیں پہلے رسالہ میں نمبر وار نکال کر پھر اپنی ہی لاگت سے دیوان چھپوائیں۔ کانپور میں اُن کی زمینداری ہے، پر وہ ادب کی خدمت کرنے میں زندگی گذارنا چاہتے ہیں۔ زمینداری سے اُنھیں نفرت ہے۔

اُن کی بیوی ایک گرلز اسکول کی ہیڈ ماسٹرنی ہے۔ آدھی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔ اب زیادہ تر اُن میں سے یاد نہیں ہیں۔ ہاں! اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں نے مل کر روشن مستقبل کا پروگرام بنالیا تھا۔ میں اپنے مقدر پر خوش تھا کہ خدا نے بیٹھے بٹھائے ایسا سچا دوست بھیج دیا۔ آدھی رات گزر گئی تو سوئے۔ اُنھیں دوسرے دن آٹھ بجے کی گاڑی سے جانا تھا۔ میں جب سو کر اُٹھا، تب سات بج چکے تھے۔

اُماپتی جی ہاتھ منہ دھوئے تیار بیٹھے تھے۔ بولے: ''اب اجازت دیجیے۔ لوٹتے وقت ادھر ہی سے جاؤں گا۔ اس وقت آپ کو کچھ تکلیف دے رہا ہوں، معاف کیجیے گا۔ میں کل چلا تو صبح کے چار بجے تھے۔ دو بجے رات سے پڑا جاگ رہا تھا کہ کہیں نیند نہ آ جائے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ تمام رات جاگنا پڑا۔ کیونکہ چلنے کی فکر لگی ہوئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھا تو جھپکیاں آنے لگیں۔ کوٹ اُتار کر رکھ دیا اور لیٹ گیا، فوراً نیند آ گئی۔ مغل سرائے میں آنکھ کھلی۔ کوٹ غائب! نیچے اُوپر چاروں طرف دیکھا، کہیں پتہ نہیں، سمجھ گیا کسی صاحب نے اُڑا لیا۔ سونے کی سزا مل گئی۔ کوٹ میں پچاس روپے خرچ کے لیے تھے، وہ بھی اُس کے ساتھ اُڑ گئے۔ آپ مجھے پچاس دیں، بیوی کو میکے سے لانا ہے۔ کچھ کپڑے وغیرہ لے جانا پڑیں گے۔ پھر سسرال میں سینکڑوں طرح کے خرچ ہیں۔ قدم قدم پر روپے خرچ ہوتے ہیں۔ نہ خرچ کیجیے تو ہنسی اُڑے۔ میں اِدھر سے لوٹوں گا تو دیتا جاؤں گا۔

میں بڑے شبہ میں پڑ گیا۔ ایک بار پہلے بھی دھوکہ کھا چکا تھا۔ فوراً شک ہوا کہیں اب

کے پھر وہی حالت نہ ہو۔لیکن جلد ہی دل کے اس شک پر شرمندہ ہوا۔دُنیا میں سبھی انسان ایک سے نہیں ہوتے۔ یہ بیچارے بھلے آدمی ہیں، اس وقت مصیبت میں پڑ گئے ہیں اور میں شک و شبہ میں پڑا ہوا ہوں۔گھر میں آ کر بیوی سے کہا: ''تمھارے پاس کچھ روپے تو نہیں ہیں۔''

بیوی: ''کیا کرو گے؟''

میں: ''میرے دوست جو کل آئے ہیں اُن کے روپے کسی نے گاڑی میں چرا لیے۔ اُنھیں بیوی کو بدا کرانے سسرال جانا ہے۔لوٹتے بار دیتے جائیں گے۔''

بیوی نے طنز کرتے ہوئے کہا: ''تمھارے یہاں جتنے دوست آتے ہیں، سب تمھیں ٹھگنے ہی آتے ہیں۔ سبھی مصیبت میں پڑے رہتے ہیں۔میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

میں نے خوشامد کرتے ہوئے کہا: ''لاؤ، دے دو۔ بیچارے تیار کھڑے ہیں۔گاڑی چھوٹ جائے گی۔''

بیوی: ''کہہ دو، اس وقت گھر میں روپے نہیں ہیں۔''

میں: ''یہ کہہ دینا آسان نہیں ہے۔اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں غریب ہی نہیں دوست پرور بھی نہیں ہوں۔نہیں تو کیا میرے لیے پچاس روپے کا بھی انتظام نہ ہو سکتا۔اُماپتی کو بھی یقین نہ آئے گا کہ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔اس سے تو کہیں اچھا ہو کہ صاف صاف یہ کہہ دیا جائے کہ 'ہم کو آپ پر بھروسہ نہیں ہے۔ہم آپ کو روپے نہیں دے سکتے۔کم سے کم اپنا حال تو ڈھکا رہ جائے گا۔''

بیوی نے جھنجلا کر صندوق کی کنجی میرے آگے پھینک دی اور کہا: ''تمھیں جتنی بحث کرنا آتا ہے، اتنا کہیں آدمی کو پرکھنا آتا، تو اب تک آدمی ہو گئے ہوتے! لے جاؤ، دے دو۔کسی طرح تمھاری عزت تو بنے رہے، لیکن قرض سمجھ کر مت دو، یہ سمجھ لو کہ پانی میں پھینک دینے ہیں۔''

مجھے آم کھانے سے کام تھا، پیڑ گننے سے نہیں۔ چپکے سے روپے لا کر اُماپتی کو دے دیے پھر واپسی میں آ کر روپے دے جانے کا یقین دلا کر وہ چل دیے۔

ساتویں دن شام کو وہ گھر سے لوٹ آئے۔اُن کی بیوی اور لڑکی بھی ساتھ تھیں۔میری بیوی نے شکر اور دہی کھلا کر اُن کا استقبال کیا۔منہ دکھائی کے بیس روپے دیے۔اُن کی لڑکی کو بھی مٹھائی کھانے کو دو روپے دیے۔ میں نے سمجھا تھا، اُماپتی آتے ہی میرے روپے گننے لگیں گے۔لیکن اُنھوں نے پہر رات گئے تک روپے کا نام بھی نہیں لیا۔جب میں گھر میں سونے گیا تو بیوی سے کہا۔

''انھوں نے تو روپے نہیں دیے جی!''

بیوی نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا: ''تو کیا سچ مچ تمھیں اُمید تھی کہ وہ آتے ہی تمھارے ہاتھ میں روپے رکھ دیں گے؟ میں نے تو تم سے پہلے کہہ دیا تھا کہ پھر ملنے کی اُمید سے روپے مت دو۔ یہی سمجھ لو کہ کسی دوست کی مدد کر رہے ہو۔ لیکن تم بھی عجب آدمی ہو۔''

میں شرمندہ اور چپ ہو گیا۔ اُماپتی جی دو دن رہے۔ میری بیوی اُن کا مناسب استقبال اور مہمان داری کرتی رہی، لیکن مجھے اطمینان نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ انھوں نے مجھے دھوکہ دیا۔

تیسرے دن صبح وہ چلنے کو تیار ہوئے، مجھے اب بھی اُمید تھی کہ وہ روپے دے کر جائیں گے۔ لیکن جب اُن کی نئی رام کہانی سنی تو سناٹے میں آ گیا۔ وہ اپنا بستر باندھتے ہوئے بولے:

''بڑا ہی افسوس ہے کہ میں اب کی بار آپ کے روپے نہ دے سکا۔ بات یہ ہے کہ مکان پر والد سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ وہ تحصیل وصول کرنے گاؤں چلے گئے تھے اور مجھے اتنا موقع نہ ملا کہ گاؤں تک جاتا۔ ریل کا راستہ نہیں ہے، بیل گاڑی پر جانا پڑتا ہے۔ اس لیے میں ایک دن مکان پر رہ کر سسرال چلا گیا۔ وہاں سب روپے خرچ ہو گئے، بدائی کے روپے نہ مل جاتے تو یہاں تک آنا مشکل تھا۔ اب میرے پاس ریل کا کرایہ تک نہیں ہے۔ آپ مجھے پچیس روپے اور دے دیں۔ میں وہاں جاتے ہی بھیج دوں گا۔ میرے پاس یکہ تک کا کرایہ نہیں ہے۔''

جی میں تو آیا کہ ٹکا سا جواب دے دوں، پر اتنی بے مروّتی نہ ہو سکی۔ پھر بیوی کے پاس گیا اور روپے مانگے۔ اب کے اُنھوں نے بغیر کہے سنے روپے نکال کر میرے حوالے کر دیے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں روپے اُماپتی جی کو دے دیے۔ جب اُن کی لڑکی اور بیوی زینے سے اُتر گئیں تو اُنھوں نے بستر اُٹھایا اور مجھے پرنام کیا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سر ہلا کر جواب دیا، اُنھیں سڑک تک پہنچانے کو بھی نہ گیا۔

ایک ہفتے کے بعد اُماپتی جی نے لکھا: ''میں کسی کام سے برار جا رہا ہوں۔ لوٹ کر روپے بھیجوں گا۔''

پندرہ دن بعد ایک خط لکھ کر خیریت دریافت کی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ سولہ دن کے بعد پھر روپے کا تقاضہ کیا۔ اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ ایک مہینے کے بعد پھر تقاضہ کیا۔ اُس کا بھی یہی حال! ایک رجسٹر خط بھیجا، وہ پہنچ گیا، اس میں شک نہیں۔ لیکن جواب اس کا بھی نہ آیا۔ سمجھ گیا، سمجھ دار بیوی نے جو کچھ کہا لفظ بہ لفظ سچ تھا! مایوس ہو کر چپ ہو رہا۔

ان خطوط کا میں نے شریکِ حیات سے ذکر بھی نہ کیا اور نہ اُس نے اس بارے میں پوچھا۔

اس نامناسب سلوک کا مجھ پر وہی اثر پڑا جو عام طور پر ہونا چاہیے۔ کوئی اعلیٰ و پاک روح اس فریب پر بھی اٹل رہ سکتی تھی؟ اُسے یہ سمجھ کر اطمینان ہو سکتا تھا کہ میں نے اپنے فرض کو پورا کر دیا۔ مگر قرض دار نے قرض ادا نہیں کیا تو میرا کیا قصور۔ پر میں اتنا دل والا نہیں ہوں۔ یہاں تو مہینوں سر کھپاتا ہوں، قلم گھستا ہوں، تب جا کر کہیں نقد نارائن کے درشن ہوتے ہیں۔

اسی مہینے کی بات ہے۔ میرے تار گھر میں ایک کمپوزیٹر بہار صوبے کا آیا۔ کام میں ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُسے پندرہ روپے ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ پہلے کسی انگریزی اسکول میں پڑھتا تھا، مالی حالت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ پڑھنا چھوڑ بیٹھا تھا۔ گھر والوں نے کسی طرح کی مدد کرنے سے انکار کر دیا، مجبوراً اس نے زندگی گزارنے کے لیے یہ پیشہ اختیار کیا۔ کوئی سترہ اُٹھارہ برس کی عمر تھی۔ طبیعت کا سنجیدہ، بات چیت بہت سلیقے سے کرتا تھا۔ یہاں آنے کے تیسرے دن بخار آنے لگا۔ دو چار دن تو جیسے تیسے کاٹے لیکن جب بخار نہ اُترا تو گھبرا گیا۔ گھر کی یاد آئی۔ اور کچھ نہیں تو گھر والے دوا دارو بھی نہیں کریں گے۔ میرے پاس آ کر بولا:
''مہاشے، میں بیمار ہو گیا ہوں۔ آپ کچھ روپے دے دیں تو گھر چلا جاؤں۔ وہاں جاتے ہی روپے کا انتظام کر کے بھیج دوں گا۔'' وہ واقعی بیمار تھا، میں اس سے خوب واقف تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ یہاں رہ کر کبھی صحت یاب نہیں ہو سکتا۔ اس کو بیچ مدد کی ضرورت تھی لیکن مجھے شک ہوا کہ کہیں یہ روپے بھی ہضم نہ کر جائے۔ جب ایک پختہ خیال اور تعلیم یافتہ شخص دھوکہ دے سکتا ہے تو ایسے کم تعلیم یافتہ نوجوان سے کیسے یہ اُمید کی جائے کہ وہ اپنے قول کا پاس کرے گا؟

میں کئی منٹ تک بڑی اُلجھن میں پڑا رہا۔ آخر میں بولا: ''بھائی تمھاری حالت پر بہت دُکھ ہے، مگر اس وقت کچھ نہیں کر سکوں گا۔ بالکل خالی ہاتھ ہوں، مجبوری ہے۔''

یہ کورا جواب سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ وہ بولا: ''آپ چاہیں تو کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کر سکتے ہیں۔ میں جاتے ہی آپ کو روپے بھیج دوں گا۔''

میں نے دل میں کہا: 'یہاں تمھاری نیت صاف ہے، لیکن گھر پہنچ کر بھی یہی نیت رہے گی، اس کا کیا ثبوت ہے؟ نیت صاف رہنے پر بھی میرے روپے دے سکو گے یا نہیں یہ کون جانے؟ کم سے کم تم سے وصول کرنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، پھر میں نے کہا: ''اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ یہاں تمھاری جتنی تنخواہ نکلتی ہو، وہ لے سکتے ہو۔''

اس نے کچھ جواب نہیں دیا، یتیموں کی طرح ایک بار آسمان کی طرف دیکھا اور چلا گیا۔ میرے دل میں سخت تکلیف ہوئی۔ اپنی خود غرضی پر شرمندگی ہوئی لیکن آخر میں نے جو فیصلہ کیا

تھا اُسی پر قائم رہا۔ اس خیال سے مطمئن ہوگیا کہ میں کہاں کا مالدار ہوں جو یوں روپے پانی میں پھینکتا رہوں۔ یہ ہے اس فریب کا نتیجہ، جو میرے کوِی (شاعر) دوست نے میرے ساتھ کیا۔
معلوم نہیں آگے چل کر اس بے دردی کا کیا بُرا انجام ہوتا پر اس کی نوبت نہ آئی۔ خدا کو مجھے اس بُرائی سے بچانا منظور تھا۔ جب وہ آنکھوں میں آنسو بھرے میرے پاس سے چلا تو دفتر کے ایک کلرک پنڈت پرتھوی ناتھ سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ پنڈت جی نے اس سے خیریت دریافت کی۔ پورا حال سننے کے بعد کسی آگے پیچھے کے اُنھوں نے پندرہ روپے نکال کر اُسے دے دیے۔ یہ روپے اُنھیں دفتر کے منیم سے قرض لینے پڑے مجھے وہ حال معلوم ہوا تو دل کے اوپر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ اب وہ بیچارا مزے سے اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ یہ اطمینان مفت میں مل گیا۔ کچھ اپنی پستی پر شرمندگی بھی آئی۔ میں لمبے لمبے مضمونوں میں رحم، انسانیت اور نیک سلوک کا بیان کیا کرتا تھا۔ پر موقع پڑنے پر صاف جان بچا کر نکل گیا! اور یہ بیچارا کلرک جو میرے مضمونوں کا بھگت تھا، اتنا رحم دل اور سخی نکلا! اُستاد گڑ ہی رہے، شاگرد شکر ہوگیا۔ خیر، اس میں بھی طرح یہ سکون تھا کہ میرے وعظوں کا اثر مجھ پر نہ ہوا نہ سہی، دوسروں پر تو ہوا! چراغ کے تلے اندھیرا رہا تو کیا ہوا، اس کی روشنی تو پھیل رہی ہے! پر کہیں بچا کو دام نہ ملے (اور شاید ہی ملیں، اس کی بہت کم اُمید ہے) تو خوب کودیں گے۔ حضرت کو خوب آڑے ہاتھوں لوں گا۔
لیکن میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ پانچویں دن روپے آگئے۔ ایسی آنکھیں کھول دینے والی اذیت مجھے اور کبھی نہیں ملی تھی۔ خیریت یہی تھی کہ میں نے اس حادثہ کا ذکر بیوی سے نہیں کیا۔ نہیں تو مجھے گھر میں رہنا بھی مشکل ہو جاتا۔

مندرجۂ بالا قصہ لکھ کر میں نے ایک رسالے میں بھیج دیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ عوام کے سامنے چھل دفریب کے غلط انجام کا منظر پیش کروں۔ مجھے خواب میں بھی اُمید نہ تھی کہ کوئی مثبت نتیجہ نکلے گا، اس لیے کہ جب چوتھے دن اچانک میرے پاس ۷۵ روپے کا منی آرڈر پہنچا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بھیجنے والے وہی حضرت تھے — اُماپتی۔ کوپن پر صرف لکھا تھا۔ ''معافی'' میں نے روپے لے جا کر بیوی کے ہاتھوں میں رکھ دیے اور کوپن دکھایا۔
اس نے بے دلی کے انداز سے کہا: ''انھیں لے جا کر صندوق میں رکھو۔ تم ایسے لالچی قسم کے انسان ہو، یہ مجھے آج معلوم ہوا۔ تھوڑے سے روپے کے لیے کسی کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ جانا انسانیت نہیں ہے۔ جب کوئی پختہ خیال اور تعلیم یافتہ شخص قول کا پاس نہ کرے تو سمجھ لینا چاہیے کہ کسی مجبوری میں ہے۔ مجبور انسان کو بار بار تقاضوں سے شرمندہ کرنا انسانیت کے منافی

ہے۔ کوئی انسان، جس کا ضمیر مرا نہ ہو کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ ان روپیوں کو میں تب تک اپنے پاس نہ رکھوں گی جب تک اُماپتی کا کوئی خط نہ آ جائے گا کہ کیوں روپے بھیجنے میں اتنی دیر ہوئی۔"

پر اس وقت میں ایسی باتیں سننے کو تیار نہ تھا۔ ڈوبی ہوئی رقم مل گئی، اس خوشی سے پھولوں نہ سماتا تھا۔

O

جس اسکول کا میں ہیڈ ماسٹر تھا اس کے منیجر مہاشے کانشی ناتھ بھی ایک ادیب تھے۔ ان کی ایک کتاب کا تبصرہ میں نے کیا تھا۔ مگر اسکول میں انتظام کے بارے میں ہمارے اختلافات ہوگئے۔ میں تنگ آگیا اور میں نے اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے استعفیٰ دے دیا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں کانپور سے بنارس واپسی۔ پریم آشرم (گوشۂ عافیت) کے کئی تبصرے شائع ہوچکے تھے۔ جولائی ۱۹۲۲ء تک ایک ہزار کاپیاں بک چکی تھیں۔ شیو پرشاد گپت نے کاشی وِدیا پیٹھ میں ہیڈ ماسٹری کا انتظام کردیا تھا۔

پرانی خواہش تھی کہ رہائش کے لیے اپنا مکان ہو اور معاش کے لیے اپنا ایک پریس جہاں سے اپنا رسالہ شائع ہو اور اپنی کتابیں بھی۔ لمہی میں مکان کی تعمیر شروع کی۔ دو ہزار لگا مگر فرش اور پلاسٹر باقی تھی۔ ہاں گزر کے لیے کافی تھا۔ ادھر پریس لگانے کی فکر تھی۔ سوتیلے بھائی مہتاب رائے چچیرے بھائی بلدیو لال اور دوست فراق گورکھپوری صاحب کی شرکت میں پریس کا پلان بنا۔ ہر ایک نے ۲۲۵۰ روپے لگائے۔ کبھی لمہی جانا ہوتا، کبھی بنارس میں آشابھون جہاں مہتاب رائے رہتے تھے۔ نئے ناول "چوگانِ ہستی" پر کام شروع ہوا۔ کبھی بنارس کبھی لمہی میں۔ ۳/ جولائی ۱۹۲۳ء کو وِدیا پیٹھ کی نوکری ختم ہوئی۔ ۲۰/ جولائی کو سرسوتی پریس کا افتتاح ہوا۔ آٹھ ہزار کا تخمینہ تھا۔ پانچ سو زائد خرچ ہوا۔ خالی ہاتھ پریس کا کام شروع ہوا۔ غیر تجربہ کاری سے ایسے لوگوں کے کام ہاتھ میں لیے جن کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ایک سال تک آمدنی بالکل نہیں ہوئی۔ گھاٹا ہی گھاٹا۔ جن لوگوں کا سرمایہ پریس میں لگا تھا وہ پریشان تھے۔ مہتاب رائے نے دوبارہ نوکری تلاش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ پریس نے مجھے اس قدر پریشان کر رکھا تھا کہ میں تنگ آگیا۔ وہ برا وقت تھا جب میرے سر پر سودائے خام سمایا۔ ۲۰۰۰ روپے بقایا پڑے تھے اور اس کے وصول ہونے میں ابھی نہ جانے کتنی دیر تھی۔ ادھر مجھ پر ۵۰۰ روپیہ ٹائپ کے ۳۰۰ روپیہ کاغذ کے اور ۲۰۰ روپیہ کرایہ مکان سوار تھے۔ میں یہ متفرق رقوم نہ جانے کب دے پاؤں گا مگر یہ تقاضے والے کب چین لینے دیتے ہیں۔ دو کتابیں (خود) شائع کیں مگر امید کے

خلاف ایک کتاب بھی تیار نہ ہوئی۔ میں نے سوچا تھا ستمبر اکتوبر تک دونوں کتابیں تیّار ہوجائیں گی اور بقایا وصول ہوجائے گا۔ کتابیں بک جائیں گی اور روپے کی قلّت رفع ہوجائے گی مگر وہ سارے منصوبے ہوا ہوگئے۔ نہ کتابیں تیار ہوئیں نہ بقایا رقم وصول۔ بلکہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ بڑھتا گیا۔ ادھر کوشش تھی کہ کسی بک سیلر سے معاملہ طے کرکے یہ سب چھپی ہوئی جلدیں لاگت پر دے کر اپنے تقاضہ داروں کو ادا کردوں اور بقایا رفتہ رفتہ وصول ہوتا رہے۔

اس دوران لکھنؤ کے گنگا پستک مالا کے بانی دلارے لال بھارگو نے بلایا، انھیں ایک ادبی معاون کی ضرورت تھی۔ تنخواہ تھی ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار۔ اسے منظور کیا۔ چوگانِ ہستی اپریل ۱۹۲۹ء میں ختم ہوا۔ اس کا ہندی ترجمہ اگست ۱۹۲۴ء میں تیّار ہوا۔ اسے دلارے لال بھارگو نے شائع کیا۔ اٹھارہ سو روپے کا وعدہ کیا گیا۔ ناول شیو پوجن سہائے کو دیا گیا۔ فوراً شائع کرنے کا حکم تھا۔ فروری ۱۹۲۵ء میں یہ شائع ہوگیا۔ یہ سب سے بڑا ناول تھا اور سب سے اعلی۔

جب "چوگانِ ہستی" لکھا جارہا تھا تب ایک ڈراما "کربلا" بھی لکھا۔ اس کا پس منظر ایک طرح سے سیاسی تھا۔ جب مہاتما گاندھی نے چورا چوری مقام پر پولیس اسٹیشن کو جلادینے پر ترک موالات تحریک واپس لے لی تو ایک سیاسی خلا پیدا ہوگیا۔ انگریزی حکمراں نے اس کا فائدہ اُٹھایا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات کو شہ دی۔ اس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ اس سے قبل محمد علی اور شوکت علی برادران (رام لکھن کی جوڑی) میں حیرت انگیز انقلاب ہوا تھا۔ ہندو مسلم اتّحاد کے لیے اب ضروری تھا کہ دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں ٹھیک جانکاری حاصل کریں۔ خواجہ حسن نظامی نے کرشن کی زندگی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ عنوان تھا "کرشن بیتی" ہندوؤں کو بھی حضرت حسین کی شہادت کے بارے میں ضروری اطلاع ملنی چاہیے۔ حضرت حسین کے ہمراہ کچھ ہندو عناصر بھی تھے جو شہید ہوئے تھے۔ بس اسی اہم سانحہ پر "کربلا" پیش کیا گیا۔ ایک پریم پرچارک کی حیثیت سے میرا عقیدہ تھا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی سوسائٹی کی فوری حالت کا اظہار ہی نہیں بلکہ یہ ایک مجلسی یا مکمل بیماری ہے۔ جو سوسائٹی کا ایک عارضی عارضہ ہے جیسے انسان کی بیماری کُلّی معیاد عموماً چند دنوں یا چند مہینوں تک رہتی ہے اور اس کے بعد مریض یا تو لقمۂ اجل ہوتا ہے یا صحت حاصل کرلیتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کی خانہ جنگی اور کشیدگی کی بھی ایک حد ہوتی ہے جس کے پہنچنے پر لوگ روزانہ لڑائی جھگڑوں سے تنگ آکر ان سے متنفّر ہوجاتے ہیں۔ یا خود بخود ایسے اسباب پیدا ہوجاتے ہیں جن سے فریقین اپنے تنازعات مصالحت سے طے کرنے کے لیے رضامند ہوجاتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے آسمان پر فرقہ وارانہ جنگجوئی اور کشیدگی کے جو بادل دکھلائی دیتے ہیں اور

ہندو مسلم عناد و کدورت کا جو طوفان سارے ملک کو تباہ و برباد کررہا ہے۔ اس کی بھی آخر کوئی حد ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں مختلف اقوام و مذہب کی باہمی کشمکش اور تعصّب کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دو سو سال سے کم عرصہ ہوا ہے کہ یورپ کے ملک فرانس، نیدر لینڈ، انگلینڈ وغیرہ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار تھے۔ چند سال پیشتر آئر لینڈ میں ایسٹر کا فتنہ و فساد اور سین فین کی بغاوت ایسی شکل اختیار کیے ہوئے تھے کہ اس کے مقابلے ہندو مسلم کشیدگی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن آج ان تمام ممالک کے باشندے خلوص و محبت سے زندگی بسر کررہے ہیں۔ ہندستان کے دن بھی ضرور بدلیں گے۔ ۱۱/جولائی کو دہلی میں دیش بندھو داس کی سالگرہ کے سلسلے میں ایک جلسہ ہوا جس میں ڈاکٹر انصاری صاحب نے اعلان کیا کہ آج سے وہ آنجہانی مسٹر داس کے نقش قدم پر چل کر کسی فرقہ وارانہ کمیٹی مثلاً مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے ممبر نہیں رہیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ میرا مذہب سوراج ہے اور لوگوں سے التجا کی کہ ہندستان کی نجات کے لیے سب لوگ ساتھ مل کر کام کریں۔ اگر ہر ایک صوبہ سے ایک درجن ایسے سرگرم سچے محب وطن میدانِ عمل میں نکل آئیں جو اپنے قول و فعل سے عوام پر ثابت کردیں کہ ملک کا نجات فقط محبت باہمی اور ایک دوسرے کی خاطر قربانی و نفس کشی میں ہے تو یقیناً چند ماہ کے اندر تمام ملک کی فضا بدل جائے گی۔ ''کربلا'' ڈراما کے علاوہ کئی قصّے بھی لکھے جیسے عفو، نبی کا نیتی نرواہ، حج اکبر، شدھی، فاتحہ، دیر و حرم وغیرہ۔

دیر و حرم

چودھری عطر علی کٹڑے کے بڑے زمیندار تھے۔ ان کے بزرگوں نے شاہی زمانے میں انگریزی سرکار کی بڑی بڑی خدمتیں کی تھیں۔ اپنے عمدہ انتظام سے انھوں نے اپنی ملکیت اور بھی بڑھالی تھی اور اب اس علاقہ میں ان سے زیادہ دھنی مان کوئی آدمی نہ تھا۔ انگریز حکام جب علاقے میں دورہ کرنے جاتے تو چودھری صاحب کی مزاج پُرسی کے لیے ضرور آتے۔ چودھری صاحب خود کسی حاکم کو سلام کرنے نہیں جاتے تھے، چاہے وہ کمشنر ہی کیوں نہ ہو۔ کسی اجلاس دربار میں بھی نہیں جاتے۔ کسی حاکم کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور اس کی ہر بات پر جی حضور کرنا، اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا کسی معاملے مقدمے میں بھی وہ نہیں پڑتے تھے۔ چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ یہ کام سولھوں آنے مختاروں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک کے سو کریں یا سو کا ایک۔ فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ شرع کے بڑے پابند تھے، سود کو حرام سمجھتے تھے۔ پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے، تیسوں روزے رکھتے،

اور ہر روز قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ مگر مذہبی تعصب انھیں کہیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ علی الصبح گنگا اشنان کرنا ان کا روز کا معمول تھا۔ پانی برسے پالا پڑے مگر پانچ بجے وہ کوس بھر چل کر گنگا کے کنارے پر ضرور پہنچ جاتے اور لوٹتے وقت چاندی کی صراحی گنگا جل سے بھر لیتے اور ہمیشہ گنگا جل پیتے۔ گنگا جل کے سوا وہ اور کوئی پانی پیتے ہی نہیں تھے، شاید کوئی جوگی بھی گنگا جل پر اتنا اعتقاد نہ رکھتا ہوگا۔ اُن کا سارا گھر اندر سے باہر تک ساتویں دن گائے کے گوبر سے لیپا جاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں ان کے یہاں باغیچے میں ایک پنڈت بارہ مہینے دُرگا پاٹھ بھی کیا کرتے تھے۔ سادھو سنیاسیوں کا استقبال تو ان کے یہاں جتنی فراخ دلی اور بھگتی سے کیا جاتا، اس پر راجوں مہاراجوں کو بھی حیرت ہوتی تھی۔ یوں کہیے کہ سدابرت چلتا رہتا تھا۔ ادھر مسلمان فقیروں کا کھانا باورچی خانے میں پکتا تھا اور کوئی سوسوا سو آدمی ہر روز ایک دسترخوان پر کھاتے تھے۔ اتنا دان پن کرنے پر بھی ان پر کسی مہاجن کا ایک کوڑی کا قرض نہیں تھا۔ نیت کی کچھ ایسی برکت تھی کہ دن بدن ترقی ہوتی تھی۔ ان کی ریاست میں عام حکم تھا کہ مُردوں کو جلانے کے لیے، کسی یگیہ یا بھوج کے لیے یا شادی بیاہ کے لیے سرکاری جنگل سے جتنی لکڑی چاہے کاٹ نے لے، چودھری صاحب سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ہندو آسامیوں کی بارات میں ان کی جانب سے کوئی نہ کوئی ضرور شریک ہوتا تھا۔ نوید کے روپے بندھے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کی شادی میں کنیا دان کے روپے مقرر تھے۔ اُن کو ہاتھی گھوڑے تمبو، شامیانے، پالکی نالکی، فرش جاجمیں، پنکھے، چنور، چاندی کے مخملی سامان ان کے یہاں سے بغیر کسی دقت کے مل جاتے تھے، بس مانگنے بھر کی دیر رہتی تھی۔ اس دانی، فراخ دل، مشہور آدمی کے لیے رعایا جان دینے کو تیار رہتی تھی۔

چودھری صاحب کے پاس ایک راجپوت چپراسی تھا بھجن لال، پورے چھ فٹ کا جوان تھا۔ چوڑا سینہ، بانے کا لٹھیت، سینکڑوں کے بیچ سے مار کر نکل آنے والا، اسے بھئے تو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ چودھری صاحب کو اس پر پورا بھروسہ تھا۔ یہاں تک کہ جب حج کرنے گئے تو اسے بھی ساتھ لے گئے۔ اُن کے دشمنوں کی بھی کمی نہ تھی، آس پاس کے سبھی زمیندار ان کی طاقت اور شہرت سے جلتے تھے۔ چودھری صاحب کے خوف کے مارے وہ اسامیوں پر من مانا ظلم نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ کمزوروں کی حمایت کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اگر بھجن سنگھ ساتھ ہو تو انھیں دشمنوں کے دروازے پر سونے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دشمنوں نے انھیں گھیر لیا تو بھجن سنگھ اکیلا جان پر کھیل کر انھیں بے داغ نکال لایا۔ ایسا آگ میں کود

پڑنے والا آدمی بھی کسی نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ وہ کہیں باہر چلا جاتا تو جب تک خیریت سے گھر نہیں پہنچ جاتا چودھری صاحب کو فکر رہتی کہ کہیں کسی سے وہ لڑنہ بیٹھا ہو۔ بس پالتو مینڈھے کی سی حالت تھی۔ جو زنجیر سے چھوٹتے ہی کسی نہ کسی سے ٹکر لینے دوڑتا ہو۔ تینوں لوک میں چودھری صاحب کے سوا اس کی نگاہ میں کوئی اور تھا ہی نہیں۔

بادشاہ کہو، مالک کہو، دیوتا کہو، جو کچھ تھے بس چودھری صاحب ہی تھے۔ مسلمان لوگ چودھری صاحب سے جلا کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے دین سے پھر گئے ہیں۔ ایسا عجیب زندگی کا معیار ان کی سمجھ میں کیونکر آتا۔ مسلمان اگر سچا مسلمان ہے تو گنگا جل کیوں پیے، سادھوؤں کا استقبال کیوں کرے۔ دُرگا پاٹھ کیوں کروائے۔ ملاؤں میں ان کے خلاف ہنڈیا پکتی رہتی تھی اور ہندوؤں کو زک دینے کی تیاری ہوتی رہتی تھی۔ آخر یہ رائے طے پائی کہ عین جنم اشٹمی کے دن ٹھاکر دوارے پر حملہ کیا جائے اور ہندوؤں کا سر نیچا کر دیا جائے۔ انھیں دکھا دیا جائے کہ چودھری صاحب کی طاقت پر پھولے پھولے پھرنا تمھاری بھول ہے۔ چودھری صاحب کر ہی کیا لیں گے۔ اگر انھوں نے ہندوؤں کی حمایت کی تو ان کی بھی خبر لی جائے گی۔ سارا ہندو پن نکل جائے گا۔

اندھیری رات تھی۔ کٹرے کے ٹھاکر دوار میں کرشن کا جنم اُتسو منایا جا رہا تھا۔ ایک بزرگ مہاتما پوپلے منہ سے طنبورے پر دُھر پد الاپ رہے تھے اور بھگت جی ڈھول مجیرے لیے بیٹھے تھے کہ ان کا گانا بند ہو، تو ہم اپنا کیرتن شروع کریں۔ بھنڈاری پرساد بنا رہا تھا۔ سینکڑوں آدمی تماشا دیکھنے کے لیے جمع تھے۔

اچانک مسلمانوں کا ایک گروہ لاٹھیاں لیے ہوئے آ پہنچا اور مندر پر پتھر برسانا شروع کیا۔ شور مچ گیا پتھر کہاں سے آتے ہیں، یہ پتھر کون پھینک رہا ہے۔ کچھ لوگ مندر کے باہر نکل کر دیکھنے لگے، مسلمان لوگ تو تاک میں بیٹھے ہی تھے، لاٹھیاں جمانا شروع کیں۔ ہندوؤں کے ہاتھ میں اُس وقت ڈھول مجیرے کے سوا اور کیا تھا۔ کوئی مندر میں آ چھپا، کوئی دوسری طرف بھاگا۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔

چودھری صاحب کو خبر ہوئی بھجن سنگھ سے بولے: ''ٹھاکر، دیکھو تو کیا شور و غل ہے۔ جا کر بدمعاشوں کو سمجھاؤ اور نہ مانیں تو دو چار ہاتھ چلا دینا، مگر خون خچر نہ ہونے پائے۔'' ٹھاکر یہ شور سن کر دانت پیس رہے تھے۔ دل پر پتھر کی سل رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ حکم ہوا تو منہ مانگی مراد پائی۔ دشمن کو پراست کرنے والا ڈنڈا کندھے پر رکھا اور لپکے ہوئے مندر پہنچے۔ یہاں

مسلمانوں نے خوب واویلا مچا رکھا تھا۔ کئی آدمیوں کا پیچھا کرتے ہوئے مندر میں گھس گئے اور شیشے کے سامان کو توڑ پھوڑ رہے تھے۔

ٹھاکر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ سر پر خون سوار ہو گیا۔ للکارتے ہوئے مندر میں گھس گئے اور بدمعاشوں کو پیٹنا شروع کیا۔ ایک طرف تو وہ اکیلا اور دوسری طرف پچاس آدمی۔ لیکن واہ رے شیر اکیلے سب کے چھکّے چھڑا دیے۔ کئی آدمیوں کو مار گرایا۔ غصّے میں اسے اس وقت کچھ نہ سوجھتا تھا۔ کسی کے مرنے جینے کی پروا نہ تھی۔ معلوم نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ اسے ایسا جان پڑتا تھا کہ کوئی دیوی طاقت میری مدد کر رہی ہے۔ کرشن بھگوان خود اس کی حفاظت کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مذہبی جنگ میں آدمیوں سے عجیب و غریب کام ہو جاتے ہیں۔

اُدھر ٹھاکر کے چلے جانے کے بعد چودھری صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ٹھاکر کسی کا خون نہ کر ڈالے۔ اس کے پیچھے خود بھی آ پہنچے، دیکھا کہرام مچا ہوا ہے، بدمعاش لوگ اپنی جان لے لے کر بے تحاشا بھاگے جا رہے ہیں۔ کوئی پڑا کراہ رہا ہے، کوئی ہائے ہائے کر رہا ہے۔ ٹھاکر کو پکارنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک ایک آدمی بھاگا ہوا آیا اور اُن کے سامنے آتے آتے زمین پر گر پڑا۔ چودھری صاحب نے اسے پہچان لیا اور دنیا اُن کی آنکھوں میں اندھیری ہو گئی۔ یہ ان کا اکلوتا داماد اور ان کی جائداد کا وارث شاہد حسین تھا۔

چودھری نے دوڑ کر شاہد کو سنبھالا اور زور سے بولے: ''ٹھاکر اِدھر آؤ۔ لالٹین، لالٹین! آہ، یہ تو میرا شاہد ہے۔'' ٹھاکر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لالٹین لے کر باہر نکلے، شاہد حسین ہی تھے۔ اُن کا سر کٹ گیا تھا اور خون اُچھلتا ہوا نکل رہا تھا۔

چودھری نے سر پیٹتے ہوئے کہا: ''ٹھاکر، تم نے تو میرا چراغ ہی گل کر دیا۔'' ٹھاکر نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا: ''مالک بھگوان جانتے ہیں میں نے پہچانا نہیں۔''

چودھری: ''نہیں، میں تمھارے اُوپر الزام نہیں رکھتا۔ بھگوان کے مندر میں کسی کو گھسنے کا اختیار نہیں ہے۔ افسوس یہی ہے کہ خاندان کا نشان مٹ گیا اور وہ بھی تمھارے ہاتھوں۔ تم نے ہمیشہ میرے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی اور خدا نے تمھارے ہی ہاتھوں میرا ستیاناس کرا دیا۔''

چودھری صاحب روئے جاتے تھے اور یہ باتیں کہتے جاتے تھے۔ ٹھاکر ندامت اور افسوس سے گڑا جاتا تھا۔ اگر اس کا اپنا لڑکا مارا گیا ہوتا تو اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ آہ میرے ہاتھوں ہی میرے مالک کا سرو ناش ہوا، جس کے پسینے کی جگہ وہ خون بہانے کو تیار تھا جو اس کا مالک ہی نہیں دیوتا تھا جس کے ذرا سے اشارے پر وہ آگ میں کود سکتا تھا۔ اس کے خاندان

کی اس نے جڑ کاٹ دی۔ وہ اس کی آستین کا سانپ نکلا۔ رُندھے ہوئے گلے سے بولا:
''سرکار مجھ سے بڑھ کر بدقسمت اور کون ہوگا۔ میرے منہ میں کالک لگ گئی۔''

یہ کہتے ہوئے ٹھاکر نے کمر سے چھرا نکال لیا۔ وہ اپنی چھاتی میں چھرا گھونپ کر کالک کو اپنے خون سے دھونا چاہتا تھا۔ چودھری صاحب نے لپک کر چھرا اس کے ہاتھ سے چھین لیا، اور بولے: ''کیا کرتے ہو، ہوش سنبھالو۔ یہ تقدیر کے فرشتے ہیں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، خدا کو جو منظور تھا وہی ہوا۔ میں اگر خود شیطان کے بہکاوے میں آ کر مندر میں گھستا اور دیوتا کی توہین کرتا اور تم پہچان کر قتل کر دیتے تو میں اپنا خون بھی معاف کر دیتا۔ کسی کے دین کی توہین کرنے سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ چاہے میرے مالک کا بیٹا ہی کیوں نہ ہوتا۔ گھر والے مجھے طعنوں سے چھیدیں گے۔ لڑکی رو رو کر مجھ سے خون کا بدلہ مانگے گی۔ سارے مسلمان میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ میں کافر بے دین کہا جاؤں گا۔ شاید کوئی دین کا پکا نوجوان مجھے قتل کرنے پر بھی تیار ہو جائے، لیکن میں حق سے منہ نہ موڑوں گا۔ اندھیری رات ہے اسی وقت یہاں سے بھاگ جاؤ اور میرے علاقے میں کسی چھاونی میں چھپ جاؤ۔ وہ دیکھو کئی مسلمان چلے آ رہے ہیں۔ میرے گھر والے بھی ہیں بھاگو۔ بھاگو۔''

سال بھر بھجن سنگھ چودھری صاحب کے علاقے میں چھپا رہا۔ ایک طرف مسلمان لوگ اس کی تلاش میں لگے رہتے تھے، دوسری طرف پولیس لیکن چودھری اسے ہمیشہ چھپاتے رہتے۔ اپنے سماج کے طعنے سہے۔ اپنے گھر والوں کا ترسکار سہا، پولیس کے وار سہے، مسلمانوں کی دھمکیاں سہیں۔ مگر بھجن سنگھ کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہونے دی۔ ایسے وفادار خادم کو وہ جیتے جی بے رحمی سے قانون کے پنجے میں نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان کے علاقے کی چھاؤنیوں میں کئی بار تلاشیاں ہوئیں۔ ملاؤں نے گھر کے ماماؤں، نوکروں، لونڈیوں کو ملایا۔ لیکن چودھری نے ٹھاکر کو اپنے احسانوں کی طرح چھپائے رکھا۔

لیکن ٹھاکر کو اپنی جان کی حفاظت کے لیے چودھری کو پریشانی میں پڑے دیکھ کر نا قابلِ برداشت تکلیف ہوتی تھی اس کے جی میں بار بار آتا کہ چل کر مالک سے کہہ دو مجھے پولیس کے حوالے کر دیجیے۔ مگر چودھری صاحب بار بار اسے چھپے رہنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔

جاڑوں کے دن تھے۔ چودھری صاحب اب اپنے مکان پر بہت کم رہتے تھے۔ گھر والوں کے طعنوں سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ رات کو کھانا کھا کر لیٹے ہی تھے کہ بھجن سنگھ آ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ چودھری صاحب دیکھ کر چونک

پڑے۔

ٹھاکر نے کہا: ”سرکار اچھی طرح ہیں۔“

چودھری: ”خدا کا فضل ہے تم تو بالکل پہچانے ہی نہیں جاتے۔ اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟“

ٹھاکر: ”مالک اب تو چھپ کر نہیں رہا جاتا۔ حکم ہو تو عدالت میں جا کر حاضر ہو جاؤں۔ جو قسمت میں لکھا ہو گا وہ ہو گا۔ میری وجہ سے آپ کو اتنی پریشانی ہو رہی ہے یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔“

چودھری: ”نہیں ٹھاکر میرے جیتے جی نہیں۔ میں تمھیں جان بوجھ کر بھاڑ میں نہیں ڈال سکتا۔ پولیس اپنی مرضی کے موافق شہادتیں بنا لے گی اور مفت میں تمھیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ تم نے میرے لیے بڑے بڑے خطرے سہے ہیں۔ اگر میں تمھارے لیے اتنا بھی نہ کر سکوں تو مجھ سے بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہو گا؟ اس بارے میں اب مجھ سے کچھ مت کہنا۔“

ٹھاکر: ”کہیں کسی نے سرکار......“

چودھری: ”اس کا بالکل غم نہ کرو۔ جب تک خدا کو منظور نہ ہو گا۔ کوئی میرا بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔ تم اب جاؤ، یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔“

ٹھاکر: ”سنتا ہوں لوگوں نے آپ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔“

چودھری: ”دشمنوں کا دور رہنا ہی اچھا۔“

لیکن ٹھاکر کے دل میں جو بات بیٹھ گئی تھی وہ نہ نکلی۔ اس ملاقات نے اس کا ارادہ اور بھی پکا کر دیا — انھیں میری وجہ سے یوں مارے مارے پھرنا پڑ رہا ہے۔ یہاں ان کا کون بیٹھا ہوا ہے؟ جو چاہے آکر حملہ کر سکتا ہے، میری اس زندگی کو لعنت۔

علی الصبح ٹھاکر ضلع حاکم کے بنگلے پر پہنچا۔ صاحب نے پوچھا: ”تم اب تک چودھری کے کہنے سے چھپا تھا!“

ٹھاکر: ”نہیں حضور اپنی جان کے خوف سے۔“

چودھری صاحب نے یہ خبر سنی تو سناٹے میں آگئے۔ اب کیا ہو؟ اگر مقدمہ کی پیروی نہ کی گئی تو ٹھاکر کا بچنا مشکل ہے۔ اور پیروی کرتے ہیں تو اسلامی دنیا میں تہلکا پڑ جاتا ہے۔ چاروں طرف سے فتوے نکلنے لگیں گے۔ اِدھر مسلمانوں نے ٹھان لی کہ اسے پھانسی دلا کر ہی

چھوڑیں گے۔ آپس میں چندہ کیا گیا۔ ملاؤں نے مسجد میں چندے کی اپیل کی۔ دوار دوار جھولی باندھ کر گھومے۔ اس پر مقدمہ کا رنگ چڑھایا گیا۔ مسلمان وکیلوں کو نام بولنے کا موقع ملا۔ آس پاس کے ضلعوں سے لوگ جہاد میں شریک ہونے کے لیے آنے لگے۔

چودھری نے بھی پیروی کرنے کا فیصلہ کیا۔ چاہے کتنی ہی آفتیں سر پر آ پڑیں۔ ٹھاکر انھیں انصاف کی نگاہ میں بے قصور معلوم ہوتا تھا اور بے قصور کی حفاظت کرنے میں انھیں کسی کا خوف نہ تھا۔ گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور شہر میں جا کر ڈیرا جمایا۔

چھ مہینے تک چودھری صاحب نے جان لڑا کر مقدمے کی پیروی کی۔ پانی کی طرح روپے بہائے۔ آندھی کی طرح دوڑے۔ وہ سب کیا جو زندگی میں کبھی نہ کیا تھا اور نہ ہی بعد میں کیا۔ اہلکاروں کی خوشامدیں کیں، وکیلوں کے ناز اُٹھائے۔ حاکموں کو نظریں دیں اور ٹھاکر کو چھڑا لیا۔ سارے علاقے میں دھوم مچ گئی۔ جس نے سنا دنگ رہ گیا۔ اسے کہتے ہیں شرافت اپنے نوکر کو پھانسی سے اُتار لیا۔

لیکن فرقہ وارانہ دشمنی نے اس سچائی کے کام کو اور ہی آنکھوں دیکھا۔ مسلمان جھلائے۔ ہندوؤں نے بغلیں بجائیں، مسلمان سمجھے ان کی رہی سہی مسلمانی بھی غائب ہوگئی ہے۔ ہندوؤں نے خیال کیا اب ان کی شدھی کر لینی چاہیے، اب اس کا موقع آ گیا ہے۔ ملاؤں نے اور زور زور سے تبلیغ کی ہانک لگانی شروع کی۔ ہندوؤں نے بھی سنگھٹن کا جھنڈا اُٹھایا۔ مسلمانوں کی مسلمانی جاگ اُٹھی اور ہندوؤں کا ہندوتو۔ ٹھاکر کے قدم بھی اس ریلے میں اُکھڑ گئے۔ من چلے تھے ہی، ہندوؤں کے مکھیا بن بیٹھے۔ زندگی میں کبھی ایک لوٹا پانی شیو جی کو نہیں چڑھایا تھا اب دیوی دیوتا کے نام پر لٹھ چلانے کے لیے تیار ہو گئے۔ شدھی کرنے کو کوئی مسلمان نہ ملا تو دو ایک چماروں ہی کی شدھی کر ڈالی۔ چودھری صاحب کے دوسرے نوکروں پر بھی اثر پڑا جو مسلمان کبھی مسجد کے سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے۔ وہ پانچوں وقت کی نماز ادا کرنے لگے۔ جو ہندو کبھی مندروں میں جھانکتے بھی نہ تھے، وہ دونوں وقت سندھیا کرنے لگے۔

بستی میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ ٹھاکر بھجن سنگھ، جن کی لاٹھی کا لوہا سب مانتے تھے، ان کے مکھیا بنے۔ اس سے پہلے مسلمان تعداد میں کم ہونے پر بھی ان پر غالب رہتے تھے۔ کیونکہ ہندو متحد نہیں تھے۔ لیکن اب وہ متحد ہو گئے تھے۔ بھلا مٹھی بھر مسلمان ان کے سامنے کیا ٹھہرتے۔

ایک سال اور گزر گیا۔ پھر جنم اشٹمی کا تیوہار آیا۔ ہندوؤں کو ابھی تک ہار نہ بھولی تھی۔ پوشیدہ طور پر تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آج صبح ہی سے مندر میں بھگت لوگ جمع ہونے لگے

سب کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ کتنے ہی آدمیوں نے کمر میں چھرا چھپالیا تھا۔ چھیڑ کر لڑنے کی رائے پکی ہوگئی تھی۔ پہلے کبھی اس اُتسو میں جلوس نہیں نکلا تھا۔ آج دھوم دھام سے جلوس بھی نکلنے کی ٹھہری۔

چراغ جل چکے تھے۔ مسجدوں میں شام کی نماز ہونے لگی تھی، جلوس نکلا۔ ہاتھی گھوڑے جھنڈے جھنڈیاں۔ باجے گاجے سب ساتھ تھے۔ آگے آگے بھجن سنگھ اپنے اکھاڑے کے پٹھوں کو لیے چلے جاتے تھے۔

جامع مسجد سامنے دکھائی دی۔ پٹھوں نے لاٹھیاں سنبھالیں۔ سب لوگ چوکنے ہوگئے۔ جو لوگ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے آکر سمٹ گئے، آپس میں کانا پھوسی ہوئی۔ باجے اور زور سے بجنے لگے۔ جے۔ جے۔ کار کی آواز اور زور سے اُٹھنے لگی۔ جلوس مسجد کے سامنے آپہنچا۔

اچانک ایک مسلمان نے مسجد سے نکل کر کہا: "نماز کا وقت ہے باجے بند کردو۔"

بھجن سنگھ: "باجے بند نہ ہوں گے۔"

مسلمان: "بند کرنے پڑیں گے۔"

بھجن سنگھ: "تم اپنی نماز کیوں نہیں بند کر دیتے۔"

مسلمان: "چودھری صاحب کے بل بوتے پر مت پھولنا۔ اب کی ہوش ٹھنڈے ہوجائیں گے۔"

بھجن سنگھ: "چودھری صاحب کے بل بوتے پر تم پھولو۔ یہاں اپنے ہی دم کا بھروسہ ہے، یہ دھرم کا معاملہ ہے۔"

اتنے میں کچھ اور مسلمان نکل آئے اور باجے بند کردینے پر زور دینے لگے۔ اُدھر اور زور سے باجے بجنے لگے۔ بات بڑھ گئی۔ ایک مولوی نے بھجن سنگھ کو کافر کہہ دیا۔ ٹھاکر نے اس کی داڑھی پکڑلی۔ پھر کیا تھا سورما لوگ نکل پڑے۔ مار پیٹ شروع ہوگئی۔ ٹھاکر ہلّا بول کر مسجد میں گھس گئے۔ اور مسجد کے اندر مار پیٹ ہونے لگی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔ ہندو کہتے تھے ہم نے کھدیڑ کھدیڑ کر مارا۔ مسلمان کہتے تھے ہم نے وہ مار ماری کہ پھر سامنے نہیں آئیں گے۔ مگر اس مباحثے کے اندر ایک بات سب مانتے تھے اور وہ تھی ٹھاکر بھجن سنگھ کی عجیب وغریب بہادری۔ مسلمانوں کا کہنا تھا کہ اگر ٹھاکر نہ ہوتا تو ہم کسی کو زندہ نہ چھوڑتے۔ ہندو کہتے تھے کہ ٹھاکر سچ مچ مہاویر کا اوتار ہے۔ اس کی لاٹھیوں نے ان سبھوں کے چھکے چھڑا دیے۔

اُنسو ختم ہو چکا تھا۔ چودھری صاحب دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ ان کا چہرہ لال تھا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے خون کی پچکاری سی نکل رہی تھی۔ خدا کا گھر ناپاک کیا گیا۔ یہ خیال رہ رہ کر ان کے کلیجے کو مسوستا تھا۔

خدا کا گھر ناپاک کیا گیا۔ ظالموں کو لڑنے کے لیے کیا نیچے میدان میں جگہ کافی نہیں تھی۔ خدا کے گھر میں یہ خون خرابہ، مسجد کی یہ بے حرمتی، مندر بھی خدا کا گھر ہے اور مسجد بھی۔ مسلمان کسی مندر کو ناپاک کرنے کے لیے جس سزا کے لائق ہیں کیا ہندو مسجد کو ناپاک کرنے کے لیے اُسی سزا کے لائق نہیں؟ اور یہ حرکت ٹھاکر نے کی۔ اسی قصور کے لیے تو اس نے میرے داماد کو قتل کیا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ اس کے ہاتھوں ایسا فعل ہوگا تو اسے پھانسی پر چڑھنے دیتا۔ کیوں اس کے لیے اتنا حیران، اتنا بدنام، اتنا زیر بار ہوتا، ٹھاکر میرا وفادار نوکر ہے، اس نے بارہا میری جان بچائی ہے، میرے پسینے کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتا تھا۔ لیکن آج اس نے خدا کے گھر کو ناپاک کیا ہے اور اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اس کی سزا کیا ہے؟ جہنم کی آگ کے سوا اس کی اور کوئی سزا نہیں ہے۔ جس نے خدا کے گھر کو ناپاک کیا، اس نے خدا کے گھر کی توہین کی، خدا کی توہین کی۔

اچانک ٹھاکر بھجن سنگھ آ کر کھڑے ہو گئے۔

چودھری صاحب نے ٹھاکر کو غصے بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا: ''تم مسجد میں گھسے تھے؟''

بھجن سنگھ: ''سرکار مولوی لوگ ہم پر ٹوٹ پڑے تھے۔''

چودھری: ''میری بات کا جواب دو جی۔ کیا تم مسجد میں گھسے تھے!''

بھجن سنگھ: ''جب ان لوگوں نے مسجد کے اندر سے ہمارے اوپر پتھر پھینکنا شروع کیا تب ہم لوگ انھیں پکڑنے کے لیے مسجد میں گھس گئے۔''

چودھری: ''جانتے ہو کہ مسجد خدا کا گھر ہے۔''

بھجن سنگھ: ''جانتا ہوں حضور۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتا۔''

چودھری: ''مسجد خدا کا ویسا ہی پاک گھر ہے جیسے مندر۔''

بھجن سنگھ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔

چودھری: ''اگر کوئی مسلمان مندر کو ناپاک کرنے کے لیے گردن زدنی ہے تو ہندو بھی مسجد کو ناپاک کرنے کے لیے گردن زدنی ہے۔''

بھجن سنگھ اس کا بھی کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس نے چودھری کو کبھی اتنے غصہ میں نہ

دیکھا تھا۔

چودھری: ''تم نے میرے داماد کا قتل کیا اور میں نے تمھاری پیروی کی۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ میں اپنے داماد کو اس سزا کے لائق سمجھتا تھا جو تم نے اُسے دی۔ اگر تم نے میرے بیٹے کو یا سبھی کو اس قصور کے لیے مار ڈالا ہوتا تو میں تم سے خون کا بدلہ نہ مانگتا۔ وہی قصور آج تم نے کیا ہے۔ اگر کسی مسلمان نے مسجد میں تمھیں جہنم میں پہنچا دیا ہوتا تو مجھے سچی خوشی ہوتی۔ لیکن تم بے حیاؤں کی طرح یہاں سے بچ کر نکل آئے۔ کیا تم سمجھتے ہو خدا تمھیں اس فعل کی سزا نہ دے گا۔ خدا کا حکم ہے کہ جو اس کی توہین کرے اس کی گردن کاٹ دینی چاہیے۔ یہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے چور اگر سزا نہ پائے تو کیا چور نہیں ہے۔ تم مانتے ہو یا نہیں تم نے خدا کی توہین کی ہے!''

ٹھاکر اس سے انکار نہ کر سکا۔ چودھری صاحب کی صحبت نے کفر پن کو دُور کر دیا تھا بولے: ''ہاں صاحب! یہ قصور تو ہو گیا۔''

چودھری: ''اس کی جو سزا تم دے چکے ہو وہ سزا خود لینے کو تیار ہو؟''

ٹھاکر: ''میں نے جان بوجھ کر تو دُولہے میاں کو نہیں مارا تھا۔''

چودھری: ''تم نے نہ مارا ہوتا تو میں اپنے ہاتھوں سے مارتا۔ سمجھ گئے۔ اب میں تم سے توہین کا بدلہ لوں گا۔ بولو! میرے ہاتھوں چاہتے ہو یا عدالت کے ہاتھوں؟ عدالت سے کچھ دنوں کے لیے سزا پا جاؤ گے میں قتل کروں گا۔ تم میرے دوست ہو، مجھے تم سے متعلق کینہ نہیں ہے۔ میرے دل کو کتنا رنج ہے۔ یہ خدا کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا لیکن میں تمھیں قتل کروں گا۔ میرے دین کا یہ حکم ہے۔''

یہ کہتے ہوئے چودھری صاحب تلوار لے کر ٹھاکر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ عجیب و غریب سین تھا۔ ایک بوڑھا آدمی سر کے بال پکے، کمر جھکی تلوار لیے ایک دیو کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹھاکر لاٹھی کے ایک ہی وار سے ان کا کام تمام کر سکتا تھا لیکن اس نے سر جھکا دیا۔ چودھری صاحب کے لیے اُس کے روم روم میں خلوص بھرا ہوا تھا۔ چودھری صاحب اپنے دین کے اتنے پکے ہیں اس کا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اسے شاید دھوکا ہو گیا تھا کہ یہ دل سے ہندو ہیں۔ جس مالک نے اسے پھانسی سے اُتار لیا اس کے خلاف اٹھنا یا بدلے کا خیال اس کے من میں کیوں کر آتا۔ وہ نڈر تھا اور نڈروں کی طرح تھا۔ اسے اس وقت غصہ نہ تھا، پشیمانی تھی۔ مرنے کا ڈر نہیں تھا، دُکھ تھا۔

چودھری صاحب ٹھاکر کے سامنے کھڑے تھے۔ دین ایمان کہتا تھا مارو، انسانیت کہتی تھی

چھوڑو۔ دین اور دھرم میں جنگ ہو رہی تھی۔ ٹھاکر نے چودھری کا شش و پنج دیکھا۔ گدگد گلے سے بولا: "آپ کی محبت مجھ پر ہاتھ نہ اُٹھانے دے گی۔ اپنے پالے ہوئے خادم کو آپ مار نہیں سکتے۔ لیکن یہ سر آپ کا ہے آپ نے میرا سر بچایا تھا۔ آپ اسے لے سکتے ہیں یہ میرے پاس آپ کی امانت تھی یہ امانت آپ کو مل جائے گی۔ سویرے میرے گھر کسی کو بھیج کر منگوا لیجیے گا۔ یہاں دوں گا تو فساد ہو جائے گا گھر پر کون جانے گا کس نے مارا۔ جو بھول چوک ہوئی ہے اسے معاف کیجیے گا۔

یہ کہتا ہوا ٹھاکر وہاں سے چلا گیا۔

O

میرے اگلے ناول (پردۂ مجاز) کا پس منظر بھی ہندو مسلم تعلّقات تھے۔

"چوگانِ ہستی" ۱/اپریل ۱۹۲۴ء کو مکمّل ہوا۔ دس دن بعد اگلے ناول کے تصنیف کی شروعات ہوئی۔ یہ پہلا ناول تھا جو اوّلاً ہندی میں لکھا گیا۔ عنوان تھا "کایا کلپ" اس ناول کا حصہ اوّل سات مہینے میں تیار ہو گیا۔ دوسرے حصّے کی شروعات نومبر ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔

دلارے لال بھارگو کے گنگا پستک مالا کے کام سے سبکدوش ہوا اور بنارس واپسی ہوئی تو اس ناول (کایا کلپ) کی اشاعت کا کام میرے اپنے سرسوتی پریس کو سونپا گیا۔ اس پریس سے شائع ہوئی کتابوں کی بِکری ٹھیک نہیں تھی۔ "کربلا" دلارے لال بھارگو کے اہتمام سے نکلا۔ اناتولی فرانس کا ڈرامہ "تھیسس" کا ترجمہ "اہنکار" کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ یہ کلکتہ کے بڑا بازار کی کمار سبھا کے سیکریٹری رادھا کرشن بنوتیا کے نام سے شائع کیا گیا۔ "کایا کلپ" کی ایک سال میں صرف چھ سو کاپیاں فروخت ہوئیں۔

میرے ہر ناول میں ایک معیاری کردار ہوتا ہے جس میں انسانی صفات ہوتے ہیں اور کمزوریاں بھی مگر ان کا معیاری ہونا ضروری ہے۔ "پریم آشرم" (گوشۂ عافیت) میں گوپال شنکر ہے۔ "رنگ بھومی" (چوگانِ ہستی) میں سورداس "کایا کلپ" (پردۂ مجاز) میں چکر دھر میرے اکثر کردار حقیقی زندگی سے لیے گئے ہیں۔ گو ان کی اصلیت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ جب تک کردار کی بنیاد حقیقت پر مبنی نہ ہو وہ غیر حقیقی، غیر یقینی اور ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے

میرا قصہ "زنجیر ہوس" کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے اور نہ کسی تاریخی واقعہ سے اس کا برائے نام بھی تعلّق ہے۔ قاسم ضرور فاتح سندھ کا نام ہے اور اس کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہے بھی جو قصّہ کے کام آسکتا ہے۔ لیکن اس قصّہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میں نے دہلی کے بادشاہ کا نام بھی

نہیں دیا ہے تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ نہ ملتان کے فرماں روا کا نام دیا ہے اس میں یہ دکھانا میرا مقصد ہے کہ انسان ہوس کے ہاتھوں کتنا اندھا ہو جاتا ہے اور یہ ہوس کس طرح تیزی سے بڑھتی جاتی ہے اور کچھ نہیں۔

"منزلِ مقصود" مجھے خود بھی بے انتہا پسند ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اسی رنگ میں پھر کچھ لکھوں۔ مگر قلم نہیں چلتا۔ دفتری بالکل لائف سے لیا گیا ہے۔ تخیل کا بہت کم دخل ہے۔ مجھ میں ایک خاص عیب یہ ہے اور یہ عمر کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے کہ۔ میں کہانیوں میں حسن و عشق کی چاشنی نہیں دے سکتا وہ دن اب نہیں رہے۔

O

میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اوّل سے آخر تک ذہن میں نہ جمالوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ اس افسانے کے حسبِ حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُر لطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پروا نہیں کرتا ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے، جس کا نام ہے "دل کی رانی" میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزار ہا ترکوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایسے دشمنِ قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا تھا۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کیے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی

جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بنا پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کیے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقع سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانہ کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینے بھر میں شاید میں نے دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیرکٹر تو سب مل جاتے ہیں، لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلے حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کرسکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے۔ سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے، ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں اسے خود پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اُسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔

○

سرسوتی پریس کی پریشانیوں سے چھٹکارا نہیں ملا۔ جو کتابیں اس پریس سے شائع ہوتی تھیں ان کی بکری تسلّی بخش نہیں تھی۔ حالت دگرگوں تھی۔

جب نول کشور پریس کے مالک بشن نارائن بھارگو نے مجھے لکھنؤ بلا کر تجویز پیش کی کہ میں ان کے ہندی ماہنامہ "مادھوری" کی ادارت کا کام اپنے ذمّے لوں۔ تنخواہ دو سو روپے ماہوار اور عہدہ تھا معاون مدیر کا۔ اُسے منظور کیا اور مع عیال لکھنؤ آیا۔ "مادھوری" نے خوب نام کمایا۔ ماہنامہ نے ادب کی خوب خدمت کی۔ کتنے ہی نوجوان ادیبوں کو اپنی تصنیفات کو شائع کرانے کا موقع دیا۔ لکھنؤ کے ایک نیم حکیم سالگ رام شاستری نے ماہنامہ پر عزّت ہتک کا دعوی کیا۔ اس سے "مادھوری" کی شہرت ہوئی اور افسانہ دوبارہ شائع ہوا۔

قیام لکھنؤ میں بھی سرسوتی پریس کی پریشانیوں سے چھٹکارا نہیں تھا۔

پریس کے پاس کام نہیں تھا۔ صلاح مشورہ کیا۔ ہندی میں صرف افسانوں کا کوئی رسالہ نہیں تھا۔ کیوں نہ ایک رسالہ نکالا جائے جس سے ادب کی خدمت ہو اور پریس کو کام مل جائے۔ ۱/مارچ ۱۹۳۰ء سے "ہنس" ماہوار رسالہ شائع کیا گیا۔

الہ آباد سے رام سہگل ایک ہندی ماہنامہ نکالتے تھے "چاند" اس میں عام طور پر خواتین کی دلچسپی کے افسانے اور مضامین ہوتے تھے۔ سہگل کے اصرار پر اُنھیں ایک ناول دیا۔ عنوان تھا "نرملا" یہ نومبر ۱۹۲۵ء سے لے کر ایک سال تک ماہنامہ "چاند" میں شائع ہوا۔ بعد میں "چاند" نے اسے کتابی شکل میں بھی شائع کیا۔ (تین سال بعد اُردو میں اسے گیلانی پریس لاہور نے شائع کیا) "نرملا" کی مقبولیت کو دیکھ کر سہگل نے ایک اور ناول لکھنے کے لیے کہا۔ پیشکش منظور کی۔ "ہم خرما و ہم ثواب" کو نکال کر تھوڑی بہت ردّوبدل کر اسے "پرتگیا" کے عنوان سے "چاند" میں قسط وار شائع کیا۔ (اُردو میں تین چار سال بعد "بیوہ" کے عنوان سے اسے جامعہ ملّیہ نے شائع کیا۔)

"نرملا" اور "بیوہ" پرانے ڈھنگ کی کتابیں تھیں۔ اسی زمانے کی ایک اور تصنیف تھی "غبن"۔ اس ناول کا مسئلہ تھا خواتین کا زیورات کے لیے جنون۔ یہی مسئلہ دوسرے ناول "کشنا" میں بھی اُٹھایا گیا تھا۔ مگر پچیس سال بعد حالات بدل چکے تھے۔ آزادی کی تحریک تھوڑی ٹھنڈی پڑ گئی تھی مگر انقلاب پسند نوجوان سرگرمیوں میں آگے آرہے تھے اور پولیس کی زیادتیاں بھی شرمناک صورت پیش کررہی تھیں۔ "غبن" میں ان کو اُجاگر کیا گیا۔ یہ سرسوتی پریس سے مارچ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ ایک سال بعد اس کا اُردو ترجمہ شروع کیا۔ اسی زمانے کی ایک اور اہم تصنیف تھی "کرم بھومی" اس کی ابتدا ۱۹۲۹ء کے شروع میں ہوئی۔ پہلے ہندی میں لکھی گئی۔ جب یہ لکھی جارہی تھی تو "پردۂ مجاز" کا اُردو مسودہ تیار کیا جارہا تھا۔ "کرم بھومی" سرسوتی پریس سے نومبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اُردو میں یہ "میدان عمل" کے عنوان سے چار سال بعد جامعہ مکتبہ نے شائع کیا۔ اس ناول میں سیاسی سرگرمیوں اور اچھوتوں کی مندروں میں جانے کی اجازت کی تحریک پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ناول ایک قومی تحریک کے پس منظر میں لکھی گئی۔ یوں دُنیا کے تقریباً تمام عظیم ناولوں کا ایک سماجی مقصد رہا ہے یا وہ کسی عظیم تحریک کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ ٹالسٹائی کے ناول "وار اینڈ پیس"، ماسکو پر نپولین کے حملے کے سوا کیا ہے۔ ٹالسٹائی نے اپنے ناول کے صفحات سے اس جنگ کو زندۂ جاوید کردیا ہے۔ اس نے کردار اور واقعات اس طرح پیش کیے ہیں کہ انسانی فطرت کے پوشیدہ گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ ناول میں کرداروں کے ارتقاء کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اگر ناول نگار اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوجائے تو پھر اسے نقّاد کے قلم کا ڈر نہیں رہ جاتا۔ اگر مصنف لطیف و عمیق جذبات کی عکّاسی کرے تو وہ مدّتِ مدید تک زندہ رہنے کا مستحق ہے۔

کیونکہ لطیف اور عمیق احساسات ابدی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

سیاسی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ میں بھی کانگریس کی اُلجھنوں میں پڑا رہا۔ لکھنؤ پر فوج کا قبضہ ہوا۔ امین آباد کے دونوں پارکوں میں سپاہی اور گورے ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ دھارا ۱۴۴ لگی ہوئی تھی۔ پولیس لوگوں کو گرفتار کر رہی تھی اور کانگریس دھارا ۱۴۴ کو توڑنے کی فکر میں تھی۔ ڈنڈے کی نئی پالیسی نے لوگوں کی ہمّت توڑ دی تھی۔ گورنمنٹ کی زیادتیاں ناقابلِ برداشت ہو رہی تھیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی ضعیف ماں کے ساتھ کیسی بدسلوکیاں کی گئیں۔ اب تو مجھے بھی بے حیائی معلوم ہو رہی تھی۔ میں جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ شِوانی دیوی نے خود جا کر میرا راستہ بند کر دیا۔ وہ پکٹنگ کے جرم میں دو مہینے کی سزا پا گئیں۔ اب تو وہ آگئیں مگر شاید پھر جائیں کیونکہ انھیں صبر نہیں ہے۔ سارا سوراج ایک ہی بار لینا چاہتی ہیں۔ قسطوں میں نہیں۔ اسی سوراج کے لیے جگہ جگہ جلوس نکل رہے ہیں۔

کانگریس کا جلوس نکل رہا تھا۔ کچھ نوجوان۔ کچھ بوڑھے۔ کچھ بچّے جھنڈیاں اور جھنڈے لیے ''بندے ماترم'' گاتے ہوئے مال کے سامنے سے نکلے۔ دونوں طرف تماشائیوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ گویا اُن کو اس جتھے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ کوئی تماشا ہے، اور اُن کا کام صرف کھڑے کھڑے تماشا دیکھنا ہے۔

شمبھوناتھ نے دُکان کی پٹری پر کھڑے ہو کر اپنے ہمسایہ دین دیال سے کہا: ''سب کے سب موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ آگے سواروں کا دستہ مار مار کر بھگا دے گا۔''

دین دیال نے کہا: ''مہاتما جی بھی سٹھیا گئے ہیں۔ جلوس سے سوراجیہ مل جاتا تو اب تک کب کا مل گیا ہوتا۔ اور جلوس میں ہیں کون لوگ، دیکھا! لونڈے! لفنگے! دیوانے! شہر کا کوئی بڑا آدمی نہیں۔''

میکو جوتیوں اور سلیپروں کی مالا گردن میں لٹکائے کھڑا تھا۔ ان دونوں سیٹھوں کی باتیں سن کر ہنس پڑا۔ شمبھو نے پوچھا: ''کیوں ہنسے میکو۔؟ آج رنگ گہرا معلوم ہوتا ہے۔''

میکو: ''ہنسا اس بات پر جو تم نے کہی کہ کوئی بڑا آدمی جلوس میں نہیں ہے۔ بڑے آدمی جلوس میں کیوں آنے لگے۔ اُنھیں اس راج میں کون آرام نہیں ہے بنگلوں اور محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹروں پر گھومتے ہیں۔ صاحبوں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہیں۔ انھیں کون تکلیف ہے۔ مر تو ہم لوگ رہے ہیں۔ جنھیں روٹیوں کا ٹھکانہ نہیں۔ اس وقت کوئی ٹینس کھیلتا ہوگا۔ کوئی چائے پیتا ہوگا۔ کوئی گراموفون لیے گانا سنتا ہوگا۔ کوئی پارک کی سیر کرتا ہوگا۔ یہاں آدیں پولیس کے کوڑے کھانے کے لیے۔ تم نے بھی اچھی کہی۔''!

شمبھو: ''تم یہ باتیں کیا سمجھو گے میکو! جس کام میں چار بڑے آدمی شامل ہوتے ہیں۔ اُس کی سرکار پر بھی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ لونڈے لفنگوں کو حاکم لوگ بھلا کیا سمجھتے ہیں۔''

میکو نے ایسی نگاہ سے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ 'ان باتوں کو ہم بھی سمجھتے ہیں۔' اور بولا: ''بڑے آدمیوں کو ہمیں لوگ بناتے بگاڑتے ہیں یا کوئی اور؟ کتنے ہی لوگ جنھیں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا، ہمارے بنائے بڑے آدمی بن گئے، اور اب موٹروں پر نکلتے ہیں، اور ہمیں نیچا سمجھتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی تکدیر کی کھوبی ہے کہ جس کی جرا بھی ترکی ہوئی، بس اس نے ہم لوگوں کی طرف سے نگاہ بدلی۔ ہمارا بڑا آدمی تو وہی ہے جو لنگوٹی باندھے ننگے پاؤ گھومتا ہے۔ جو ہمارے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ ہمیں اور کسی بڑے آدمی کی پروا نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو ان بڑے آدمیوں نے ہی ہماری مٹی خراب کر رکھی ہے۔ اُنھیں سرکار نے کوئی اچھی سی جگہ دے دی۔ بس اُس کا دم بھرنے لگے۔''

دین دیال: ''نیا داروغہ بڑا جلاد ہے۔ چوراہے پر پہنچتے ہی ہنٹر لے کر پل پڑے گا۔ پھر دیکھنا سب کیسا دُم دبا کر بھاگتے ہیں۔ مزا آدے گا۔''

جلوس آزادی کے نشے میں چور چوراہے پر پہنچا تو دیکھا کہ سواروں اور سپاہیوں کا ایک دستہ راستہ روکے کھڑا ہے۔

یکا یک داروغہ بیربل سنگھ گھوڑا بڑھا کر جلوس کے سامنے آگئے اور بولے: ''تم لوگوں کو آگے جانے کا حکم نہیں ہے۔''

جلوس کے بڈھے لیڈر ابراہیم علی نے آگے بڑھ کر کہا: ''میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ کسی قسم کا دنگا فساد نہ ہوگا۔ ہم دکانیں لوٹنے یا موٹریں توڑنے نہیں نکلے ہیں۔ ہمارا مقصد اس سے کہیں اُونچا ہے۔''

بیربل سنگھ: ''مجھے یہ حکم ہے کہ جلوس یہاں سے آگے نہ جانے پاوے۔''

ابراہیم: ''آپ اپنے افسروں سے ذرا پوچھ نہ لیں۔''

بیربل سنگھ: ''میں اِس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔''

ابراہیم: ''تو ہم لوگ یہیں بیٹھے ہیں۔ جب آپ لوگ چلے جائیں گے تو ہم نکل جائیں گے۔''

بیربل: ''یہاں کھڑے ہونے کا بھی حکم نہیں ہے۔ تم کو واپس جانا پڑے گا۔''

ابراہیم نے متانت کے ساتھ جواب دیا: ''واپس تو ہم نہ جائیں گے۔ آپ کو یا کسی کو بھی

ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ اپنے سواروں، سنگینوں اور بندوقوں کے زور سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں، روک لیجیے۔ مگر آپ ہمیں واپس نہیں کر سکتے۔“

بیربل میٹرک تھا۔ اس کا باپ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ اُس کی رگ رگ میں رُعب بھرا ہوا تھا۔ افسروں کی نگاہ میں اُس کی بڑی عزت تھی۔ خاصہ گورا چٹا، نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والا صاحب اقبال شخص تھا۔ شاید جس وقت وہ کوٹ پہن کر اوپر سے ہیٹ لگا لیتا تو وہ بھول جاتا تھا کہ میں بھی یہیں کا رہنے والا ہوں۔ غالباً وہ اپنے کو سلطنت کرنے والی قوم کا جز سمجھنے لگتا تھا مگر ابراہیم علی کے مردانہ استقلال نے ذرا دیر کے لیے اُسے شش و پنج میں ڈال دیا۔ جلوس کو راستہ دے دیتا ہے تو جواب طلب ہو جائے گا۔ وہیں کھڑا رہنے دیتا ہے تو یہ سب نہ جانے کب تک کھڑے رہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑا ہوا تھا کہ اس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو موٹر پر آتے دیکھا۔ اب پس و پیش کا وقت نہ تھا، یہی موقع تھا کارگزاری دکھانے کا۔ اُس نے کمر سے بیٹن نکال لیا، اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جلوس پر چڑھانے لگا۔ اُسے دیکھتے ہی اور سواروں نے بھی گھوڑوں کو جلوس پر چڑھانا شروع کر دیا۔ ابراہیم داروغہ کے گھوڑے کے سامنے کھڑا تھا، اُس کے سر پر ایک بیٹن ایسے زور سے پڑا کہ اس کی آنکھیں تلملا گئیں۔ کھڑا نہ رہ سکا، سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت داروغہ کے گھوڑے نے دونوں پاؤں اُٹھائے اور زمین پر بیٹھا ہوا ابراہیم اُس کی ٹاپوں کے نیچے آ گیا۔ جلوس ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ ابراہیم کو گرتے دیکھ کر کئی آدمی اُسے اُٹھانے کے لیے لپکے مگر کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ اُدھر سواروں کے ڈنڈے بڑی بے رحمی سے پڑ رہے تھے۔ لوگ ہاتھوں پر ڈنڈوں کو روکتے تھے۔ اور ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے تھے۔ دل سے اشتعال کو دُور رکھنا اُن کے لیے دم بدم مشکل ہوتا جاتا تھا۔ مگر مسلک اور اصول نے ان کے جذبات اور حرکات کو بندشوں سے جکڑ رکھا تھا۔

دس بارہ منٹ تک یونہی ڈنڈوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور لوگ خاموش کھڑے رہے۔

اس مار پیٹ کی خبر ایک ہی آن میں بازار میں جا پہنچی۔ ابراہیم گھوڑے سے کچل گئے۔ کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ کتنوں ہی کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ مگر نہ وہ لوگ واپس ہوتے ہیں نہ پولیس اُنھیں آگے جانے دیتی ہے۔

میکو نے جوش میں آ کر کہا: ”اب تو بھائی یہاں نہیں رہا جاتا، میں بھی چلتا ہوں۔“

دین دیال نے کہا: ”ہم بھی چلتے ہیں بھائی! دیکھی جائے گی۔“

شمبھو ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ یکا یک اُس نے بھی دُکان بڑھائی۔ اور بولا: ”ایک دن تو مرنا ہی ہے جی، جو کچھ ہونا ہے ہو۔ آخر یہ لوگ سبھی کے لیے تو جان دے رہے

ہیں۔'' دیکھتے دیکھتے زیادہ تر دُکانیں بند ہو گئیں۔ وہ لوگ جو دس منٹ پیشتر تماشا دیکھ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے دوڑ پڑے اور ہزاروں آدمیوں کا ایک جمِ غفیر جائے وقوع کی طرف چلا یہ متوالا گروہ خونریزی کے نشہ میں بھرے ہوئے آدمیوں کا گروہ تھا۔ جسے اصول اور مسلک کی پروانہ تھی، جو مرنے کے لیے ہی نہیں مارنے کے لیے بھی تیار تھے۔ کتنوں ہی کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، کتنے ہی جیبوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کسی سے کچھ بولتا تھا نہ پوچھتا تھا۔ بس سب کے سب دل میں ایک مستقل ارادہ کیے لپکے چلے جا رہے تھے۔ گویا کوئی گھٹا اُمڈی چلی آتی ہو۔

اس گروہ کو دُور سے دیکھتے ہی سواروں میں کچھ ہلچل پڑی۔ بیربل سنگھ کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اپنی موٹر آگے بڑھائی۔ امن اور عدم تشدّد کے حامیوں پر ڈنڈے برسانا اور بات تھی، لیکن ایک پُر جوش گروہ سے مقابلہ کرنا دوسری بات۔ سوار اور سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔

ابراہیم کی پیٹھ پر گھوڑے نے ٹاپ رکھ دیا تھا۔ وہ بے ہوش زمین پر پڑے تھے۔ انھوں نے آدمیوں کو اشارہ سے بلا کر پوچھا: ''کیوں کیلاش! کیا کچھ لوگ شہر سے آ رہے ہیں؟''

کیلاش نے اُس بڑھتی ہوئی گھٹا کی طرف دیکھ کر کہا: ''جی ہاں ہزاروں آدمی ہیں۔''

ابراہیم: ''تو اب خیریت نہیں ہے۔ جھنڈا لوٹا دو۔ ہمیں فوراً واپس چلنا چاہیے۔ نہیں تو طوفان برپا ہو جائے گا۔ ہمیں اپنے بھائیوں سے لڑائی نہیں کرنا ہے۔ فوراً واپس چلو۔''

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اُٹھ نہ سکے۔

اشارہ کی دیر تھی۔ منظم فوج کی طرح لوگ حکم پاتے ہی پیچھے پھر گئے! جھنڈیوں کے بانسوں۔ صافوں اور رومالوں سے فوراً ایک اسٹریچر تیار ہو گیا۔ ابراہیم کو لوگوں نے اُس پر لٹا دیا اور واپس ہوئے۔ مگر کیا وہ مغلوب ہو گئے تھے؟ اگر کچھ لوگوں کو انھیں مغلوب سمجھنے میں ہی تسلی ہوتی ہو تو ہو۔ لیکن حقیقت میں اُنھوں نے ایک معرکۃ الآرا فتح حاصل کی تھی۔ وہ جانتے تھے، ہماری کشمکش اپنے ہی بھائیوں سے ہے۔ جن کے مفاد حالت موجودہ میں ہمارے مفاد سے علیحدہ ہیں۔ ہمیں اُن سے دشمنی نہیں کرنی ہے۔ پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ شہر میں لوٹ مار اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے اور ہماری قومی جدوجہد کا نتیجہ لُٹی ہوئی دکانیں اور ٹوٹے ہوئے سر ہوں۔ اُن کی فتح کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ اُنھوں نے پبلک کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ وہی لوگ جو پہلے اُن پر تمسخر کرتے تھے، اُن کا استقلال اور اُن کی جرأت دیکھ کر ان کی امداد کے لیے نکل پڑے تھے۔ ذہنیت کی یہ تبدیلی یہ بیداری ہی اُن کی اصلی فتح تھی۔

تین دن گزر گئے تھے۔ بیر بل سنگھ اپنے کمرہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ان کی بیوی مٹھن بائی بچے کو گود میں لیے سامنے کھڑی تھیں۔

بیر بل سنگھ نے کہا: ''میں اُس وقت کیا کرتا؟ پیچھے ڈی۔ ایس۔ پی۔ کھڑا تھا۔ اگر جلوس کو راستہ دے دیتا تو اپنی جان مصیبت میں پھنستی۔''

مٹھن بائی نے سر ہلا کر کہا: ''تم کم سے کم اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ ان پر ڈنڈے نہ چلاتے۔ کیا تمھارا کام آدمیوں پر ڈنڈے چلانا ہے؟ تم زیادہ سے زیادہ جلوس کو روک سکتے تھے۔ کل کو تمھیں مجرموں کو بید لگانے کا کام دیا جائے تو شاید تمھیں بڑی خوشی ہوگی۔ کیوں؟''

بیر بل سنگھ نے شرمندہ ہو کر کہا: ''تم تو بات نہیں سمجھتی ہو!''

مٹھن بائی: ''میں خوب سمجھتی ہوں۔ ڈی۔ ایس۔ پی پیچھے کھڑا تھا۔ تم نے خیال کیا ہوگا۔ کہ کارگزاری دکھانے کا ایسا موقع پھر کبھی ملے یا نہ ملے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اُس گروہ میں کوئی بھلا آدمی نہ تھا؟ اُس میں کتنے ہی آدمی ایسے تھے جو تمھارے جیسوں کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔ علم میں تو شاید زیادہ تر تم سے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ مگر تم ان پر ڈنڈے چلا رہے تھے اور اُنھیں گھوڑے سے کچل رہے تھے۔ واہ ری جواں مردی!''

بیر بل سنگھ نے بے حیائی کی ہنسی کے ساتھ کہا: ''صاحب نے میرا نام نوٹ کر لیا ہے۔ سچ!''

داروغہ نے سمجھا تھا، یہ مژدۂ جاں فزا سنا کر وہ مٹھن بائی کو خوش کر لیں گے۔ شرافت اور اخلاق کی چشم نمائیاں اس نفع صریح کی تاب نہ لا سکیں گی۔ مگر مٹھن بائی کے چہرہ پر خوشی کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ بولی: ''ضرور کر لیا ہوگا۔ اور شاید تمھیں جلد ترقی بھی مل جائے۔ مگر بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر ترقی پائی تو کیا پائی! یہ تمھاری کارگزاری کا انعام نہیں۔ تمھاری غداری کی قیمت ہے۔ تمھاری کارگذاری کا انعام تو اس وقت ملے گا جب تم کسی خونی کو کھوج نکالو گے۔ کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچا لو گے۔''

یکا یک ایک سپاہی نے برآمدہ میں کھڑے ہو کر کہا: ''حضور! یہ لفافہ لایا ہوں۔'' بیر بل سنگھ نے باہر نکل کر لفافہ لے لیا، اور اندر کی سرکاری چٹھی نکال کر پڑھنے لگے پڑھ کر اُسے میز پر رکھ دیا۔

مٹھن نے پوچھا: ''کیا ترقی کا پروانہ آ گیا؟''

بیر بل سنگھ نے جھینپ کر کہا: ''تم تو بناتی ہو۔ آج پھر کوئی جلوس نکلنے والا ہے۔ مجھے اس

کے ساتھ رہنے کا حکم ہوا ہے۔"

مٹھن: "پھر تو تمھاری چاندی ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ آج پھر ویسے ہی شکار ملیں گے۔ خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ دکھانا، ڈی۔ ایس۔ پی بھی ضرور آویں گے اس مرتبہ تم انسپکٹر ہو جاؤ گے۔ سچ!"

بیربل سنگھ نے چین بہ جبیں ہو کر کہا: "کبھی کبھی تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ فرض کرو میں جا کر خاموش کھڑا رہوں: "تو کیا نتیجہ ہوگا؟ میں نالائق سمجھا جاؤں گا۔ اور میری جگہ کوئی دوسرا آدمی بھیج دیا جائے گا۔ کہیں شبہ ہو گیا کہ مجھے سوراجیوں سے ہمدردی ہے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اگر برخاست نہ بھی ہوا تو لین کی حاضری تو ہو ہی جائے گی۔ آدمی جس دنیا میں رہتا ہے، اُسی کا چلن دیکھ کر کام کرتا ہے۔ میں عقلمند نہ سہی پر اتنا جانتا ہوں کہ یہ لوگ ملک اور قوم کو آزاد کرانے کے لیے ہی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ سرکار اس خیال کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ ایسا گدھا نہیں ہوں کہ غلامی کی زندگی پر فخر کروں۔ لیکن حالتِ موجودہ سے مجبور ہوں۔"

باجے کی آواز کانوں میں آئی۔ بیربل سنگھ نے باہر جا کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا سوراجیوں کا جلوس آ رہا ہے۔ فوراً وردی پہنی، صافہ باندھا اور جیب میں پستول رکھ کر باہر آئے۔ دم بھر میں گھوڑا تیار ہو گیا۔ کانسٹبل پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ سب لوگ ڈبل مارچ کرتے ہوئے جلوس کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ لوگ کوئی پندرہ منٹ میں جلوس کے سامنے پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بیشمار گلوں سے "بندے ماترم" کی ایک آواز نکلی گویا بادلوں میں گرج ہوئی ہو۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ اس جلوس میں کسی قدر فرق تھا۔ وہ سوراجیہ کے جشن کا جلوس تھا، یہ ایک شہید کے ماتم کا۔ تین دن کے مسلسل بخار اور تکلیف کے بعد آج اس زندگی کا خاتمہ ہو گیا، جس نے کبھی عہدے کی خواہش نہیں کی۔ کبھی منصب کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اُنھوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میری لاش کو گنگا میں غسل دے کر دفن کیا جائے اور میرے مزار پر سوراجیہ کا جھنڈا نصب کیا جائے۔ اُن کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی سارے شہر پر ماتم کا پردہ سا پڑ گیا۔ جو سنتا تھا۔ ایک مرتبہ اس طرح چونک پڑتا تھا گویا کہ اُسے گولی سی لگ گئی ہو۔ اور فوراً اُن کی زیارت کے لیے بھاگتا تھا۔ سارے بازار بند ہو گئے۔ یکے اور تانگوں کا بھی کہیں پتہ نہ تھا جیسے شہر لُٹ گیا ہو۔ دیکھتے دیکھتے سارا شہر امنڈ پڑا۔ جس وقت جنازہ اُٹھا لاکھ سوا لاکھ آدمی ساتھ تھے۔ کوئی آنکھ

ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے سُرخ نہ ہو۔

بیربل سنگھ اپنے کانسٹبلوں اور سواروں کو پانچ پانچ گز کے فاصلہ پر جلوس کے ساتھ چلنے کا حکم دے کر خود پیچھے چلے گئے۔ پچھلی صفوں میں کوئی پچاس گز تک مستورات تھیں۔ داروغہ نے اُن کی طرف دیکھا۔ پہلی ہی قطار میں مٹھن بائی نظر آئی۔ بیربل کو اعتبار نہ آیا، پھر غور کر کے دیکھا، وہی تھی۔ مٹھن نے اُن کی طرف ایک بار دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں۔ لیکن اُس کی ایک چتون میں کچھ ایسی لعنت، کچھ ایسی شرم، کچھ ایسا درد اور کچھ ایسی نفرت بھری ہوئی تھی کہ بیربل سنگھ کے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اپنی نگاہ میں کبھی ایسے ہلکے، اتنے کمزور اور اتنے ذلیل نہ ہوئے تھے۔

یکا یک ایک عورت نے داروغہ کی طرف دیکھ کر کہا: ''کوتوال صاحب! کہیں ہم لوگوں پر ڈنڈے نہ چلا دیجیے گا۔ آپ کو دیکھ کر ڈر ہو رہا ہے۔''

دوسری بولی: ''آپ ہی کے تو کوئی بھائی تھے۔ جنھوں نے اس دن نال کے چوراہے پر ڈنڈوں کی بارش کی تھی۔''

مٹھن نے کہا: ''آپ کے کوئی بھائی نہ تھے۔ آپ خود تھے۔''

بیسیوں منہ سے آوازیں نکلیں: ''اچھا! یہ وہی صاحب ہیں۔ اصاحب۔ آپ کو آداب ہے! یہ آپ ہی کی نوازش کا نتیجہ ہے کہ آج ہم بھی آپ کے ڈنڈے کی زیارت کے لیے آ کھڑی ہوئی ہیں۔''

بیربل نے مٹھن بائی کی طرف آنکھوں کا بھالا چلایا، پر منہ سے کچھ نہ بولے۔

ایک تیسری خاتون نے پھر کہا: ''ہم ایک جلسہ کر کے آپ کو ہار پہنائیں گے۔''

ایک بڑھیا نے آنکھیں چڑھا کر کہا: ''میری کوکھ سے ایسا بچہ پیدا ہوتا تو اُس کی گردن مروڑ دیتی۔''

ایک نوجوان خاتون نے اُس کی سرزنش کر کے کہا: ''آپ بھی خوب کہتی ہیں۔ ماتا جی! کتنے تک تو نمک کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ تو آدمی ہیں۔''

بڑھیا نے جھلا کر کہا۔: ''آدمی نہیں! پیٹ کے غلام، ہائے پیٹ! ہائے پیٹ!!''

اس پر کئی عورتوں نے بڑھیا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور وہ بے چاری شرمندہ ہو کر بولی: ''ارے تو میں کچھ کہتی تھوڑے ہی ہوں۔ مگر ایسا آدمی بھی کیا جو خود غرضی کے پیچھے اندھا ہو جائے۔''

بیربل سنگھ اب اور نہ سن سکے۔ گھوڑا بڑھا کر جلوس سے کئی گز پیچھے چلے گئے۔ مرد طعنے

دے تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ عورت طعنے دیتی ہے تو ہم خفیف ہو جاتے ہیں۔ بیربل سنگھ کی اس وقت اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر ان خاتونوں کے سامنے جاتے۔ اپنے افسروں پر غصہ آیا۔ مجھ کو ہی بار بار کیوں ان کاموں پر تعینات کیا جاتا ہے۔ اور لوگ بھی تو ہیں، انھیں کیوں نہیں بلایا جاتا۔ کیا میں ہی سب سے گیا گذرا ہوں؟ کیا میں ہی سب سے بے حس ہوں؟ منّی اس وقت مجھے دل میں کس قدر بزدل اور ذلیل سمجھ رہی ہوگی۔ شاید اس وقت مجھے کوئی مار بھی ڈالے تو وہ زبان نہ کھولے گی۔ غالباً دل ہی دل میں خوش بھی ہوگی کہ اچھا ہوا۔ ابھی کوئی جا کر صاحب سے کہہ دے کہ بیربل سنگھ کی بیوی جلوس میں نکلی تھی تو کہیں کا نہ رہوں۔ منّی جانتی ہے، سمجھتی ہے پھر بھی نکل کھڑی ہوئی۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ کوئی فکر نہیں ہے نا، جبھی تو یہ باتیں سوجھتی ہیں۔ یہاں سبھی بے فکرے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے لڑکے۔ مزدور۔ پیشہ ور۔ انھیں کیا فکر۔ موت تو ہم لوگوں کی ہے جن کے بال بچّے ہیں، اور کچھ عزّت کا خیال ہے۔ سب کی سب میری طرف کیسا گھور رہی ہیں گویا کھا جائیں گی۔

جلوس شہر کی خاص سڑکوں سے گزرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ دونوں طرف چھتوں، چھجّوں، جنگلوں اور درختوں پر تماشائیوں کی دیواریں سی کھڑی تھیں۔ بیربل سنگھ کو آج اُن کے چہروں پر ایک نئی اُمنگ، ایک نیا عزم اور ایک نئی شان جھلکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُمنگ بڈھوں کے چہروں پر، عزم نوجوانوں کے، اور شان خاتونوں کے۔ اب اُن کے سفر کی منزلِ مقصود مفقود نہ تھی۔ گم گشتوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکنا نہ تھا۔ پامالوں کی طرح سر جھکا کر رونا نہ تھا۔ آزادی کی سنہری چوٹی دُور دراز آسمان پر چمک رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو درمیان کے نالوں اور جنگلوں کی پروا نہیں ہے۔ سب اس سنہری منزل پر پہنچنے کے شوق میں بے چین ہو رہے ہیں۔

گیارہ بجتے بجتے جلوس دریا کے کنارے جا پہنچا۔ جنازہ اُتارا گیا اور لوگ لاش کو گنگا اشنان کرانے کے لیے چلے۔ اس کی سرد، خاموش اور زرد پیشانی پر لاٹھی کی چوٹ صاف نظر آرہی تھی۔ خون جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ سر کے بڑے بڑے بال خون جم جانے سے کسی مصوّر کے بُرش کی طرح چمٹ گئے تھے۔ کئی ہزار آدمی اس شہید کی آخری زیارت کے لیے حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بیربل سنگھ پیچھے گھوڑے پر سوار کھڑے تھے۔ لاٹھی کی چوٹ انھیں بھی نظر آئی۔ اُن کی رُوح نے انھیں پُر زور ملامت کی۔ وہ لاش کی طرف نہ دیکھ سکے، منّہ پھیر لیا۔ جس شخص کی زیارت کے لیے، جس کی خاکِ پا کو پیشانی پر لگانے کے لیے لاکھوں آدمی بے تاب ہو رہے ہیں، اس کی میں نے اتنی بے عزّتی کی۔ اُن کی روح اس وقت اعتراف کر رہی تھی کہ

اس بے رحمانہ تشدّد میں فرض کی ادائیگی کا شمّہ بھی نہ تھا۔ صرف خودغرضی تھی۔ کارگزاری دکھانے کا جوش، اور افسروں کو خوش کرنے کی تمنّا۔ ہزاروں آنکھیں غصہ سے بھری ہوئی اُن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیکن وہ آنکھیں اُٹھانے کی ہمّت نہ کر سکتے تھے۔

ایک کانسٹبل نے آ کر تعریف کی: "حضور کا ہاتھ گہرا پڑا تھا۔ ابھی تک کھوپڑی کھلی ہوئی ہے۔"

بیربل نے آزردہ خاطر ہو کر کہا: "میں اسے اپنی جواں مردی نہیں، اپنا کمینہ پن سمجھتا ہوں۔"

کانسٹبل نے پھر خوشامد کی: "بڑا سرکش آدمی تھا، حضور!"

بیربل نے غصہ کے ساتھ کہا: "چپ رہو۔ جانتے بھی ہو سرکش کسے کہتے ہیں۔ سرکش وہ کہلاتے ہیں جو ڈاکے مارتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں۔ خون کرتے ہیں۔ انھیں سرکش نہیں کہتے جو ملک کی بہبودی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے گھومتے ہیں۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ جن کی مدد کرنی چاہیے، اُن کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ گھمنڈ کرنے اور خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ شرم کرنے اور رونے کی بات ہے۔"

غسل ختم ہوا۔ جلوس یہاں سے پھر روانہ ہوا۔

لاش کو جب خاک کے نیچے سلا کر لوگ واپس ہوئے تو دو بج رہے تھے۔ مٹھن بائی عورتوں کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک آئی۔ پر کوئنس پارک میں آ کر ٹھٹھک گئی۔ گھر جانے کی خواہش نہ ہوئی۔ وہ بڈھا، زخمی، خون آلودہ چہرہ گویا اُس کے دل میں بیٹھا محبت کی بندشوں کو کاٹ رہا تھا۔ شوہر سے اس کا دل اس قدر پھر گیا تھا کہ اب اُسے ملامت کرنے کی بھی اُس کی خواہش نہ تھی۔ ایسے خودغرض آدمی پر خوف کے علاوہ اور کسی چیز کا اثر ہو سکتا ہے۔ اِس کا اُسے یقین ہی نہ تھا۔

وہ بڑی دیر تک پارک میں گھاس پر بیٹھی سوچتی رہی۔ لیکن اپنے طرزِ عمل کا بھی فیصلہ قطعی نہ کر سکی۔ میکے جا سکتی تھی، لیکن وہاں سے مہینہ دو مہینہ میں پھر اسی گھر میں آنا پڑے گا۔ نہیں، میں کسی کی محتاج نہ بنوں گی۔ کیا میں اپنے گزر بسر کو بھی نہیں کما سکتی؟ اُس نے خود طرح طرح کی مشکلات کا خیال کیا۔ لیکن آج اُس کے دل میں نہیں معلوم اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ ان فرضی باتوں کا خیال کرنا ہی اُسے اپنی کمزوری معلوم ہوئی۔

یکایک اُسے ابراہیم علی کی بوڑھی بیوہ کا خیال آیا۔ اس نے سنا تھا کہ اُس کے لڑکے

بالے نہیں ہیں۔ بیچاری اکیلی بیٹھی رو رہی ہوگی۔ کوئی تسلی دینے والا بھی پاس نہ ہوگا۔ وہ اُن کے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔ پتہ اُس نے پہلے ہی اپنے ساتھ کی عورتوں سے دریافت کرلیا تھا۔ وہ دل میں سوچتی جاتی تھی، میں اُن سے کیسے ملوں گی؟ اُن سے کیا کہوں گی۔ انھیں کن لفظوں میں سمجھاؤں گی۔ انھیں خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ ابراہیم علی کے گھر پر پہنچ گئی۔ مکان ایک گلی میں تھا۔ صاف ستھرا لیکن دروازہ پر حسرت برس رہی تھی۔ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اندر قدم رکھا۔ سامنے برآمدہ میں ایک چارپائی پر وہ بوڑھی بیوہ بیٹھی ہوئی تھی جس کے شوہر نے آج آزادی کی لڑائی میں اپنی قربانی دی تھی۔ اس کے سامنے سادے کپڑے پہنے ایک نوجوان کھڑا آنکھوں میں آنسو بھرے بوڑھی سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ مٹھن اس نوجوان کو دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ بیربل سنگھ تھے۔

اُس نے غصہ میں بھرے ہوئے تعجب سے پوچھا: ''تم یہاں کیسے آئے؟''

بیربل سنگھ نے کہا: ''اُسی طرح جیسے تم آئیں۔ اپنی خطا معاف کرانے آیا ہوں۔''

مٹھن بائی کے گورے چہرہ پر آج فخر مسرت اور محبت کی پاکیزہ شگفتگی نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس کی ساری مرادیں پوری ہوگئی ہیں اور اُس سے زیادہ نصیب ور عورت دنیا میں نہیں—مگر اس نے اپنی خوشی کو سردمہری کے پردہ میں چھپا کر سخت لہجہ میں کہا: ''دُنیا میں بعض ایسی خطائیں ہیں جن کی معافی ممکن نہیں۔ زبانِ خلق کی عدالت تمھیں کبھی معاف نہیں کرسکتی۔''

بیربل نے ایک بار اس کی طرف پُرسوال نظروں سے دیکھ کر کہا: ''تم ٹھیک کہتی ہو مٹھی۔''

اس نے فوراً جیب سے پستول نکالا اور اپنے سینہ میں گولی ماری۔ بوڑھی بیوہ چیخ کر اُسے سنبھالنے دوڑی مگر مٹھن بائی اسی شگفتہ انداز سے کھڑی تھی۔

○

کچھ لوگ نمک تحریک کو قبل از وقت خیال کرتے ہیں. جس طرح موت ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے ساہوکار کا تقاضہ ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے. اسی طرح سارے کام جس میں ہمیں مالی یا وقتی نقصان کا اندیشہ ہو، قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں. اس تحریک کی قبولیت ہی بتلا رہی ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں ہے. اس موقعہ پر صاف ظاہر ہوگیا کہ اگر دو فیصدی انگریزی خواں اصحاب تحریک کے ساتھ ہیں تو ۹۸ فیصدی اس کے مخالف ہیں. قومی اعتبار سے یونیورسٹیوں اور اسکولوں پر قوم کا جتنا روپیہ صرف ہوا وہ قریباً ضائع ہوگیا یہ لوگ سرکار کے آدمی ہوئے، قوم کے نہیں. غیر انگریزی داں کاروباری اور پیشہ ور طبقوں ہی نے تحریک میں جان ڈالی ہے اگر تعلیم یافتہ آدمیوں کے بھروسے

ملک بیٹھا رہے تو شاید قیامت تک اسے آزادی نصیب نہ ہو گی۔ جب معلوم ہے اور اس کے لیے ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں کہ سرکار کوئی کام اس وقت تک نہیں کرتی جب تک اسے یہ یقین نہیں ہو جاتا کہ اس تحریک کے پیچھے کتنی طاقت ہے۔ تو تعلیم یافتہ جماعت کا اس سے کنارہ رہنا کتنا دل شکن ہے۔ قانون پیشہ طبیب پیشہ پروفیسر اور سرکاری ملازمین ان سب نے جتنی غلامانہ ذہنیت کا پتہ دیا ہے اس کی مجھے امید نہ تھی۔ یہ طبقہ اپنی خیریت گورنمنٹ کا اقتدار قائم رکھنے میں سمجھتا ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی آسائش اور دُنیا طلبی کو فراموش نہیں کرسکتا۔ زر اس کا دین اور ایمان ہے۔ وہ تو آزادی چاہتا ہی نہیں یا اس کے لیے قیمت نہ دے کر دوسروں پر تکیہ کرنا ہی اپنی شان کے مناسب سمجھتا ہے۔ یا وہ اس خیال میں رہتا ہے کہ آپ ہی آپ ہمیں آزادی مل جائے گی۔ کانگریس کے دورِ اوّل میں وہ اس لیے خائف رہا۔ کانگریس کے دور ثانی میں بھی اس کی یہی حالت رہی۔ وہ صریح دیکھ رہا ہے کہ جو کچھ اسے ملا اور جسے وہ اپنا حق سمجھتا ہے وہ دوسروں کے ایثار اور قربانی کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی اس ایثار اور قربانی میں شریک نہیں ہوتا۔ یہی Bougus فضا ہے اور یہی نادار فرقہ کو دوسرے فرقہ کا دشمن بنادیتا ہے۔

کانپور میں ایک ادیب نے دھوکا دیا تھا۔ یہاں لکھنؤ میں ایک چالاک نوجوان نے ایسا مونڈا کہ کہنے کی بات نہیں۔ جیسا جنیندر کمار کو بتلایا اس نے اپنی شادی کروائی۔ بہو کے لیے سونے کی چوڑیاں بنوائیں۔ اس کا پتہ تو میری بیوی کو بھی نہیں ہے جو ایک دو کہانیوں کے پیسے پاتا ہوں اس سے سرات کا دیتا چکتا کرتا ہوں۔ وہ لڑکا ٹھگ نکلا۔ اسی کو لے کر ایک افسانہ "ڈھپور سنگھ" لکھا۔ قصہ یوں ہے۔

○

مرادآباد میں ایک میرے پرانے دوست ہیں، جنھیں دل میں تو میں ایک ہیرا سمجھتا ہوں لیکن پکارتا ہوں ڈھپور سنگھ کہہ کر۔ اور وہ بُرا بھی نہیں مانتے۔ بھگوان نے انھیں جتنا بڑا دل دیا ہے اس کی آدھی بھی عقل دی ہوتی تو آج وہ کچھ اور ہوتے۔ انھیں ہمیشہ تنگ دست ہی دیکھا، مگر کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے کبھی نہیں دیکھا۔ ہم دونوں نے بہت دنوں تک ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کی ہے۔ خاصی بے تکلفی ہے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے لیے سو پچاس روپے سے ان کی امداد کرنا کوئی بڑی بات نہیں اور میں بڑی خوشی سے کروں گا، کبھی مجھ سے ایک پائی کے روادار نہ ہوئے۔ اگر چپکے سے بچوں کو دو چار روپے دے دیتا ہوں تو رخصت ہوتے وقت اس کی دوگنی رقم کے مرادآبادی برتن لادنے پڑتے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ اصول بنالیا ہے

کہ جب ان کے پاس جاتا ہوں تو ایک دو دن میں جتنی بڑی سے بڑی چپت دے سکتا ہوں، دیتا ہوں۔ موسم میں جو مہنگی سے مہنگی چیز ہوتی ہے، وہی کھاتا ہوں، اور مانگ مانگ کر کھاتا ہوں۔ مگر دل کے ایسے بے حیا ہیں کہ اگر ایک دفعہ بھی ادھر سے نکل جاؤں اور ان سے نہ ملوں تو بُری طرح ڈانٹ بتاتے ہیں۔ ادھر دو تین سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جی دیکھنے کو چاہتا تھا۔ مئی میں نینی تال جاتے ہوئے ان سے ملنے کے لیے اُتر پڑا۔ چھوٹا سا گھر ہے۔ چھوٹا کنبہ، دروازے پر آواز دی۔ "ڈھپور سنگھ" فوراً باہر نکل آئے اور گلے سے لپٹ گئے۔ تانگے پر سے میرے ٹرنک کو اُتار کر کندھے پر رکھا، بستر بغل میں دبایا اور گھر میں داخل ہو گئے۔ کہتا ہوں بستر مجھے دے دو، مگر کون سنتا ہے۔ اندر قدم رکھا تو دیوی جی کے درشن ہوئے۔ چھوٹے بچے نے آ کر پرنام کیا۔ بس یہی کنبہ ہے۔

کمرے میں گیا تو دیکھا، خطوں کا ایک دفتر پھیلا ہوا ہے۔ خطوں کو محفوظ رکھنے کی تو ان کی عادت نہیں۔ اتنے خط کس کے ہیں؟ بڑی بیقراری سے دریافت کیا: "یہ کیا کوڑا پھیلا رکھا ہے جی، سمیٹو۔"

دیوی جی مسکرا کر بولیں: "کوڑا نہ کہیے۔ ایک ایک خط ادب کا ہیرا ہے۔ آپ تو ادھر آئے نہیں۔ ان کے ایک نئے دوست پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ انھیں کے دستِ مبارک کا پرساد ہے۔

"ڈھپور سنگھ" نے اپنی ننھی ننھی آنکھیں سکوڑ کر کہا: "تم اس کے نام سے کیوں اتنا جلتی ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر تمھارے دو چار سو روپے اس پر آتے ہیں تو ان کا دین دار میں ہوں۔ وہ بھی ابھی جیتا جاگتا ہوں کسی کو بے ایمان کیوں سمجھتی ہو! یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اسے ابھی سہولیت نہیں ہے۔ اور پھر دو چار سو روپے ایک دوست کے ہاتھ ڈوب ہی جائیں تو کیوں روؤں۔ مانا ہم غریب ہیں، دو چار سو روپے ہمارے لیے دو چار لاکھ سے کم نہیں۔ لیکن کھایا تو ایک دوست نے۔

دیوی جی جس قدر حسین تھیں، زبان کی اسی قدر تیز، بولیں: "اگر ایسوں کا ہی نام دوست ہے تو میں نہیں سمجھتی کہ دشمن کسے کہتے ہیں۔"

ڈھپور سنگھ نے میری طرف دیکھ کر گویا مجھ سے حامی بھروانے کے لیے کہا: "عورتوں کا دل بہت ہی تنگ ہوتا ہے۔"

دیوی جی عورت ذات پر یہ الزام کیسے برداشت کر سکتی تھیں، آنکھیں پھرا کر بولیں: "یہ کیوں نہیں کہتے کہ الو بنا کر لے گیا، اوپر سے بیکڑی جتاتے ہو۔ میں جانتی ہوں روپیہ ہاتھ کا

میل ہے۔ یہ میں بھی سمجھتی ہوں کہ جس کے مقدر میں جتنا ہوتا ہے اتنا وہ کھاتا ہے۔ مگر میں یہ کبھی نہ مانوں گی کہ وہ شریف تھا یا با اصول شخص تھا۔ یہ تھا وہ تھا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے، مکار تھا، فریبی تھا۔ بس، میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں۔"

ڈھپور سنگھ نے گرم ہو کر کہا: "میں ایسے تسلیم نہیں کر سکتا۔"

دیوی جی بھی گرم ہو کر بولیں: "تمھیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ مہاشے جی آ گئے ہیں۔ میں انھیں پنچ بدتی ہوں۔ اگر یہ کہہ دیں گے کہ وہ شرافت کا پتلا تھا، اصولوں کا پابند تھا۔ بہادر تھا تو میں تسلیم کر لوں گی، اور پھر اس کا نام نہ لوں گی۔ اور ان کا فیصلہ میرے موافق ہوا تو لالہ نہیں ان کو اپنا بہنوئی کہنا پڑے گا۔"

میں نے پوچھا: "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ آپ کس کا ذکر کر رہی ہیں؟ وہ کون تھا؟"

دیوی جی نے آنکھیں نچا کر کہا: "ان ہی سے پوچھو کون تھا۔ ان کا بہنوئی تھا۔"

ڈھپور سنگھ نے جھینپ کر کہا: "اجی، ایک ادیب تھا۔ کرنا کر جوشی بیچارہ مصیبت کا مارا یہاں آ پڑا تھا۔ اس وقت تو یہ بھی بھیا بھیا کرتی تھیں۔ حلوہ بنا بنا کر کھلاتی تھیں۔ اس کے غم کی داستان سن کر آنسوئے بہاتی تھیں اور آج وہ دغاباز ہے۔ جھوٹا ہے۔ بدکار ہے۔"

دیوی جی نے کہا: "وہ تمھاری خاطر تھی۔ میرا خیال تھا مضمون نگار ہو۔ لیکچر دیتے ہو ادب کے جانکار بنتے ہو۔ کچھ تو انسان کی پہچان ہوگی۔ لیکن اب معلوم ہو گیا کہ قلم گھسنا اور بات ہے انسان کی ذات پہچاننا اور بات۔"

میں اس جوشی کی داستان سننے کے لیے بیقرار ہوا تھا۔ ڈھپور سنگھ تو اپنا جھگڑا سنانے کو تیار تھے۔ مگر دیوی جی نے کہا: "کھانے پینے سے فارغ ہو کر پنچایت بیٹھے۔" میں نے بھی اسے منظور کر لیا۔

دیوی جی گھر میں جاتی ہوئی بولیں: "تمھیں قسم ہے جو ابھی جوشی کے متعلق ایک لفظ بھی ان سے کہو۔ میں کھانا بنا کر جب تک کھلا نہ لوں تب تک دونوں آدمیوں پر دفعہ ۱۴۴ ہے۔"

ڈھپور سنگھ نے آنکھ مار کر کہا: "تمھارا نمک کھا کر یہ تمھاری طرف داری کریں گے ہی۔"

بارے دیوی جی کے کانوں میں یہ جملہ نہ پڑا دھیمی آواز میں کہا گیا تھا نہیں تو دیوی جی نے کچھ نہ کچھ جواب ضرور دیا ہوتا۔ دیوی جی چولہا جلا کر چکیں اور ڈھپور سنگھ ان کی طرف سے بے فکر ہو گئے تو مجھ سے بولے: "جب تک وہ رسوئی میں ہیں مختصر تمھیں وہ داستان سنا دوں!"

میں نے ایمان کی آڑ لے کر کہا۔ "نہیں بھائی میں پنچ بن گیا ہوں اس سلسلے میں کچھ نہ

سنوں گا۔ انھیں آ جانے دو۔"

"مجھے ڈر ہے کہ تم انھیں کا سا فیصلہ کرو گے اور پھر وہ میرا گھر میں رہنا مشکل کر دے گی۔

میں نے تسلی دی: "یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ میں کیا فیصلہ کروں گا؟"

"میں تمھیں جانتا جو ہوں۔ تمھاری عدالت میں عورت کے سامنے مرد کبھی جیت ہی نہیں سکتا۔"

"تو کیا چاہتے ہو۔ تمھاری ڈگری کر دوں!"

"کیا دوست کا اتنا حق بھی ادا نہیں کر سکتے؟"

"اچھا لو تمھاری فتح ہو گی۔ خواہ گالیاں ہی کیوں نہ ملیں۔"

کھاتے پیتے دو پہر ہو گیا۔ رات کا جاگا تھا۔ سونے کی خواہش ہو رہی تھی۔ لیکن دیوی جی کب ماننے والی تھیں۔ کھانا کھا کر آ پہنچیں۔ ڈھپور سنگھ نے خطوں کا پلندہ سمیٹا اور داستان بیان کرنے لگے۔

دیوی جی نے ہوشیار کیا: "ایک لفظ بھی جھوٹ بولے تو جرمانہ ہو گا۔"

ڈھپور سنگھ نے سنجیدہ ہو کر کہا: "جھوٹ وہ بولتا ہے جس کی دلیلیں کمزور ہوتی ہیں مجھے تو اپنی فتح کا یقین ہے۔"

اس کے بعد داستان شروع ہو گئی:

"دو برس سے زیادہ عرصہ ہوا۔ ایک روز میرے پاس ایک خط آیا۔ جس میں ادبی خدمت گار کے ناطے ایک ڈرامے کا دیباچہ لکھنے کی التجا کی گئی تھی۔ یہ گرنا کر کا خط تھا۔ اس ادبی طریقے سے میرا ان سے پہلا تعارف ہوا۔ ادیبوں کی اس زمانے میں جو خستہ حالت ہے اس کا تجربہ کر چکا ہوں، اور کرتا رہتا ہوں۔ اور اگر دیباچہ تک بات رہے تو ان کی خدمت کرنے میں پس و پیش نہیں ہوتا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔ آپ ڈرامہ بھیج دیجیے۔ ایک ہفتے میں ڈرامہ آ گیا۔ لیکن اب خط میں دیباچہ لکھنے کی ہی نہیں کوئی پبلشر ٹھیک کر دینے کی بھی التجا کی گئی تھی۔ میں پبلشروں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔ دو ایک دفعہ پڑ کر کئی دوستوں کو جانی دشمن بنا چکا ہوں۔ میں نے ڈرامے کو پڑھا۔ اس کا دیباچہ لکھا اور مسودہ واپس کر دیا۔ ڈرامہ مجھے خوبصورت نظر آیا اس لیے دیباچہ بھی تعریفی تھا۔ کتنی ہی کتابوں کے دیباچے لکھ چکا ہوں، کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن اب کی دیباچہ لکھ کر پنڈ نہیں چھوٹا۔ ایک ہفتے کے بعد ایک مضمون آیا کہ اسے رسالے میں شائع کر دیجیے (ڈھپور سنگھ ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں) اُسے بُرائی کہیے یا اچھائی

میں دوسروں کا یقین بہت جلد کر لیتا ہوں۔ اور جب کسی مصنف کا معاملہ ہو تو میری یقین کرنے کی حرکت اور تیز ہو جاتی ہے۔ میں اپنے ایک دوست کو جانتا ہوں جو ادیبوں کے سایے سے بھاگتے ہیں اور خود ایک کامیاب مصنف ہیں۔ بہت ہی شریف ہیں۔ بہت ہی زندہ دل ہیں۔ اپنی شادی کر کے واپسی پر جب راستے میں مجھ سے ملاقات ہوئی، کہا۔ آپ کی مٹھائی رکھی ہوئی ہے۔ بھجوا دوں گا۔ لیکن مٹھائی آج تک نہیں آئی۔ حالانکہ اب بھگوان کے فضل سے شادی کے درخت میں پھل بھی لگ آئے۔ لیکن خیر، میں ادبی خدمت گاروں سے اتنا چوکنا نہیں رہتا۔ ان خطوں میں کتنا اصرار، التجا اور احترام ہوتا تھا کہ مجھے جوشی سے بغیر دیکھے ہی محبت ہو گئی۔ معلوم ہوا، ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ گھر سے اس لیے نکل آیا ہے کہ اس کے چچا جہیز کی لمبی لمبی رقم لے کر اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ یہ اسے منظور نہ ہوا۔ اس پر چچا نے اسے گھر سے نکال دیا۔ باپ کے پاس گیا۔ والد بھائی کے مثالی مرید تھے۔ اس نے چچا کے فیصلے کی اپیل نہ سنی۔ ایسی صورت میں اصول کا شکار نوجوان سوائے گھر سے نکل بھاگنے کے اور کیا کرتا؟ اس طرح جنگل جنگل پیتے توڑتا۔ دربدر ٹھوکریں کھاتا وہ گوالیار آ گیا تھا۔ اس پر بدہضمی کا مریض۔ متواتر رہنے والے بخار میں مبتلا۔ آپ ہی بتائیے۔ ایسے شخص سے کیوں آپ کی ہمدردی نہ ہوتی۔ پھر جب ایک شخص آپ کو عزیز برادر لکھتا ہے، اپنے دل کے راز آپ کے سامنے کھول دیتا ہے۔ مصیبت میں بھی صبر اور محنت کا دامن نہیں چھوڑتا۔ سخت سے سخت محنت کرنے کو تیار ہے تو اگر آپ میں تھوڑی سی بھی انسانیت ہے تو آپ اس کی مدد ضرور کریں گے۔

''اچھا، اب پھر ڈرامے کی طرف آیئے۔ کئی دنوں بعد جوشی کا خط پریاگ سے آیا وہ وہاں کے ایک ماہانہ رسالے کے ایڈیٹوریل سیکشن میں ملازم ہو گیا تھا۔ یہ خط پا کر مجھے کتنا اطمینان اور خوشی ہوئی، بیان نہیں کر سکتا۔ کتنا محنتی آدمی ہے اس کے لیے میری محبت اور بھی گہری ہو گئی۔ رسالے کا مالک ایڈیٹر سختی سے پیش آتا تھا، ذرا سی دیر ہو جانے پر دن بھر کی مزدوری کاٹ لیتا تھا۔ بات بات پر گھڑکیاں جماتا تھا۔ لیکن یہ ستیا گرہی بہادر سب کچھ برداشت کرتے اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ اپنا مستقبل بنانے کا اب شاندار موقع پا کر کیسے چھوڑ سکتا تھا یہ تمام باتیں پیار اور یقین و اعتقاد میں اضافہ کرنے والی تھیں ایک آدمی کو مصیبتوں کا مقابلہ کرتے دیکھ کر کے اس سے محبت نہ ہوگی۔ اعتقاد نہ ہوگا۔ فخر نہ ہوگا۔

''پریاگ میں وہ زیادہ نہ ٹھہر سکا، اس نے مجھے لکھا، میں سب کچھ جھیلنے کو تیار ہوں۔ بھوکوں مرنے کو تیار ہوں، لیکن خود داری پر داغ نہیں لگا سکتا۔ بُرے الفاظ برداشت نہیں کر سکتا۔

''اب کردار اگر آپ کو متاثر نہ کر سکے تو میں کہوں گا، آپ چالاک خواہ کتنے ہی ہوں لیکن آپ کے سینے میں دل نہیں ہے۔

''ایک ہفتے کے بعد پریاگ سے پھر خط آیا: 'یہ سلوک میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ آج میں نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں نے ہلکے دل سے لگی لگائی روزی چھوڑ دی میں نے وہ سب کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ یہاں تک کہ کچھ کچھ وہ بھی کیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن خودداری کا خون نہیں کر سکتا۔ اگر یہ کر سکتا تو مجھے گھر چھوڑ کر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے بمبئی جا کر اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرا پختہ عہد ہے کہ اپنے گھر والوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا۔ ان سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا مجھے قلی گیری کرنی منظور ہے نوکری ڈھونا منظور ہے، لیکن اپنی روح کو داغ دار نہیں بنا سکتا۔'

''میری عقیدت میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ شخص اب میرے لیے صرف ڈرامے کا کردار نہ تھا جس کے سکھ سے سکھی اور دکھ سے دکھی ہونے پر بھی ہم تماش بین ہی بنے رہتے ہیں وہ اب میری اتنے قریب پہنچ گیا تھا کہ اس پر چوٹ پڑتے دیکھ میں اس کی حفاظت کرنے کو تیار تھا۔ ڈوبتے دیکھ کر پانی میں کودنے سے بھی نہ ہچکتا۔

''میں بڑی بے قراری سے اس کے بمبئی سے آنے والے خط کا انتظار کرنے لگا۔ چھ دن بعد خط آیا وہ بمبئی میں کام تلاش کر رہا تھا۔ لکھا تھا۔ 'گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سب کچھ جھیلنے کو تیار رہوں۔' پھر دو دو چار چار دن کے فرق سے کئی خط آئے۔ وہ بہادروں کی طرح دشواریوں کے مقابلے کمر کسے کھڑا تھا۔ حالانکہ تین دن سے اسے کھانا نہیں ملا تھا۔

''اوہ، کس قدر بلند خیالات ہیں۔ کس قدر پاک صاف کردار ہے۔ میں سمجھتا ہوں میں نے اس وقت بہت کنجوسی کی۔ میری روح نے مجھے لعنت ملامت دی۔ وہ بیچارہ کتنی تکلیفیں برداشت کر رہا ہے اور تم بیٹھے دیکھ رہے ہو۔ کیوں اس کے پاس کچھ روپے نہیں بھیجتے۔ میں نے روح کے کہنے پر عمل نہیں کیا۔ لیکن اپنی بے دردی پر دکھی ضرور تھا۔

''جب کئی روز کی بے چینی بھرے انتظار کے بعد یہ خبر آئی کہ ایک ہفتے وار اخبار کے ایڈیٹوریل کے شعبے میں جگہ پا گیا ہے تو میں نے چین کی سانس لی۔ اور سچے من سے بھگوان کا شکر ادا کیا۔

''ہفتے وار رسالے میں جوشی کے مضمون شائع ہونے لگے۔ انھیں پڑھ کر مجھے فخر ہوتا تھا۔ کتنے جاندار کتنے پُر خیال مضامین تھے۔ اس نے مجھ سے بھی مضامین مانگے۔ مجھے فرصت نہ تھی۔ معافی مانگی حالانکہ اس موقع پر اسے بڑھاوا نہ دینے پر مجھے بے حد افسوس ہوتا تھا۔

''لیکن شاید مصیبتیں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی تھیں۔ اخبار کے گاہک کم تھے چندے اور ڈونیشن سے کام چلتا تھا۔ روپے ہاتھ آجاتے تو ملازموں کو تھوڑا تھوڑا مل جاتا نہیں تو اُمید لگائے کام کرتے رہتے۔ اس صورت میں غریب نے تین مہینے گزارے ہوں گے۔ اُمید تھی تین مہینے کا حساب ہوگا، اچھی رقم ہاتھ لگے گی، مگر وہاں سوکھا جواب ملا۔ مالک نے ٹاٹ الٹ دیا۔ اخبار بند ہوگیا اور ملازموں کو اپنا سا منہ لیے رخصت ہونا پڑا۔ مالک کی شرافت میں شک نہیں، لیکن روپے کہاں سے لاتا۔ شرافت کے ناطے لوگ نصف تنخواہ پر کام کر سکتے تھے۔ لیکن پیٹ باندھ کر کام کرنا کب ممکن تھا! اور پھر بمبئی کا خرچ، بے چارے جوشی کو پھر ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ میں نے خط پڑھا تو بہت دکھ ہوا۔ بھگوان نے مجھے اس لائق نہ بنایا۔ نہیں تو بیچارہ کیوں پیٹ کے لیے یوں مارا مارا پھرتا۔

''بارے، اب کی بہت حیران نہ ہونا پڑا۔ کسی مل میں گانٹھوں پر نمبر لکھنے کا کام مل گیا۔ ایک روپیہ روز مزدوری تھی۔ بمبئی میں ایک روپیہ ادھر کے چار آنے کے برابر سمجھو۔ کیسے اس کا کام چلتا تھا بھگوان ہی جانے۔ کئی روز کے بعد ایک لمبا خط آیا۔ ایک جرمن ایجنسی اسے رکھنے پر تیار تھی۔ اگر وہ فوراً سو روپے کی ضمانت دے سکے۔ ایجنسی یہاں کی فوجوں میں جوتے۔ سگار، صابن وغیرہ سپلائی کرنے کا کام کرتی تھی۔ اگر یہ جگہ اسے مل جاتی تو اس کے دن آرام سے کٹنے لگتے۔ لکھا تھا: 'اب زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔ ہمت جواب دے گئی ہے۔ خودکشی کرنے کے سوائے اور کوئی طریقہ سوجھ نہیں رہا۔ صرف ماں کی فکر ہے وہ رو کر جان دے دے گی والد کے ساتھ انھیں جسمانی سکھوں کی کمی نہیں۔ لیکن میرے لیے ان کی روح تڑپتی رہتی ہے۔ میری ہی خواہش ہے کہ کہیں بیٹھنے کا ٹھکانہ مل جاتا تو ایک دفعہ انھیں اپنے ساتھ رکھ کر ان کی جتنی خدمت ہو سکتی، کرتا۔ اس کے سوا میری اور کوئی خواہش نہیں ہے۔ لیکن ضمانت کہاں سے لاؤں! بس کل کا دن اور ہے پرسوں کوئی دوسرا اُمیدوار ضمانت دے کر یہ جگہ لے لے گا اور میں تاکتا رہ جاؤں گا۔ ایجنٹ مجھے رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اپنے آفس کے قاعدوں کو کیا کرے۔

''اس خط نے میری کنجوسی کی عادت کو بس میں کرلیا۔ چاہنے پر کوئی نہ کوئی راہ نکل آتی ہے۔ میں نے روپے بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر اتنی مدد سے ایک نوجوان کی زندگی سدھر رہی ہو تو کون ایسا ہے جو منہ چھپا لے۔ اس سے بڑا روپیوں کا صحیح استعمال اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہندی میں قلم گھسنے والوں کے پاس اتنی بڑی رقم ذرا مشکل سے ہی ملتی ہے۔ لیکن اتفاق سے اس وقت میرے خزانے میں روپے موجود تھے۔ میں اس کے لیے اپنی کنجوسی کا احسان مند ہوں۔ دیوی جی سے صلاح کی۔ وہ بڑی خوشی سے راضی ہوگئیں۔ حالانکہ اب سارا الزام میرے سر منڈھا

جاتا ہے۔ کل روپیوں کا پہنچنا ضروری تھا۔ نہیں تو موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ منی آرڈر تین دن میں پہنچے گا۔ فوراً، تار گھر پہنچا اور تار سے روپے بھیج دیے۔ جس نے برسوں کی کاٹ چھانٹ کے بعد اتنے روپے جمع کیے ہوں۔ اور جسے مستقبل میں بھی روپیوں کی کمی نظر آ رہی ہو وہی اس لذت کو محسوس کر سکتا ہے، جو اس وقت مجھے ہوئی۔ سیٹھ امیر چند کو دس لاکھ خیرات کر کے بھی اتنی خوشی حاصل نہ ہوئی ہوگی۔ دیا تو میں نے قرض سمجھ کر ہی، مگر یہ دوستی کا قرض تھا جس کی ادائیگی خواب کا حقیقت بن جانا ہوتا ہے۔

''اس خط کو میں کبھی نہ بھولوں گا جو شکریہ کی شکل میں چوتھے روز مجھے ملا۔ کیسے حقیقی جذبات و خیالات تھے۔ ایک ایک لفظ احسان مندی میں غرق تھا۔ میں اسے ایک ادبی چیز سمجھتا ہوں۔''

دیوی جی نے چٹکی لی: ''سو روپے میں اس سے بہت اچھا خط مل سکتا ہے۔''

ڈھپور سنگھ نے کچھ جواب نہ دیا، وہ داستان بیان کرنے میں مصروف تھے:

''بمبئی میں وہ کسی مشہور جگہ پر ٹھہرا تھا۔ صرف نام اور پوسٹ باکس لکھنے میں ہی اسے خط مل جاتا تھا۔ وہاں سے کئی خط آئے۔ وہ خوش تھا۔''

دیوی جی پھر بولیں: ''خوش کیوں نہ ہوتا۔ کپے میں ایک چڑیا پھنس گئی تھی۔''

ڈھپور سنگھ نے چڑ کر کہا: ''یا تو مجھے کہنے دو یا تم کہو۔ بیچ میں مت بولو۔''

''بمبئی سے کئی دن کے بعد ایک خط آیا کہ ایجنسی نے اس کے کام سے خوش ہو کر اسے کاشی تعینات کر دیا ہے، اور وہ کاشی آ رہا ہے۔ اسے تنخواہ کے علاوہ بھتا بھی ملے گا۔ کاشی میں اس کے خالو تھے، جو وہاں کے مشہور ڈاکٹر تھے۔ لیکن وہ ان کے گھر نہ اُتر کر الگ ٹھہرا۔ اس سے اس کی خودداری کا پتہ چلتا ہے۔ مگر ایک ماہ میں ہی اس کا کاشی سے جی بھر گیا۔ شکایت بھرے خط آنے لگے: صبح سے شام تک فوجیوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ صبح کا گیا دس بجے رات کو گھر آتا ہوں۔ اس وقت اندھیرا اکیلا گھر دیکھ کر دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ کس سے بولوں! کس سے ہنسوں؟ بازار کی پوریاں کھاتے کھاتے تنگ آ چکا ہوں۔ میں نے سمجھا تھا اب کچھ روز چین سے گزریں گے، لیکن معلوم ہوتا ہے ابھی قسمت میں ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔ میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکتا رات رات بھر پڑا روتا رہتا ہوں۔ مجھے ان خطوں میں وہ اپنے اصولوں سے گرتا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ لگی روزی مت چھوڑو۔ کام کیے جاؤ۔ جواب آیا، مجھ سے اب یہاں نہیں رہا جاتا۔ فوجیوں کا سلوک ناقابلِ برداشت ہے۔ پھر منیجر صاحب مجھے رنگون بھیج رہے ہیں، اور رنگون جا کر میں بچ نہیں سکتا۔ میں کوئی ادبی کام کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دن

آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں۔

''میں اس خط کا جواب دینے جا ہی رہا تھا کہ پھر خط آیا: میں کل دہرادون ایکسپریس سے آرہا ہوں۔ دوسرے دن وہ آپہنچا۔ دُبلا پتلا سا آدمی۔ سانولا رنگ، لمبا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، انگریزی لباس، ساتھ میں کئی چمڑے کے ٹرنک، ایک سوٹ کیس ایک ہول ڈال میں تو اس کا ٹھاٹھ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔''

دیوی جی نے لقمہ دیا: ''پھر بھی تو نہ چھپتے۔''

''میں نے سمجھا تھا گاڑھے کا کرتہ، چپل زیادہ سے زیادہ فاؤنٹین پین والا آدمی ہوگا۔ مگر وہ حضرت تو پورے صاحب بہادر نکلے۔ مجھے اس چھوٹے سے گھر میں ٹھہراتے ہوئے ہچک ہوئی۔''

دیوی جی سے بغیر بولے نہ رہا گیا: ''آتے ہی قدموں پر سر تو رکھ دیا۔ اب اور کیا چاہتے تھے۔''

ڈھپور سنگھ اب کی مسکرائے: ''دیکھو شیاما بیچ بیچ میں ٹوکومت۔ عدالت کی عزت کا تقاضہ ہے کہ ابھی خاموشی سے سنتی جاؤ۔ جب تمھاری باری آئے تو جو چاہے کہنا۔''

پھر سلسلہ شروع ہوا: ''تھا تو دُبلا پتلا، مگر بڑا پھرتیلا، بات چیت میں بہت ہوشیار ایک جملہ انگریزی بولتا، ایک جملہ ہندی، اور ہندی میں انگریزی کھچڑی۔ جیسی آپ جیسے مہذب لوگ بولتے ہیں۔ بات چیت شروع ہوئی: آپ کے درشنوں کی بڑی خواہش تھی۔ میں نے جیسا اندازہ لگایا تھا۔ ویسا ہی آپ کو دیکھا۔ بس اب معلوم ہو رہا ہے کہ میں بھی آدمی ہوں۔ اتنے دنوں تک قیدی تھا۔''

میں نے کہا: 'تو کیا استعفیٰ دے دیا'۔

'نہیں، ابھی تو چھٹی لے کر آیا ہوں۔ ابھی اس مہینے کی تنخواہ بھی نہیں ملی۔ میں نے لکھ دیا ہے، یہاں کے پتے پر بھیج دیں۔ نوکری تو اچھی ہے۔ مگر کام بہت کرنا پڑتا ہے اور مجھے کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملتا'۔

''خیر۔ رات کو تو میں نے اسی کمرے میں اسے سلایا۔ دوسرے دن یہاں کے ایک ہوٹل میں انتظام کر دیا۔ ہوٹل والے پیشگی روپے لیتے ہیں جوشی کے پاس روپے نہ تھے۔ مجھے تیس روپے دینے پڑے، میں نے سمجھا۔ اس کی تنخواہ آتی ہی ہوگی۔ لے لوں گا۔

''یہاں میرے ایک ماتھر دوست ہیں۔ ان سے بھی میں نے جوشی کا ذکر کیا تھا۔ اس کے آنے کی خبر پاتے ہی ہوٹل دوڑے۔ دونوں میں دوستی ہوگی۔ جوشی دن میں دو تین دفعہ اور

ایک دفعہ رات کو ضرور آتا اور خوب باتیں کرتا۔ دیوی جی اسے ہاتھوں پر لیے رہتیں۔ کبھی اس کے لیے پکوڑیاں بن رہی ہیں۔ کبھی حلوہ، ہرفن مولا تھا۔ گانے میں ماہر۔ ہارمونیم میں ماہر۔ اِندر جال کے کرتب دکھانے میں ماہر۔ سالن اچھا پکاتا تھا۔ دیوی جی کو گانا سیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اسے میوزک ماسٹر بنالیا۔"

دیوی جی سرخ چہرہ کر کے بولیں: "تو کیا مفت میں حلوہ، پکوڑیاں اور پان بنا بنا کر کھلاتی تھی؟"

"ایک ہفتہ گزر گیا، لیکن جوشی کی تنخواہ نہیں آئی۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ سوچا اپنے دل میں سمجھے گا ہوٹل والوں نے روپیوں کا تقاضا شروع کر دیا۔ ماتھر کے گھر میں اس نے آنا جانا شروع کر دیا۔ دونوں ساتھ گھومنے جاتے۔ ساتھ رہتے۔ جوشی جب آتا ماتھر کا بکھان کرتا، ماتھر جب آتے جوشی کی تعریف کرتے جوشی کے پاس اپنے تجربات کا خزانہ تھا۔ وہ فوج میں رہ چکا تھا۔ جب ان کی منگیتر کی شادی دوسرے شخص سے ہو گئی تو غم میں اس نے فوجی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ سماجی زندگی کے نہ جانے کتنے واقعات اُسے یاد تھے اور جب اپنے ماں باپ اور چچا چچی کا ذکر کرنے لگتا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ دیوی جی بھی اس کے ساتھ روتیں۔"

دیوی جی ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئیں۔ بات سچی تھی۔

"ایک روز اپنے ڈرامے کی بڑی تعریف کی۔ وہ ڈرامہ کلکتہ میں کھیلا گیا، اور مدن کمپنی کے منیجر نے اسے مبارکباد دی۔ ڈرامے کے دو چار ٹکڑے جو اس کے پاس پڑے تھے۔ مجھے سنائے۔ مجھے ڈرامہ بہت پسند آیا۔ اس نے جوشی کے ایک پبلشر کے ہاتھ وہ ڈرامہ فروخت کر دیا تھا۔ کل پچیس روپے میں۔ میں نے کہا اسے واپس منگالو۔ روپے میں دوں گا۔ ایسی خوبصورت تصنیف کسی اچھے پبلشر کو دیں گے یا کسی تھیٹر کمپنی سے کھلوائیں گے۔ تین چار دن کے بعد معلوم ہوا کہ پبلشر اب پچاس روپے لے کر واپس کرے گا۔ کہتا ہے اس کا کچھ حصہ شائع ہو چکا ہے۔ میں نے کہا۔ منگالو، پچاس روپے ہی سہی۔ ڈرامہ وی۔ پی۔ سے واپس آیا۔ میں نے پچاس روپے دے دیے۔

مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ ہوٹل والے دوسرا مہینہ شروع ہوتے ہی روپے پیشگی مانگیں گے۔ میں اس فکر میں تھا کہ جوشی نے آ کر کہا: "میں اب ماتھر کے ساتھ رہوں گا۔ بیچارہ غریب آدمی ہے۔ اگر میں تیس روپے بھی دے دوں گا تو اس کا کام چل جائے گا۔' میں بہت خوش ہوا۔ دوسرے دن وہ ماتھر کے گھر ڈٹ گیا۔

"وہ آتا تو ماتھر کے گھر کا کوئی نہ کوئی راز لے کر آتا۔ یہ میں جانتا تھا کہ ماتھر کی مالی حالت اچھی نہیں ہے، بیچارہ ریلوے کے دفتر میں ملازم تھا۔ وہ ملازمت بھی چھوٹ چکی تھی، مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے یہاں فاقے ہو رہے ہیں۔ کبھی مالک مکان آ کر گالیاں سنا جاتا ہے، کبھی دودھ والا۔ کبھی بنیا، کبھی کپڑے والا۔ بیچارہ ان سے منہ چھپاتا پھرتا ہے۔ جوشی آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر اس کی مصیبتوں کی دردبھری داستان سناتا اور روتا۔ ماتھر کی حالت دیکھ کر میں اپنی مصیبتیں بھول گیا۔ مجھے اپنی ہی فکر ہے، کوئی دوسری فکر نہیں۔ میرا خیال کہ میں ہی مصیبت کا مارا ہوں۔ میں تو جس کے دروازے پر جا پڑوں، دو روٹیاں مل جائیں گی۔ مگر ماتھر کے پیچھے تو ایک پورا کھٹلا ہے۔ ماں، دو بیوہ بہنیں، ایک بھانجی، دو بھانجے ایک چھوٹا بھائی۔ اتنے بڑے کنبے کے لیے پچاس روپے تو صرف دال روٹی کے لیے چاہیے۔ ماتھر واقعی بہادر ہے۔ فرشتہ ہے، جو اتنے بڑے کنبے کا گزارا کر رہا ہے۔ وہ اب اپنے لیے نہیں ماتھر کے لیے دُکھی تھا۔"

دیوی جی نے تنقید کی: "تبھی ماتھر کی بھانجی پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ دُکھ کا بوجھ کیسے نہ ہلکا کرتا۔"

ڈھپور سنگھ نے بگڑ کر کہا: "اچھا تو اب تم ہی کہو۔"

میں نے سمجھایا: "تم تو یار، ذرا ذرا سی بات پر تنک اُٹھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو یہ پھل جھڑیاں مجھے انصاف کے راستے سے ڈگا دیں گی!"

پھر داستان شروع ہوئی: "ایک روز آ کر بولا۔ آج میں نے ماتھر کی نجات کی ترکیب سوچ لی ہے۔ میرے ایک ماتھر دوست بیرسٹر ہیں۔ ان سے ماتھر کی بھانجی جگو کی شادی کے متعلق خط و کتابت کر رہا ہوں۔ اس کی ایک بیوہ بہن کو تینوں بچوں کے ساتھ سسرال بھیج دوں گا۔ دوسری بیوہ بہن اپنے دیور کے پاس جانے پر راضی ہے۔ بس تین چار آدمی رہ جائیں گے۔ کچھ میں دوں گا، کچھ ماتھر پیدا کرے گا۔ گزارا ہو جائے گا۔ مگر آج اس کے گھر کا دو مہینے کا کرایہ دینا ہے۔ مکان مالک نے صبح ہی سے دھرنا دے رکھا ہے۔ کہتا ہے اپنا کرایہ لے کر ہی ہٹوں گا۔ آپ کے پاس تیس روپے ہوں تو دے دیجیے۔ ماتھر کے چھوٹے بھائی کی تنخواہ کل پرسوں تک مل جائے گی، روپے مل جائیں گے۔ ایک دوست مصیبت میں پڑا ہوا ہے۔ دوسرا دوست اس کی سفارش کر رہا ہے، مجھے انکار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دیوی جی نے اس وقت ناک بھوں ضرور سکوڑی تھیں۔ لیکن میں نہ مانا روپے دے دیے۔"

دیوی جی نے ڈنک مارا: "یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ روپے میری بہن نے برتن خرید کر بھیجنے

کے لیے بھیجے تھے۔"

ڈھپور سنگھ نے غصہ پی کر کہا: "خیر، یہی سہی۔ میں نے روپے دے دیے۔ مگر مجھے یہ الجھن ہونے لگی کہ اس طرح تو میرا کچومر ہی نکل جائے گا۔ ماتھر پر ایک نہ ایک آفت روز ہی سوار رہے گی۔ میں کہاں تک انھیں اُدھار دوں گا جوشی بھی، جان کھا رہا تھا کہ کہیں جگہ دلا دیجیے۔ اتفاق سے انھیں دنوں میرے آگرہ کے ایک دوست آ نکلے، کاؤنسل کے ممبر تھے۔ اب جیل میں ہیں۔ گانے بجانے کا شوق ہے۔ دو ایک ڈرامے بھی لکھ چکے ہیں۔ اچھے اچھے رئیسوں سے تعارف ہے۔ خود بھی بڑے شوقین مزاج ہیں۔ اب کی وہ آئے تو میں نے جوشی کا ان سے ذکر کیا۔ اس کا ڈرامہ بھی سنایا۔ بولے۔ تو اسے میرے ساتھ کر دیجیے۔ اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنالوں گا۔ میرے گھر میں رہے۔ میرے ساتھ گھر کے آدمی کی طرح رہے۔ جیب خرچ کے لیے مجھ سے تیس روپے مہینہ لیتا جائے۔ میرے ساتھ ڈرامے لکھے۔ میں پھولا نہ سمایا۔ جوشی سے کہا۔ جوشی بھی تیار ہو گیا۔ لیکن جانے سے پہلے اسے کچھ روپیوں کی ضرورت ہوئی۔ ایک بھلے آدمی کے ساتھ پھٹے حال تو جاتے نہیں بنا اور نہ یہی مناسب تھا کہ پہلے ہی دن سے روپے کا تقاضا ہونے لگے۔ بہت کاٹ چھانٹ کرنے پر بھی چالیس روپے کا خرچ نکل آیا۔ جوتے ٹوٹ گئے تھے۔ دھوتیاں پھٹ گئی تھیں۔ اور بھی کئی خرچ تھے۔ جو اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ میرے پاس روپے نہ تھے۔ شیاما سے مانگنے کا حوصلہ نہ ہوا۔"

دیوی جی بولیں: "میرے پاس تو قارون کا خزانہ رکھا تھا نا۔ کئی ہزار مہینے لاتے ہو۔ سو دو سو بچت میں آ ہی جاتے ہوں گے۔"

ڈھپور سنگھ اس طنز پر توجہ نہ دے کر اپنی داستان کہتے رہے: "روپے پا کر جوشی نے ٹھاٹھ بنایا اور کاؤنسلر صاحب کے ساتھ چل دیا۔ میں اسٹیشن تک پہنچانے گیا۔ ماتھر بھی تھا۔ واپس ہوا تو میرے دل پر سے ایک وزن اُتر گیا تھا۔

ماتھر نے کہا: 'محبتی آدمی ہے۔'

میں نے تائید کی: 'مجھے تو بھائی سا معلوم ہوتا ہے۔'

'مجھے تو اب گھر اچھا نہ لگے گا۔ گھر کے سب لوگ روتے رہے۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کوئی غیر آدمی ہے۔ اماں سے لڑکے کی طرح باتیں کرتا تھا۔ بہنوں سے بھائی کی طرح۔'

'بدنصیب آدمی ہے۔ نہیں۔ جس کا باپ دو ہزار روپے ماہوار کماتا ہو۔ وہ اس طرح مارا مارا پھرے۔'

'دارجلنگ میں اس کے والد کی دو کوٹھیاں ہیں۔'

'آئی۔اے۔ایس۔ہے۔'

'جوشی مجھے بھی وہیں لے جانا چاہتا ہے۔سال دو سال میں تو وہاں جائے گا ہی۔کہتا ہے تمھیں موٹر کی ایجنسی کھلوا دوں گا۔'

اس طرح خیالاتی پلاؤ پکاتے ہوئے ہم لوگ گھر آئے۔

''میں دل میں خوش تھا کہ چلو اچھا ہوا جوشی کے لیے اچھا سلسلہ نکل آیا۔مجھے یہ اُمید بھی بندھ چلی کہ اب کی اسے تنخواہ ملے گی تو میرے روپے دے دے گا۔چار پانچ مہینے میں چکتا کر دے گا۔حساب لگا کر دیکھا تو اچھی خاصی رقم ہو گئی تھی۔میں نے دل میں سمجھا۔یہ بھی اچھا ہی ہوا۔یوں جمع کرتا تو کبھی جمع نہ ہوتے۔اس بہانے سے کس طرح جمع تو ہو گئے۔میں نے سوچا کہ اپنے دوست سے جوشی کی تنخواہ کے روپے پیشگی کیوں نہ لے لوں۔کہہ دوں اس کی تنخواہ سے مہینے مہینے کاٹتے رہیے گا۔

''لیکن ابھی مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں جوشی اور ماتھر دونوں چلے آرہے ہیں۔مجھے ڈر ہوا کہیں جوشی جی پھر تو ملازمت نہیں چھوڑ آئے۔لیکن اندیشے کو دباتے ہوئے بولا: 'کہو بھئی کب آئے! مزے میں تو ہو؟'

جوشی نے بیٹھ کر ایک سگار جلاتے ہوئے کہا: 'بہت اچھی طرح ہوں۔میرے بابو صاحب بہت ہی شریف آدمی ہیں۔میرے لیے علیحدہ ایک کمرہ خالی کرا دیا ہے۔ساتھ ہی کھلاتے ہیں۔بالکل بھائی کی طرح رکھتے ہیں۔آج کل کسی کام سے دہلی گئے ہیں۔میں نے سوچا یہاں پڑے پڑے کیا کروں۔تب تک آپ لوگوں سے ہی مل آؤں۔چلتے وقت بابو صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ مرادآباد سے تھوڑے برتن لیتے آنا۔مگر شاید انھیں روپے دینے کی یاد نہیں رہی۔میں نے اس وقت مانگنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔آپ ایک پچاس روپے دے دیجیے۔میں پرسوں تک جاؤں گا۔میں یہاں سے جاتے ہی بھجوا دوں گا۔آپ تو جانتے ہیں روپے کے معاملے میں وہ کتنے کھرے ہیں۔'میں نے ذرا رُکھائی کے ساتھ کہا: 'روپے تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔''

دیوی جی نے جملہ کسا: ''کیوں جھوٹ بولتے ہو! تم نے رُکھائی کے ساتھ کہا تھا کہ روپے نہیں ہیں؟''

ڈھپور سنگھ نے پوچھا: ''اور کیا چکنائی کے ساتھ کہا تھا؟''

دیوی جی: ''تو پھر کاغذ کے روپے کیوں دے دیے تھے! آئے بڑی رُکھائی کرنے والے۔''

ڈھپور سنگھ نے کہا: ''کہتا صاحب میں نے ہنس کر روپے دے دیے۔ بس اب خوش ہوئیں! تو بھی، مجھے بُرا تو لگا۔ لیکن اپنے شریف دوست کا واسطہ تھا۔ میرے اوپر بیچارے بڑی عنایت رکھتے ہیں۔ میرے پاس رسالے کا کاغذ خریدنے کے لیے پچاس روپے رکھے ہوئے تھے وہ میں نے جوشی کو دے دیے۔

''شام کو ماتھر نے آ کر کہا، 'جوشی تو چلے گئے۔ کہتے تھے بابو صاحب کا تار آ گیا ہے۔ بے حد رحم دل شخص ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کوئی باہری آدمی ہے۔ مزاج بھی بچوں جیسا ہے۔ بھانجی کی شادی طے کرنے کو کہتے تھے۔ لین دین کا تو کوئی ذکر ہے ہی نہیں۔ مگر کچھ نظر تو دینا ہی پڑے گا۔ بیرسٹر صاحب، جن سے شادی ہونے والی ہے، دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ان کے پاس جا کر نذر دینی ہوگی۔ جوشی جی چلے جائیں گے۔ آج میں نے روپے بھی دے دیے۔ چلیے ایک بڑی فکر سر سے ٹلی!''

میں نے پوچھا: 'روپے تو تمھارے پاس نہ ہوں گے؟'

ماتھر نے کہا: 'روپے کہاں تھے صاحب، ایک مہاجن سے اسٹامپ لکھ کر لیے۔ دو روپے سیکڑا سود پر۔'

دیوی جی نے غصے سے کہا: ''میں تو اس کمینے کو پا جاؤں تو منہ نوچ لوں۔ پشاچ نے اس غریب کو بھی نہ چھوڑا۔''

ڈھپور سنگھ بولا: ''یہ غصہ تو آپ کو اب آ رہا ہے نا۔ تب تو آپ بھی سمجھتی تھیں کہ جوشی دیا دھرم کا پتلا ہے۔''

دیوی جی نے مخالفت کی: ''میں نے اسے پتلا پتلی کبھی نہیں سمجھا۔ ہاں تمھاری تعریفوں کے بھلاوے میں پڑ جاتی تھی۔''

ڈھپور سنگھ: ''تو صاحب اس طرح کوئی دو مہینے گزرے، اس دوران بھی جوشی دو تین مرتبہ آیا مگر مجھ سے کچھ مانگا نہیں۔ ہاں اپنے بابو صاحب کے متعلق طرح طرح کی باتیں کیں۔ جن سے مجھے دو چار افسانے لکھنے کا مصالحہ مل گیا۔

مئی کا مہینہ تھا۔ ایک دن صبح صبح جوشی آ پہنچے۔ میں نے پوچھا تو پتہ چلا ان کے بابو صاحب نینی تال چلے گئے۔ انھیں بھی لیے جاتے تھے، مگر انھوں نے ہم لوگوں کے ساتھ یہاں رہنا بہتر سمجھا اور چلے آئے۔''

دیوی جی نے پھل جھڑی چھوڑی: ''کتنا ایثار پسند تھا۔ بیچارہ نینی تال کی بہار چھوڑ کر یہاں گرمی میں جان دینے چلا آیا۔''

ڈھپور سنگھ نے اس کی طرف توجہ نہ دے کر کہا: "میں نے پوچھا کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی وہاں!"

جوشی نے ہنس کر کہا: 'میرے مقدر میں تو نئی نئی آفتیں لکھی ہیں۔ ان سے کیسے جان بچ سکتی ہے۔ اب کی بھی ایک نئی آفت سر پر آ پڑی۔ یہ کہیے آپ کی دُعائیں ساتھ تھیں۔ جان بچ گئی۔ نہیں تو اب تک جمنا جی میں بہا چلا جاتا ہوتا۔ ایک دن جمنا کنارے سیر کرنے چلا گیا۔ وہاں تیراکی کا میچ تھا۔ بہت سے آدمی تماشہ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک جگہ کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ مجھ سے تھوڑی دور پر ایک اور صاحب ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے بات چیت کی تو معلوم ہوا، میری ہی برادری کے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے والد اور چچا دونوں کو ہی جانتے ہیں۔ بڑے پیار سے باتیں کرنے لگے: 'تمھیں اس طرح ٹھوکریں کھاتے بہت دن ہو گئے، کیوں نہیں چلے جاتے اپنے والدین کے پاس؟ مانا ان کی لالچی عادت تمھیں پسند نہیں، لیکن والدین کا بیٹے پر کچھ نہ کچھ حق ہوتا ہی ہے۔ تمھاری والدہ کو کتنا دکھ ہو رہا ہوگا۔ یکا یک ایک نوجوان کسی طرف سے آ نکلا اور بوڑھے اور لڑکی کو دیکھ کر بولا۔ آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ اپنی جوان بیٹی کو اس طرح میلے میں لیے کھڑے ہیں ——— بزرگ کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ لڑکی فوراً گھونگھٹ نکال کر پیچھے ہٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کی شادی اسی نوجوان سے طے ہوئی ہے۔ بزرگ کے سماجک خیال وسیع تھے۔ وہ پردے کے قائل نہ تھے۔ نوجوان عمر میں جوان ہوتے ہوئے بھی گھونگھٹ کے خیالوں کا آدمی تھا۔ پردے کا سخت حمایتی۔ بزرگ تھوڑی دیر تک تو مجرمانہ انداز میں باتیں کرتے رہے۔ لیکن نوجوان ہر لحہ گرم ہوتا چلا گیا۔ آخر بوڑھے بابا کو بھی طیش آ گیا۔ نوجوان نے آنکھیں نکال کر کہا: 'میں ایسی بے حیا سے شادی کرنا خود کے لیے بے عزتی کی بات سمجھتا ہوں۔' بزرگ نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا: 'اور میں تم جیسے بدمعاش سے اپنی بیٹی کی شادی کرنا شرم کی بات سمجھتا ہوں۔' نوجوان نے غصے سے دیوانہ ہو کر بزرگ کا ہاتھ پکڑ کر دھکا دیا۔ باتوں سے نہ جیت کر اب وہ ہاتھوں سے کام لینا چاہتا تھا۔ بزرگ دھکا کھا کر گر پڑے۔ میں نے لپک کر انھیں اُٹھایا اور نوجوان کو ڈانٹا۔ وہ بوڑھے کو چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا میں کوئی کشتی باز تو ہوں نہیں۔ وہ لڑنا جانتا تھا۔ مجھے اس نے بات کی بات میں گرا دیا اور میرا گلا دبانے لگا۔ کچھ آدمی جمع ہو گئے۔ جب تک کشتی ہوتی رہی لوگ کشتی کا مزہ لیتے رہے لیکن جب دیکھا کہ معاملہ سنگین ہوا چاہتا ہے تو فوراً بیچ بچاؤ کر دیا۔ نوجوان بوڑھے بابا سے جاتے جاتے کہہ گیا تم اپنی لڑکی کو رنڈی بنا کر بازار میں گھمانا چاہتے ہو تو اچھی طرح گھماؤ۔ مجھے اب اس سے شادی نہیں کرنی

ہے۔ بزرگ چپ چاپ کھڑے تھے اور لڑکی رو رہی تھی۔ بھائی صاحب تب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا حضرت، آپ میرے والد کے برابر ہیں اور مجھے جانتے ہیں۔ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھیں تو میں ان دیوی جی کو اپنی شریکِ حیات بنا کر خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ میں جس حالت میں ہوں آپ دیکھ رہے ہیں ممکن ہے میری زندگی اسی طرح گزرے۔ لیکن محبت اور عقیدت اگر زندگی کو خوش حال بنا سکتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ دیوی جی کے لیے میرے دل میں ان جذبات کی کمی نہ رہے گی۔' بوڑھے بابا نے بے قرار ہو کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ اسی لمحہ اپنے گھر لے گئے۔ کھانا کھلایا اور شادی کا سگن کر دیا۔ میں ایک دفعہ لڑکی سے مل کر اس کی رائے جاننا چاہتا تھا بوڑھے بابا نے بخوشی اجازت دے دی۔ لڑکی سے مل کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ عورتوں میں ہیرا ہے میں اس کی دانشمندی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اپنے دل میں جس حسینہ کا تصور کیا تھا۔ وہی تھا۔ ہو نہ ہو وہی تھی۔ مجھے اتنی ہی دیر میں یقین ہو گیا کہ میری زندگی اس کے ساتھ خوش حال رہے گی۔ مجھے اب آپ کی دُعا چاہیے۔ لڑکی آپ کا رسالہ پڑھتی ہے اور آپ کے لیے اس کے دل میں بے پناہ عقیدت ہے۔ جون میں شادی ہونا طے ہوا ہے۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ میں زیور کپڑے صرف نام بھر کو لاؤں گا۔ نہ کوئی دھوم دھام ہی کروں گا۔ بزرگ نے کہا۔ میں تو خود بھی کہنے والا تھا۔ میں کوئی تیاری نہیں چاہتا، نہ دھوم دھام کی مجھے خواہش ہے۔ جب میں نے آپ کا نام لیا کہ وہ میرے بڑے بھائی جیسے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ آپ کے مضامین کو بڑی عزت و احترام سے دیکھتے ہیں۔'

''میں نے کچھ ناخوشی سے کہا: 'یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اس وقت تم میں شادی کرنے کی سکت کہاں ہے اور کچھ نہ ہو تو پچاس روپے کی بندھی آمدنی تو ہونی ہی چاہیے۔'

''جوشی نے کہا: 'بھائی صاحب۔ میرا بیڑا شادی سے ہی پار ہوگا۔ میرے گھر سے نکلنے کی وجہ بھی شادی ہی تھی اور گھر واپسی کی وجہ بھی شادی ہی ہوگی۔ جس وقت پر ملا ہاتھ باندھے ہوئے جا کر پتا جی کے قدموں میں گر پڑے گی ان کا پتھر دل بھی پگھل جائے گا۔ سمجھیں گے شادی تو ہو ہی چکی۔ اب بہو پر کیوں ظلم کیا جائے۔ جب اسے پناہ مل جائے گی تو جھک مار کر مجھے بلائیں گے۔ میں اسی ضد پر گھر سے نکلا تھا کہ اپنی شادی اپنی مرضی کے مطابق بغیر کچھ لیے دیے کروں گا، اور میرا یہ عہد پورا ہوا جا رہا ہے۔ پر ملا اتنی سمجھ دار ہے کہ وہ میرے گھر والوں کو چٹکیوں میں منا لے گی۔ میں نے سوچا ہے پرملا کو پہلے یہیں لاؤں گا۔ یہیں سے وہ میرے گھر خط لکھے گی اور آپ دیکھیے گا۔ تیسرے ہی دن چچا صاحب زیوروں کی پٹاری لیے آ پہنچیں گے۔ شادی ہو جانے پر وہ کچھ نہیں کر سکتے اس لیے میں نے شادی کی خبر کسی کو نہیں دی ہے۔''

''میں نے کہا: 'لیکن میرے پاس تو ابھی کچھ نہیں ہے بھائی۔ میں تین سو روپے کہاں سے لاؤں گا؟'

''جوشی نے کہا: 'تین سو روپے نقد تھوڑے ہی لگیں گے۔ کوئی سو روپے کے کپڑے لگیں گے۔ سو روپے کی دو ایک سہاگ کی چیزیں بنوالوں گا اور سو روپے راہ خرچ سمجھ لیجیے۔ ان کا مکان کاشی پور میں ہے۔ وہیں سے شادی کریں گے۔ یہ بنگالی سنار جو سامنے ہے، آپ کے کہنے سے ایک ہفتے کے وعدے پر جو چیزیں مانگوں گا دے دے گا۔ بجاز بھی آپ کے کہنے سے دے دے گا۔ نقد مجھے کل سو روپے کی ضرورت پڑے گی۔ جیوں ہی ادھر سے لوٹا، دے دوں گا۔ بارات میں آپ اور ماتھر کے علاوہ کوئی تیسرا نہ ہوگا۔ آپ کو میں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ لیکن آج تک آپ نے مجھ بھائی سمجھ کر مدد دی ہے اس طرح ایک دفعہ اور دے دیجیے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اس نیک کام میں انکار نہ کریں گے۔ اس لیے میں نے ہاں کہہ دی۔ اب تو آپ کو یہ کشتی کنارے لگانی ہی پڑے گی۔'''

دیوی جی بولیں: ''میں کہتی تھی اسے ایک پیسہ مت دو۔ کہہ دو ہم تمھاری شادی بیاہ کے چکّر میں نہیں پڑتے۔''

ڈھپور سنگھ نے کہا: ''ہاں تم نے اب کی بار ضرور سمجھایا۔ لیکن میں کیا کرتا۔ شادی کا معاملہ، اُس پر اس نے مجھے بھی گھسیٹ لیا تھا۔ اپنی عزت کا کچھ خیال تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

دیوی جی نے میرا لحاظ کیا اور خاموش ہو گئیں۔

''اب میں اس داستان کو بڑھاؤں گا نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جوشی نے سو روپے کے کپڑے اور سو روپے سے کچھ اوپر کے زیور کے لیے۔ شادی میں شریک ہوئے۔ شادی میں خاصی دھوم دھام رہی۔ لڑکی کے پتا نے مہمانوں کی خوب خاطر کی۔ انھیں جلدی تھی۔ اس لیے وہ خود تو دوسرے ہی دن چلے آئے لیکن ماتھر جوشی کے ساتھ شادی کے آخر تک رہا۔ اُمید تھی کہ جوشی سسرال سے روپے پاتے ہی ماتھر کے ہاتھ بھیج دے گا، یا خود لیتا آئے گا، مگر ماتھر بھی دوسرے دن آ گئے۔ خالی ہاتھ اور یہ خبر لائے کہ جوشی کو سسرال میں کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا۔ ماتھر سے اب معلوم ہوا کہ لڑکی سے جمنا کنارے ملنے کی بات قطعی جھوٹ تھی۔ اس لڑکی سے جوشی بہت دنوں سے خط و کتابت کر رہا تھا۔ ''اچھا یہ صرف تصور تھا اس کا۔''

ماتھر: ''جی ہاں۔''

''اچھا، تمھاری بھانجی کی شادی کا کیا ہوا؟

ماتھر: ''ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔''

''مگر جوشی نے کئی مہینے تک تمھاری امداد تو خوب کی۔''

ماتھر: ''وہ مجھے کیا امداد دیتا۔ ہاں دونوں وقت کھانا بھلے ہی کھا لیتا تھا۔''

''تمھارے نام سے اس نے مجھ سے جو روپے لیے تھے وہ تو تمھیں دیے ہوں گے۔''

ماتھر: ''کیا میرے نام پر بھی کچھ روپے لیے تھے!''

''ہاں بھائی، تمھارے گھر کا کرایہ دینے کے لیے لے گیا تھا۔''

ماتھر: ''سراسر بے ایمانی۔ مجھے اس نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ الٹے اور ایک مہاجن سے میرے نام پر سو روپیوں کا اسٹامپ لکھ کر روپے لیے ہیں۔ میں کیا جانتا تھا کہ یہ دھوکہ دے رہا ہے۔''

اتفاق سے اسی وقت آگرے کے وہ صاحب آ گئے جن کے پاس جوشی کچھ دنوں رہا تھا۔ انھوں نے ماتھر کو دیکھ کر پوچھا: ''اچھا، آپ ابھی زندہ ہیں۔ جوشی نے تو کہا تھا کہ ماتھر مر گیا۔''

ماتھر نے ہنس کر کہا: ''میرے تو سر میں درد بھی نہیں ہوا۔''

ڈھپور سنگھ نے پوچھا: ''اچھا، آپ کے مراد آبادی برتن تو پہنچ گئے۔''

آگرہ میں رہنے والے دوست نے بے تابی سے پوچھا: ''کیسے مراد آبادی برتن!''

''وہی جو آپ نے جوشی کی معرفت منگوائے تھے۔''

''میں نے کوئی چیز اس کی معرفت نہیں منگوائی۔ مجھے ضرورت ہوتی تو آپ کو سیدھا نہ لکھتا۔''

ماتھر نے ہنس کر کہا: ''تو یہ روپے بھی اس نے ہضم کر لیے۔''

آگرہ رہنے والے دوست بولے: ''مجھ سے بھی تمھاری موت کے بہانے سو روپے لے آیا تھا۔ یہ تو ایک ہی چالباز نکلا۔ اُف، کتنا بڑا چکمہ دیا ہے اس نے۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں یوں بے وقوف بنا۔ بچّہ کو پا جاؤں تو تین برس کو بھجواؤں۔ کہاں ہے آج کل؟''

ماتھر نے کہا: ''ابھی تو سسرال میں ہے۔''

ڈھپور سنگھ کی داستان ختم ہو گئی۔ جوشی نے انھیں کو نہیں ماتھر جیسے غریب اور آگرہ میں رہنے والے گھاگھ کو بھی الٹے چھرے سے مونڈا اور اگر بھانڈا نہ پھوٹ گیا ہوتا تو ابھی نہ جانے کتنے دنوں تک مونڈتا۔ اس کی ان ذاتی سوجھ بوجھ بھری چالوں پر میں بھی لٹو ہو گیا۔ بے شک۔ اپنے فن کا استاد ہے۔ چھٹا ہوا گرگا۔

دیوی جی بولیں: ''سن لی آپ نے پوری داستان!''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''ہاں سن تو لی۔''

"اچھا تو اب آپ کا کیا فیصلہ ہے۔ (خاوند کی طرف اشارہ کر کے) انھوں نے گونگھا پن کیا یا نہیں؟ جس آدمی کو ایک ایک پیسے کے لیے دوسروں کا منھ تاکنا پڑے وہ گھر کے پانچ چھ سو روپے اس طرح اُڑا دے اسے آپ اس کی شرافت کہیں گے یا حماقت؟ اگر انھوں نے یہ سمجھ کر روپے دیے ہوتے کہ پانی میں پھینک رہا ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر یہ برابر اس دھوکے میں رہے اور مجھے بھی اسی دھوکے میں ڈالتے رہے کہ وہ گھر کا مالدار ہے اور میرے سارے روپے ہی نہ لوٹا دے گا بلکہ اور بھی کتنے سلوک کرے گا۔ جس کا باپ دو ہزار روپے ماہانہ پاتا ہو، جس کے چاچا کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہوار ہو اور ایک لاکھ کی جائداد ہو وہ اور کچھ نہیں تو یوروپ کی سیر تو ایک دفعہ کرا ہی سکتا تھا۔ میں اگر کبھی منع بھی کرتی تو آپ بگڑ جاتے تھے اور دریادلی کی نصیحت دینے لگتے تھے۔ یہ میں قبول کرتی ہوں کہ شروع میں میں بھی دھوکے میں آ گئی تھی۔ مگر پیچھے سے مجھے اس پر شک ہونے لگا تھا۔ اور شادی کے وقت تو میں نے زور دے کر کہہ دیا تھا کہ اب ایک پائی بھی نہ دوں گی۔ پوچھیے، جھوٹ کہتی ہوں یا سچ! پھر اگر مجھے دھوکہ ہوا تو میں گھر میں رہنے والی عورت ہوں۔ میرا دھوکے میں آ جانا قابلِ معافی ہے۔ مگر جو مصنف مفکر اور نصیحت کرنے والے بنتے ہیں وہ کیوں دھوکے میں آئے۔ جب میں انھیں سمجھاتی تھی تو یہ کیوں خود کو دانشوری کا اوتار سمجھ کر میری باتوں کو اَن سنا کر دیتے تھے۔ دیکھیے رو رعایت نہ کیجیے گا۔ نہیں میں بُری طرح خبر لوں گی۔ میں بے لوث انصاف چاہتی ہوں۔ بغیر کسی طرفداری کے۔"

ڈھپور سنگھ نے دردناک آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جو گویا عزت کی بھیک مانگ رہی ہوں اسی کے ساتھ دیوی جی کا اسرار، حکم، اور فخر سے بھری آنکھیں بھی تاک رہی تھیں۔ ایک کو اپنی شکست کا یقین دوسری کو اپنی فتح کا۔ ایک رعایت چاہتی تھی۔ دوسری سچا انصاف۔

میں نے مصنوعی سنجیدگی سے اپنا فیصلہ سنایا: "میرے دوست نے کچھ جذبات سے کام لیا ہے، لیکن ان کی شرافت پر کوئی شک نہیں ہے۔"

ڈھپور سنگھ اُچھل پڑے اور میرے گلے سے لپٹ گئے۔ دیوی جی نے فخر بھری نظروں سے دیکھ کر کہا: "یہ تو میں جانتی ہی تھی کہ چور چور موسیرے بھائی ہوں گے۔ تم دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ اب تک روپے میں ایک پائی مردوں پر یقین تھا۔ آج تم نے وہ بھی اُٹھا دیا۔ آج پتہ چلا کہ مرد دھوکے باز، فریبی کتنی خود غرض اور بے وفا ہوتے ہیں۔ میں اس فیصلے کو نہیں مانتی۔ مفت میں ایمان بگاڑنا اسی کو کہتے ہیں۔ میری طرف داری کرتے تو بڑھیا کھانا ملتا۔ ان کی طرف داری کر کے آپ کو سڑے سگریٹوں کے سوا اور کیا ہاتھ لگے گا۔ خیر ہانڈی گئی

تو گئی، کتّے کی ذات تو پہچانی گئی۔"

اس دن سے دو تین مرتبہ دیوی جی سے ملاقات ہو چکی ہے اور وہی پھنکار سننی پڑی ہے۔ وہ نہ معافی چاہتی ہیں نہ معاف کر سکتی ہیں۔

O

کانپور یا لکھنو، ہی نہیں یہ تو قصہ روز کا تھا۔ ہر روز شریمتی جی کی شکایت ہوتی۔ ان سے کہا اپنی شکایتوں کی تفصیل لکھ دو اب اُنھیں کی زبانی...

زندگی کا بڑا حصّہ تو اسی گھر میں گزر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دُنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہوں گے، لیکن جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کیے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگ دل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب اُنھیں کو دیکھو، صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ اُنھیں ایسی ہی دوکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو، وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں ٹٹ پونجیوں سے اُن کو ہمدردی ہے، اور وہ انھیں اُلٹے اُسترے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا، چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو، کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل، اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم۔ تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں، مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دکان پر جاتے تو جیسے انھیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت برداشت نہیں ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر ٹٹ پونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمھیں

نے لے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیے پس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے؟ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ اُن سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں، دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں، میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں، میرے ساتھ چال بازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا، تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کیے اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا، اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی، برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں۔ ان کی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست قلاّنچ، بے سروسامان ہیں، جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لیے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کیے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے، مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے اب مانگ کیوں نہیں لاتے۔ کیا مر گئے تمھارے دوست؟ تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا۔ خیر سوکھا جواب نہ دو میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروّتی کرو، مگر ٹال تو سکتے ہو۔ کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو۔ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بیچارے کیسے انکار کریں۔ آخر لوگ جان جائیں گے یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انھیں امیر سمجھتی ہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گِروی رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے۔ اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپیوں کے وارے نیارے نہ کر لیں، انھیں کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں

کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا تو گھر، مشکل سے دو تو چار پائیاں، اوڑھنا بچھونا بھی بافراط نہیں مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دینے کے لیے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے، اس لیے انھیں چار پائی بھی چاہیے۔ اوڑھنا بچھونا بھی چاہیے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے گا، جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر، زمین پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں، گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے۔ گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لیے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں، جو ضرورت کے وقت انھیں دھیلے سے بھی مدد کر سکے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مرد خدا نے تو آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے، ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے، وہ آپ کا دوست ہے، شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں، کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں، بدمغ ہیں، خوشامد پسند ہیں، ان کے پاس کیسے جائیں دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیاں کہوں! بڑا فرماں بردار ہے، پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز۔ خیر میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیونکر ان کی باتوں میں آ جاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں، بے ایمان نہ تھا مگر احمق اوّل نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے۔ کم بخت دکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان

اکھاڑلوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا، جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیبوں پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے، اس میں جھاڑو دیتا تو اِدھر کی چیز اُدھر، اُوپر کی نیچے گویا سارے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل۔ مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اُسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا: ''اگر کل سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔'' سویرے سو کر اُٹھی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے، گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنس کر کہا: ''دیکھتی کیا ہو۔ آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو، الٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔'' لیجیے صاحب یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر، میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا، اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اُٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بیباق کر دو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے اس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کرتا دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے بڑی مشکلوں سے رُکے۔

ایک دن مہتر نے اُتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بے کاری کے زمانہ میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آ جائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی کی شدت تھی اس کا مجھے خود احساس تھا۔ غریبوں پر کیا گزرتی ہے، اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب رؤسا اور امراء کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری ہوئی ہے تو پھر غربا

کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر، میں نے تو اسے جواب دے دیا، آپ نے کیا کیا اپنا کوٹ اُتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے، وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی قدرت نے انھیں عجیب قسم کا دیا ہے! پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے، آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے دیکھا نہ گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آ جائے۔ آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو، میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے۔ سیدھی سادی حماقت۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے۔ تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ملنا چاہیے؟ اتنی عمر گزر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لیے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بیشک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں، مطلق عذر نہیں مگر روپیہ بھی دے دوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بچارے اپنے لیے بھی کچھ نہیں لاتے، میں جو کچھ منگوا دوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے، اور مردوں کو دیکھتی ہوں، گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کے زیور، کپڑے، شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لیے بھی مٹھائی، کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں۔ قسم سی کھالی ہے۔ اس لیے میں تو انھیں بخیل کہوں گی، مردہ دل کہوں گی، فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص، نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر یا ڈالی کی بات ہے۔ اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اُٹھائیں تو کون اُٹھائے اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی

پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ، مشکل کام آ جائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسّو اور پِٹّو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو؟ دنیا میں مروّت اور رواداری سے کام چلتا ہے، اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے، پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے، جس پر اعتبار ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں۔ ان کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہوتی ہے وہ کہاں پوری ہو جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے، مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیل دار ہیں۔ گھر کی جائداد انھیں کی نگرانی میں ہے، وہ شان سے رہتے ہیں، موٹر خرید لی ہے، کئی نوکر ہیں، مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی، میں نے کہا اپنے برادرِ مکرم سے کیوں نہیں مانگتے کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں، آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے، کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی۔ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا۔ معلوم نہیں خط میں کیا لکھا لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا 'کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟' آپ نے تُرش ہو کر کہا: 'ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ہوا، ابھی کیا جواب آ سکتا ہے۔' ایک ہفتہ اور گزرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشّاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش۔ کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے، میرے میکے والوں کی بھی تعریف ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دل جوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادرِ مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی، تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کیے جاتے تھے، اتنی

تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کیا چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتے گزر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آ پہنچی تو میں نے پوچھا: 'کیا ہوا؟ تمھارے بھائی صاحب نے دہنِ مبارک سے کچھ فرمایا یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا منافع نو دس سال قبل تھا، اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک جھنجی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیے۔ دو ہزار نہ ہو، ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو، ڈھائی سو ہو، کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھرنے کو تو ہو۔ تحصیل دار کی آمدنی ہماری آمدنی سے چوگنی ہے، رشوتیں بھی لیتے ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔' آپ ہیں ہیں، ہاں ہاں کرنے لگے: 'بیچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں، عزیز و اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔' خوب! گویا جائداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے بھی گھڑنے نہیں آتے مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بار بتا دیتی۔ کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا۔ یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلّہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا۔ گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی اس میں دیوالہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو لچر سی بات۔ اس جولانیِ طبع پر آپ مصنف بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بی بی سے قرض لیے تب جا کر کہیں کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادرانِ یوسف سے خدا بچائے۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں، دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں، سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحب زادے ابھی گھوم کر نہیں آئے۔ میں گھبرا رہی ہوں، آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلّائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں: ''جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمھارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں، تمھیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا' تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں: 'ابھی تک نہیں آیا۔ بڑا شیطان ہے آج بچہ جی آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں، مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔' یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ اِدھر جاتے ہیں، اُدھر لڑکا

آ جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں: "کدھر سے آ گیا، وہ بیچارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے، یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی، دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے۔ آج قدر و عافیت معلوم ہوگی۔" لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان اور بدحواس، گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں: "آیا کہ نہیں؟"

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں: "آ کر بیٹھا تو ہے، جا کر پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھ کر ہار گئی کہاں گیا تھا کچھ بولتا ہی نہیں۔"

آپ گرج پڑتے ہیں۔: "منو یہاں آؤ۔"

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامہ سے باہر ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضبناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصہ سے کہتے ہیں: 'تم کہاں گئے تھے جی، منع کیا جاتا ہے مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا اِدھر اُدھر گھومتا ہے؟'

میں سمجھ رہی ہوں یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا گریز تو بُری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں: 'تم تو جیسے ڈر گئے، بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے۔ اس طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے۔ کل نو کی خبر لائے گا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہوگا۔'

آپ فرماتے ہیں: 'تم نے سنا نہیں میں نے کتنی زور سے ڈانٹا۔ بچے کی روح ہی فنا ہو گئی ہوگی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے گا۔'

'تم نے ڈانٹا تو نہیں ہاں آنسو پونچھ دیے۔'

آپ نے ایک نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں، آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ

لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے، کبھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کوئی لڑکا کنکوا اُڑا لے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جونہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے۔ ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اُٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو ابا جان کی صحت ہی کون بہت اچھی تھی۔ بچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی لیکن کچھ بھی ہو تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحب زادے کو کنکوا کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو، ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے۔ تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ ہو، لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجیے، بُرے بُرے شوق نہ پیدا کیجیے اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑیے مت۔ لگے باتیں بنانے، ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں: 'چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی، غبارے اُڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں ان پر مزے سے بیٹھنا۔' اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکٹ، فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک، گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آ جاتا تو کتنے خوش ہوتے ہیں، گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی

تو کیا ہوگا۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بیچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے، چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہلِ دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر بھی چشمِ بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہو سکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں، لیکن اس کا اثر عام حالات پر کم ہوتا ہے اور بُرائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیے، جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا، اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑا دی۔ جب اس طرح ایک سال پورا گذر گیا اور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے کیونکہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ ایک اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اُٹھا نہ رکھوں گی۔ شادی کے بخیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی: 'یہ رسم بیہودہ ہے' 'یہ رسم بے معنی ہے، یہاں روپے کی کیا ضرورت؟ یہاں گہنوں کی کیا ضرورت؟' ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں، وہ کیوں: 'یہ تو صاف جہیز ہے۔ تم نے میرے منہ میں کالک لگا دی، میری آبرو مٹا دی۔' ذرا خیال کیجیے بارات دروازے پر کھڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر ردّ و قدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھی۔ اُس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسبِ معمول ناشتہ کیا، کھانا کھایا۔ خیر رات کو شادی کے وقت کنیادان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیادان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے، جانور بھی دان دیے جا سکتے ہیں لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے۔ کتنا سمجھاتی ہوں۔ 'صاحب پرانا رواج ہے، شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔' عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں: 'دُنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لا مذہب ہو گئے۔' مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی، یہاں تک کہا کہ: 'بابا تم کچھ نہ کرنا جو کچھ کرنا ہوگا میں کر لوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اُسے دُعا دو۔' مگر

اس مردِ خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آ گیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی، آپ گھر جھانکے تک نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں، مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پُتلا، حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پُرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں۔ اور ایک پُرزے کی جگہ دوسرا پُرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول، نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستہ سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں، اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ ہماری آنکھوں میں سمائے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے، ہر لحہ چور اور رہزن کا خوف، بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

○

جنوری ۱۹۳۱ء میں بشن نارائن بھارگو کی وفات ہوگئی۔ گھوڑدوڑ کے لیے مدراس گئے تھے۔ زندگی کی بازی ہار گئے۔ اب "مادھوری" سے ہٹ کر تبادلہ ٹیکسٹ بک ڈیپارٹمنٹ میں ہوگیا۔

۱۹۳۱ء کے آخر میں یہاں ایک نئی بات ہوگئی۔ میرے خلاف مدّت سے ایک جماعت تھی جس کا سرغنہ یہاں کا منیجر ہری رام رہا ہے۔ سال گزشتہ سے اس کا ایک اور معاون پیدا ہوگیا ہے۔ یہ ہیں مسٹر پنت جو یہاں کنوینر ہو کر بلائے گئے تھے۔ مسٹر پنت یہاں حاوی ہونا چاہتے ہیں۔ اس کی انھوں نے روز اوّل سے کوشش شروع کی اور مجھے اپنا رقیب سمجھ کر انھوں نے پہلے مجھ ہی کو راستے سے ہٹانا ضروری سمجھا۔ کفایت کا نامہ یہاں شروع سی تھا ہی۔ آپ نے یہ کفایت

سوچی کہ ایڈیٹوریل عملہ کو برطرف کردیا جائے اور کتابیں ذمہ دار، بااثر اور کمیٹی میں رسوخ رکھنے والے یا خود کمیٹی کے ممبروں سے بنوائی جائیں. ممبران سے کتابیں لکھا لینے میں خود کچھ نہیں کرنا ہوتا کتابیں آپ ہی آپ منظور ہوجاتی ہیں. بس صرف ان سے خط و کتابت کرکے معاملہ پٹالینا ہوتا ہے. یہی کام اس نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

مجھے یہاں سے جانا تو تھا ہی بلکہ میں نے جون میں استعفیٰ دینے کا ارادہ کیا تھا. لکھا بھی تھا، لیکن بعض دوستوں کے کہنے سے اسے پیش نہ کیا۔ مجھے یہاں سے جانے کا غم نہیں مگر رقیبوں کو یوں خوش ہوتے دیکھ کر انسانی کمزوریوں کے باعث جی جلتا ہے. انڈپنڈنٹ آدمی کے لیے واقعی بڑی مشکلات پیش آتی ہیں اور میں کئی بار اس کا تاوان دے چکا ہوں لیکن اب تو وہ روش نہیں چھوڑی جاتی جو عادت ہوگئی ہے۔

ادبی خدمات کے لحاظ سے قیام لکھنؤ کی بڑی اہمیت ہے. "نرملا" اور "پرتگیا" یہیں لکھی گئیں. "غبن" بھی یہیں لکھا گیا. "کرم بھومی" بھی لکھی گئی اور اگلے مکمل ناول "گودان" کی شروعات بھی یہیں ہوئی. الہ آباد کی ہندستانی اکیڈمی کا اہتمام ہوا. اس کے لیے گالسروی کے تین ڈرامے "مسٹر ایف"، "جینیس"، "سلور اکس" کا ہندی ترجمہ بھی کیا اور "جینیس" کا تو اُردو ترجمہ بھی۔

پہلے کی سب کتابوں کے حقوق ناشر کو دے دیے تھے. "پریم پچیسی"، "سیواسدن"، "پریم آشرم"، "سنگرام" کے لیے ایک مشت تین ہزار ہندی پستک ایجنسی نے دیا. "نوندھی" کے لیے شاید دو سو روپے ملے. "رنگ بھومی" کے لیے دُلارے لال بھارگو نے ۱۸۰۰ روپے ملے. "کایا کلپ"، "آزاد کتھا"، "پریم تیرتھ"، "پریم پرتگیا" میں نے خود چھاپے. مشکل سے چھ سو روپے وصول ہوئے. مضامین سے شاید -/۲۵ یومیہ ماہوار ہوجاتا ہے. "رنگ بھومی" اور "پریم آشرم" کا اُردو ترجمہ کروایا. کوئی چھاپنے والا ہی نہیں تھا.

ویسے میری تصانیف کا ترجمہ مراٹھی، گجراتی اور تمل بھاشاؤں میں ہوا ہے، سب کا نہیں. سب سے زیادہ اُردو میں. اس کے بعد مراٹھی میں. تمل اور تیلگو کے کئی اصحاب نے مجھ سے اجازت مانگی اور میں نے دے دی. ترجمہ ہوا یا نہیں میں نہیں کہہ سکتا. جاپانی میں تین چار کہانیوں کا ترجمہ ہوا. دو تین کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا.

مالی لحاظ سے میں ہمیشہ ناکام رہا. کاروبار مجھے آتا نہیں اور ضروریات بنی ہوئی ہیں. میں کبھی جرنلسٹ نہیں رہا. لیکن حالات نے مجھے جرنلسٹ بننے پر مجبور کردیا. چنانچہ میں نے ادب سے جو کچھ تھوڑا بہت کمایا وہ سب اخبار نویسی میں کھودیا. "ہنس" کا کاشی نمبر نکالا. تقریباً ۱۲۰۰ روپے خرچ ہوگئے. چار سو روپیہ کا کاغذ. لگ بھگ دو سو کے بلاک. ساڑھے چار سو چھپائی،

محصول ڈاک وغیرہ پر دوسو خرچ ہو گئے. خیال تھا اس نمبر سے پرچہ کی اشاعت میں معقول اضافہ ہوگا مگر نتیجہ بالکل برعکس. پانچ سو وی پی گئے تھے. ان میں سے تین سو واپس آئے. دفتر میں خستہ حال رسالوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے. سات سو روپے ملے. کاغذ والوں کے دو ہزار باقی تھے. بمشکل پانچ سو دے سکا. ڈیڑھ ہزار کاغذ کا باقی پڑا ہوا ہے، بس یوں کہیے بدھیا بڑھ گئی. بڑی کراری چپت پڑی چندھیا گیا ہوں. واقعی ادیبوں کے لیے یہ بڑی آزمائش کا زمانہ ہے.

میں قسم کھا سکتا ہوں کہ دس سال میں اپنی تصانیف سے میں نے بیس روپے بھی نہیں کمائے. ادھر اُدھر نوکری چاکری کرکے گزر کیا. بوریا بستر اسمیٹ کر جاؤں تو کہاں. لکھنے میں کیا رکھا ہے. جب کتاب کی بکری نہ ہو تو ناشر کیا کرے. رسالہ یا اخبار نکالو تو بدھیا پڑھ جائے. کتاب لکھیے تو بکے نہیں، زہر کھالینے کے سوائے اور آدمی کیا کرے. مجھے بک سیلروں کا کڑوا تجربہ ہے. وہ تیرتھ رام میرے ڈیڑھ ہزار روپے دبائے بیٹھا ہے. پچاس محض اخبارات کے اس کے ذمے نکلتے ہیں، مگر دینے کا نام نہیں لیتا. ایک دوسرا بک سیلر لاہور ہی میں میرے قریب سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے. اخبارات کا یہ حال ہے. اور بک سیلروں کا یہ حال. بیمار ادیب کیا کرے. ہندی میں اخباروں کی حالت اُردو سے بہتر نہیں ہے. میں خود دو اخبار نکال رہا ہوں اور دونوں میں برابر گھاٹا آرہا ہے. یہاں تک کہ اب جی بیزار ہوگیا ہے. چاہتا ہوں کہ کسی طرح خوبصورتی سے نجات پاجاؤں.

ایک خوشخبری. "سیوا سدن" کے فلم کے لیے ۷۵۰ روپے ملے. اگر اس تنگی میں روپے نہ مل جاتے تو نہ جانے کیا حالت ہوتی. ایشور ہی جانے. تنگی میں جب کوئی رقم ہاتھ آجاتی ہے تو وہ ساری ضرورتیں جو منہ دبائے پڑی تھیں یکایک چیخ مارنے لگتی ہیں. کسی کے پاس کپڑے نہیں ہیں کسی کے پاس جوتے نہیں ہیں. فلاں کی لڑکی کی شادی کے لیے کچھ دینا چاہیے، غرض وہ روپے دوچار دن میں ہوا ہوجاتے ہیں. غرض وہ روپے دو چار دن میں ہوا ہوجاتے ہیں. وہی یہاں ہورہا ہے.

سرسوتی پریس کے پاس جاب ورک کی کمی تھی. اگست ۱۹۳۲ء میں "جاگرن" کو لے لیا. ونود شنکر ویاس کو اس پر لگ بھگ ۱۵۰۰ روپے کا گھاٹا رہا تھا. وہ اُسے بند کرنے جارہے تھے. مجھ سے بولے اگر آپ اسے نکالنا چاہیں تو نکالیں. میں نے اسے لے لیا. دھن کی کمی ہے. "ہنس" میں کئی ہزار کا گھاٹا اُٹھا چکا مگر ایک ہفتہ وار رسالہ کے لالچ پر قابو نہیں پاسکا. اس میں بھی ہزاروں کا گھاٹا ہوگا پر کروں کیا. یہاں تو زندگی ہی ایک لمبا گھاٹا رہا ہے. کچھ چل جائے گا تو پریس کے لیے کام کی کمی کی شکایت نہ رہے گی.

"جاگرن" کا بوجھ بھی بڑھتا گیا. پریشانیوں کی جڑ تو پریس ہے. نہ جانے کس بری ساعت میں اس کی بنیاد پڑی تھی. دس ہزار روپے اور گیارہ سال کی

محنت اور پریشانی اکارت گئی۔ اس پریس کے پیچھے کتنے دوستوں سے برا بنا۔ کتنوں سے وعدہ خلافی کی۔ کتنا قیمتی وقت جو لکھنے پڑھنے میں کٹتا بیکار پروف دیکھنے میں کاٹا۔ میری زندگی کی یہ سب سے بڑی غلطی رہی ہے۔

تو یہ تھی میری حالت۔ جب بمبئی کی ایک فلم کمپنی نے بلایا، تنخواہ کی بات نہیں کانٹریکٹ کی بات تھی۔ آٹھ ہزار روپیہ سالانہ۔ حالت وہی رہی، یا تو بمبئی جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں۔ میں نے منظور کیا۔ اس لیے کہ شاید مالی اعتبار سے کچھ مطمئن ہوسکوں، مگر میں جن ارادوں کو لے کر بمبئی آیا تھا۔ ان میں سے ایک بھی پورا نہیں ہوا۔ پھر یہاں جس ڈھنگ کی کہانیاں پروڈیوسر بناتے ہیں۔ مصنف اس لیک سے جو بھر بھی نہیں ہٹ سکتا۔ فلم ڈائریکٹر سب کچھ ہیں ادیب قلم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، یہاں ڈائریکٹر کی عملداری ہے اور اس کے راج میں ادیب کی حکومت نہیں چل سکتی۔ ڈائریکٹر کی حکومت مانے تبھی وہ رہ سکتا ہے۔ وہ یہ کہنے کی ہمّت نہیں رکھتا: 'میں عوام کی ضرورت کو جانتا ہوں آپ نہیں جانتے۔'

سنیما میں کسی اصلاح کی توقع کرنا بے کار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے جیسے شراب فروشی۔ اُنھیں اس سے مطلب نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اُنھیں تو پیسے سے مطلب ہے۔ برہنہ رقص، بوسہ بازی اور مردوں کا عورتوں پر حملہ۔ یہ سب اس کی نظر میں جائز ہے۔ پبلک کا مزاج اتنا گر گیا ہے کہ جب تک یہ حیا سوز نظارے نہ ہوں تو اس تصویر میں مزا نہیں آتا۔ مذاق کی اصلاح کا بیڑا کون اُٹھائے۔ سنیما کے ذریعے مغرب کی ساری بیہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جارہی ہیں اور ہم بے بس ہیں۔ تنظیم نہیں، نہ نیک اور بد کا امتیاز ہے۔

سرسوتی پریس کی پریشانیوں سے بمبئی میں بھی چھٹکارا نہیں ملا۔ پریس کے منیجر ہرداس لال ورما کے رویے کے خلاف پریس میں ہڑتال ہوگئی۔ دخل دینا پڑا۔ بھارت اخبار کے ذریعے پریس میں کام کرنے والوں کو بتلایا کہ میں بھی ایک مزدور ہوں قلم کا مزدور۔

بمبئی میں میری زندگی ایسی ہی تھی جیسی کاشی میں۔ نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے ملاقات۔ ملّا کی دوڑ مسجد تک۔ اسٹوڈیو گئے۔ گھر آئے۔ ہندی کے دوچار پریمی کبھی آجاتے ہیں۔ بس۔ بمبئی کی آب و ہوا اور فضا دونوں ہی میرے معاون نہیں ہیں۔ ایک سال کے لیے بمبئی گیا تھا۔ تین مہینے باقی تھے کہ فلم کمپنی نے کام بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے وطن بنارس لوٹ آیا اور حسب سابق ادبی مشاغل میں مصروف ہوگیا۔ "گودان" جو چار سال پہلے لکھنؤ میں شروع کیا تھا اس کو مکمل کرتا تھا۔

○

حسنِ اتفاق سے ان دِنوں حاکم ضلع ایک صاحب ذوق بزرگ تھے جنھوں نے تاریخ اور قدیم سکّہ جات میں اچھی تفتیش کی ہے۔ خدا جانے کیسے دفتری کاموں سے اُنھیں ان مشاغل کے لیے فرصت مل جاتی ہے۔ میں نے ان کے کارنامے پڑھے تھے اور ان کا غائبانہ مداح تھا لیکن ان کی افسری مزید تعلقات میں مانع تھی۔ مجھے یہ تکلف تھا کہ اگر میری جانب سے پیش قدمی ہوئی تو عام تجربے کے مطابق وہ میری حکام جوئی پر محمول کی جائے گی اور میں کسی حالت میں بھی یہ الزام اپنے سر پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں تو حکام کو دعوتوں اور عام تقریبوں میں مدعو کرنے کا بھی مخالف ہوں اور جب کبھی سنتا ہوں کہ کسی افسر کو کسی رفاہِ عام کے جلسے کا صدر بنایا گیا یا کوئی اسکول یا شفاخانہ یا بدھوا آشرم کسی گورنر کے نام سے منسوب ہوا تو برادرانِ وطن کی غلامانہ ذہنیت پر گھنٹوں افسوس کرتا ہوں مگر جب ایک دن حاکم ضلع نے خود میرے نام ایک رقعہ بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں کیا آپ میرے بنگلے پر تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے، تو میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا، کیا جواب دوں؟ اپنے دو ایک دوستوں سے مشورہ لیا، اُنھوں نے کہا صاف کہہ دیجیے مجھے فرصت نہیں، وہ حاکم ضلع ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے، کوئی سرکاری یا ضابطے کا کام ہوتا تو آپ کا جانا مناسب تھا۔ لیکن ذاتی ملاقات کے لیے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے آخر وہ خود آپ کے مکان پر کیوں نہیں آئے۔ اس سے کیا ان کی شان میں بٹہ لگا جاتا تھا اسی لیے تو خود نہیں آئے اور آپ کو بلایا کہ وہ حاکم ضلع ہیں۔ ان احمق ہندستانیوں کو بھی یہ سمجھ نہ آئے گی کہ دفتر کے باہر وہ بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم یا آپ۔ شاید یہ لوگ اپنی بیوی سے بھی افسری جتاتے ہوں گے۔ انھیں اپنا عہدہ کبھی نہیں بھولتا۔

ایک صاحب نے، جو لطیفوں کے خزانچی ہیں، ہندستانی افسروں کے کئی پُر مذاق تذکرے سنائے۔ ایک افسر صاحب سسرال گئے شاید بیوی کو رخصت کرانا تھا، جیسا عام رواج ہے۔ خسر صاحب نے اس موقع پر رخصت کرنے سے انکار کیا۔ کہا: 'بیٹا! ابھی اتنے دنوں کے بعد آئی ہے۔ تین مہینے بھی نہیں ہوئے بھلا اور نہیں تو چھ مہینے تو رہنے دو۔' ادھر بیوی نے بھی نائن کے ذریعے پیغام کہلا بھیجا: 'ابھی میں جانا نہیں چاہتی۔ آخر ماں باپ سے مجھے بھی تو محبت ہے کچھ تمھارے ہاتھ بک تھوڑی ہی گئی ہوں۔' میاں داماد ڈپٹی کلکٹر تھے جامے سے باہر ہو گئے۔ خسر پر سمن جاری کر دیا۔ بے چارہ بڈھا آدمی دوسرے دن صاحب زادی کو لے کر داماد کی خدمت

میں حاضر ہوئے، تب جا کے اس کی جان بچی۔ لوگ ایسے خر دماغ ہوتے ہیں اور پھر تمھیں حاکم ضلع سے لینا کیا ہے اگر تم کوئی باغیانہ یا اشتعال انگیز قصہ یا مضمون لکھو گے فوراً گرفتار ہو جاؤ گے، مطلق رعایت نہ کی جائے گی۔ اپنے لڑکے کے لیے قانون گوئی نائب تحصیلداری کی فکر تمھیں ہے نہیں۔ پھر خواہ مخواہ کیوں دوڑے جاؤ۔

لیکن میں نے دوستوں کی صلاح پر کار بند ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا۔ ایک شریف آدمی قدر افزائی کرتا ہے تو اس سے محض اس بنا پر بے اعتنائی کرنا کہ وہ حاکم ضلع ہے تنگ ظرفی ہے۔ بیشک حاکم ضلع صاحب میرے غریب خانے پر آتے تو ان کی شان کم نہ ہوتی۔ وضع دار آدمی بے تکلف چلا آتا۔ لیکن بھئی ضلع کی افسری بڑی چیز ہے اور قصہ نگاری ہستی ہی کیا ہے۔ انگلینڈ یا امریکہ میں فسانہ نگاروں کی میز پر مدعو ہونے میں وزیر اعظم بھی اپنا اعزاز سمجھتے ہوں گے، لیکن یہ ہندستان ہے، جہاں ہر ایک رئیس کے دربار میں شاعروں کا ایک انبوہ قصیدہ خوانی کے لیے جمع رہتا تھا۔ اور اب بھی تاجپوشی کے موقع پر ہمارے اہلِ قلم بن بلائے رئیسوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، قصیدہ پیش کرتے ہیں۔ انعام پاتے ہیں تم ایسے کہاں کے ہو کہ حاکم ضلع تمھارے گھر پر چلا آئے۔ وہ افسر ہے تم معمولی مضمون نگار ہو جب تم میں اس قدر لڑکپن اور تنگ مزاجی ہے تو پھر وہ تو ضلع کا بادشاہ ہے اگر اسے کچھ غرور بھی ہو تو جائز ہے۔ کمزوری کہو، جہالت کہو، خر دماغی کہو، لیکن پھر بھی جائز ہے اور خدا کا شکر کرو کہ افسر صاحب تمھارے گھر نہیں آئے، ورنہ ان کی خاطر و مدارات کا سامان تمھارے یہاں کہاں تھا؟ گت کی ایک کرسی بھی تو نہیں ہے۔ تین پیسے کی چوبیس بیڑیاں پی کر دل خوش کر لیتے ہو، ہے توفیق روپے کی دو سگار پینے کی؟ کہاں وہ سگار ملتا ہے اس کا کیا نام ہے۔ اس کی خبر ہے تمھیں؟ اپنی تقدیر کو سراہو کہ وہ خود نہیں آئے تمھیں بلا لیا۔ چار پانچ روپے بگڑ ہی جاتے اور شرمندگی بھی ہوتی۔ خدانخواستہ اور تمھاری شامتِ اعمال سے کہیں ان کی اہلیہ بھی ہمراہ ہوتیں، تو قیامت ہی آ جاتی۔ ان کی مہمان نوازی تم یا تمھاری دھرم پتنی جی کر سکتی تھیں؟ وہ تمھارے گھر میں یقیناً جاتیں اور تمھارے لیے موت کا سامان ہوتا۔ تم اپنے گھر میں پھٹے پرانے پہن کر اپنی بے نوائی میں مگن رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہو لیکن کوئی بھی خوددار شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی خستہ حالی دوسروں کے لیے مایۂ تفریح ہو۔ ان لیڈی صاحبہ کے سامنے تمھاری تو زبان بند ہو جاتی اور یہی جی چاہتا کہ زمین پھٹ جاتی اور تم اس میں سما جاتے۔

چنانچہ میں نے حاکم ضلع کی دعوت قبول کی اور باوجود یہ کہ اس میں کسی قدر ناگوار رعونت تھی لیکن شفقت اور خلوص نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔ کم سے کم انھوں نے مجھے شکایت کا موقع

نہ دیا۔ افسرانہ فطرت کو تبدیل کرنا ان کے امکان سے باہر تھا۔

میں نے سوچا یہ ذاتی معاملہ ہے انھوں نے مجھے بلایا میں چلا گیا کچھ ادبی گپ شپ کی اور واپس آیا کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے اس واقعہ کو ذرا اہمیت نہ دی۔ گویا بازار سبزی خریدنے گیا تھا۔

لیکن مخبروں نے جانے کیسے اس کی خبر لگائی۔ خاص خاص حلقوں میں یہ چرچے ہونے لگے کہ افسر ضلع سے میرے بہت دوستانہ تعلقات ہیں، اور وہ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ مبالغے نے میری وقعت میں اور بھی اضافہ کردیا۔ یہاں تک مشہور ہوا کہ وہ مجھ سے صلاح لیے بغیر کوئی تجویز یا رپورٹ نہیں لکھتے۔

کوئی ذی ہوش آدمی اس قسم کی شہرت سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ اہلِ غرض باؤلے ہوتے ہیں، تنکے کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انھیں اس کا یقین دلانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ میرے ذریعے ان کی مطلب براری ہوسکتی ہے لیکن میں ایسی حرکتوں کو ذلیل سمجھتا ہوں۔ صدہا اصحاب اپنی اپنی داستانیں لے کر میرے پاس آئے کسی کے ساتھ پولیس نے بے جا زیادتی کی تھی، کوئی انکم ٹیکس والوں کی سختی سے نالاں تھا۔ کسی کو یہ شکایت تھی کہ دفتر میں اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور اس کے بعد کے آدمیوں کو ترقیاں مل رہی ہیں۔ اس کا نمبر جب آتا ہے کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہٰذا اس قسم کی کوئی داستان روز ہی مجھ تک پہنچنے لگی۔ لیکن میرے پاس ان سب کے لیے ایک ہی جواب تھا: 'مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔'

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میرے بچپن کے ایک ہم جماعت دوست وارد ہوئے۔ ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھنے جایا کرتے تھے، کوئی ۴۵ سال کی پرانی بات ہے۔ میری عمر ۸،۹ سال سے زیادہ نہ تھی، وہ بھی قریب قریب اسی عمر کے مگر مجھ سے کہیں توانا اور فربہ تھے۔ میں ذہین تھا وہ حد درجے کے غبی۔ مولوی صاحب ان سے عاجز تھے اور انھیں سبق پڑھانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی تھی میں اسے اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا اور مولوی صاحب کی قمچی جہاں لاچار تھی وہاں میری ہمدردی کامیاب ہوگئی۔ بلدیو چل نکلا اور خالق باری تک آ پہنچا۔ مگر اسی درمیان میں مولوی صاحب کی وفات نے اس مکتب کا خاتمہ کردیا اور طلبہ بھی منتشر ہوگئے۔ تب سے بلدیو کو میں نے صرف دو تین بار رات میں دیکھا (میں اب بھی وہی منحنی ہوں وہ اب بھی دیو قامت) رام رام ہوئی۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی اور اپنی اپنی راہ چلے، میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: 'آؤ بھئی بلدیو مزے میں تو ہو۔ کیسے یاد کیا، کیا کرتے ہو آج کل؟'

بلدیو نے دردناک انداز سے کہا: "زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور کیا۔ تم سے ملنے کا بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ یاد کرو وہ کتب والی بات جب تم مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ تمھاری بدولت چار حرف پڑھ گیا اور اپنی زمینداری کا کام سنبھال لیتا ہوں، نہیں مورکھ بنا رہتا۔ تم میرے گرو ہو بھائی، سچ کہتا ہوں مجھ جیسے گدھے کو پڑھانا تمھارا ہی کام تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر اپنی جگہ پر آیا نہیں کہ بالکل صاف، کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ تم تو تب بھی بڑے ذہین تھے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے پُر عزت نظروں سے دیکھا۔ میں نے باچشم تر کہا: "میں تو جب تمھیں دیکھتا ہوں تو یہی جی میں آتا ہے کہ دوڑ کر تمھارے گلے سے لپٹ جاؤں، ۴۵ سال کی مدت گویا بالکل غائب ہو جاتی ہے، وہ مکتب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور بچپن ساری دلفریبیوں کے ساتھ تازہ ہو جاتا ہے۔"

بلدیو نے بھی رقت آمیز لہجے میں جواب دیا: "میں نے تو بھی تمھیں ہمیشہ اپنا مربی اور رہنما سمجھا ہے۔ جب تمھیں دیکھتا ہوں تو چھاتی گز بھر کی ہو جاتی ہے کہ وہ میرا بچپن کا دوست جاتا ہے جو وقت پڑنے پر کبھی دغا نہ دے گا۔ تم کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں، سوکھتے کیوں جاتے ہو۔ گھی نہ ملتا ہو تو ایک دو کنستر بھجوا دوں۔ اب تم بوڑھے ہوئے، خوب ڈٹ کر کھایا کرو۔ اب تو بدن میں جو کچھ طاقت ہے وہ کھانے پینے کی بدولت ہے۔ میں تو اب بھی سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر گھی اُڑا جاتا ہوں ادھر تھوڑا مکھن بھی کھانے لگا ہوں۔ عمر بھر بال بچوں کے لیے مرئے کوئی پوچھتا ہے تمھاری کیا حالت ہے؟ اگر آج کندھا ڈال دوں تو کوئی ایک لوٹا پانی کو نہ پوچھے اس لیے خوب کھاتا ہوں اور سب سے زیادہ کام کرتا ہوں۔ وہی جو بڑا لڑکا ہے اس پر پولیس نے ایک جھوٹا مقدمہ چلا دیا ہے۔ اچھا خاصا پہلوان ہے کسی سے دبتا نہیں داروغہ جی سے ایک بار کچھ کہا سنی ہوگئی تب سے اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ ادھر گاؤں میں ایک ڈاکہ پڑ گیا داروغہ جی نے تحقیقات میں اسے بھی پھانس لیا۔ ایک ہفتے سے حراست میں ہے۔ مقدمہ محمد خلیل صاحب ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں ہے اور محمد خلیل اور داروغہ کی گہری دوستی ہے۔ ضرور سزا ہو جائے گی۔ اب تم ہی بچاؤ تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔ ہمیں اور کوئی امید نہیں ہے۔ سزا تو ہوگی ہی عزت خاک میں مل جائے گی تم جا کر حاکم ضلع سے اتنا کہہ دو کہ مقدمہ جھوٹا ہے آپ خود تحقیقات کریں۔ بس دیکھو بچپن کے ساتھی ہو، انکار مت کرنا۔ جانتا ہوں کہ تم ان معاملات میں نہیں پڑتے اور نہ پڑنا چاہیے۔ افسر ضلع سے تمھاری دوسری طرح کی ملاقات ہے۔ تم کیوں ان قضیوں میں پڑو گے لیکن یہ گھر کا معاملہ ہے اتنا سمجھ لو اور بالکل جھوٹا ہے نہیں تو میں تمھارے

پاس نہیں آتا۔ لڑکے کی ماں رو رو کر جان دیے ڈالتی ہے، بیوی نے دانہ پانی چھوڑ رکھا ہے۔ سات دن سے گھر میں چولھا نہیں جلا۔ میں دودھ پی لیتا ہوں، لیکن دونوں ساس بہو بے آب و دانہ پڑی ہوئی ہیں۔ اگر سزا ہوئی تو دونوں مر جائیں گی، میں نے یہی کہہ کر سب کو ڈھارس دی ہے کہ جب تک ہمارا بچپن کا دوست زندہ ہے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

میں بڑی مشکل میں پڑا۔ میری جانب سے جتنے اعتراضات ہو سکتے تھے ان کا جواب بلدیو سنگھ نے پہلے ہی دے دیا تھا۔ اگر ان کا اعادہ کرتا ہوں تو سر ہو جائے گا۔ گلا نہ چھوڑے گا۔ کوئی جواب نہ سوجھا آخر مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ میں جا کر صاحب سے اس کا ذکر کر دوں گا۔ مگر مجھے اُمید نہیں کہ اس کا کچھ نتیجہ ہو۔ حکام ماتحتوں کے معاملے میں بہت کم دخل دیا کرتے ہیں۔

"تم جا کر کہہ دو۔ تقدیر میں جو ہے وہ تو ہوگا ہی۔"

"اچھی بات ہے۔"

"تو کل جاؤ گے۔"

"کل ہی جاؤں گا۔"

بلدیو سنگھ کو رخصت کر کے میں نے اپنا مضمون ختم کیا اور آرام سے کھانا کھا کر لیٹا۔ میں نے بلدیو سنگھ کو جھانسا دیا تھا۔ میں پہلے سے بتا چکا تھا کہ عام طور پر پولیس کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی کافی گنجائش تھی کہ صاحب نے اس معاملہ میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ صاحب کے پاس جانے کا میں نے خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا۔

میں اس واقعہ کو بالکل بھول گیا تھا کہ آٹھویں دن بلدیو سنگھ اپنے پہلوان بیٹے کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ بیٹے نے میرے قدموں پر سر رکھ دیا اور ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ بلدیو سنگھ بولے: "بالکل بری ہو گیا بھائی، صاحب نے داروغہ جی کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ تم بھلے آدمیوں کو ستاتے اور بدنام کرتے ہو۔ اگر پھر ایسی شرارت کی تو برخاست کر دیے جاؤ گے۔ داروغہ بہت پشیمان ہوئے۔ جب صاحب نے اسے بری کر دیا تو میں نے داروغہ صاحب کو جھک کر سلام کیا۔ بچارے پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یہ تمھاری سفارش کی برکت ہے برادر، اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو چار آدمیوں کی جان بچ گئی۔ میں تمھارے پاس بہت ڈرتے ڈرتے آیا تھا۔ لوگوں نے کہا تھا کہ ان کے پاس ناحق جاتے ہو، وہ بڑا بے مروّت آدمی ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ آدمی وہ کہلاتا ہے جس سے ضرورت مندوں کا کام نکلے وہ کیا آدمی ہے جو کسی کی کچھ سنے ہی نہیں، یہی کہے مجھ سے کچھ مطلب نہیں، لیکن بھائی میں نے کسی کی نہ سنی میرے دل میں میرا رام بیٹھا کہہ رہا تھا کہ تم

چاہے کتنے ہی روکھے بے مروّت ہو۔ لیکن مجھ پر ضرور رحم کرو گے۔"
یہ کہہ کر بلدیو سنگھ نے اپنے لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ باہر گیا اور ایک بڑا سا گٹھر اُٹھا لایا۔ جس میں انواع و اقسام کی دیہاتی سوغاتیں بندھی ہوئی تھیں حالانکہ میں برابر کہے جاتا تھا: "کوئی ضرورت نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔"
مگر اس وقت بھی مجھے یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ میں صاحب کے پاس گیا نہیں جو کچھ ہوا خود بخود ہوا۔ مفت کا احسان چھوڑنا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

○

"بازارِ حسن"، "گوشۂ عافیت"، "چوگانِ ہستی" اور "میدانِ عمل" ڈیڑھ دو سال کے عرصے میں لکھے گئے تھے۔ "گؤدان" کی شروعات لکھنؤ میں چار سال پہلے ہوئی تھی۔ پھر بنارس میں دو بعد میں بمبئی میں۔ اب اسے مکمّل کیا گیا اور مارچ ۱۹۳۲ء میں اسے پریس کے حوالے کیا گیا۔ جب یہ شائع ہوا تب ایک نیا ناول "منگل سوتر" شروع کر دیا گیا۔ مگر اس ناول کے علاوہ اب دو سلسلوں کو حل کرنے کا ارادہ تھا؛ اس کے لیے لاہور، دلّی، علی گڑھ اور لکھنؤ کا سفر کیا۔
ایک سلسلہ تھا ہندی اور اُردو دونوں کو نزدیک لانے کا۔ دوسرے الفاظ میں ملی جلی زبان ہندستانی کو فروغ دینے کا۔ اس کے لیے مضامین اور ہندستانی سبھاؤں کا اہتمام۔
ایک دوسرا اہم مسئلہ تھا قومی ادب کی تحریک کو فروغ دینا۔ اس کے لیے ہندی ماہنامہ "ہنس" ہندی رسم الخط کے ذریعے ہندستان کی سبھی زبانوں کے ادبیات سے بہترین مواد فراہم کر کے پبلک کو دینا اور اس طرح قومی ادب کی بنیاد ڈالنا جس میں ہر ایک زبان کے مصنف اور ادیب موجود ہوں۔ فی الحال ایک زبان والوں کو دوسری زبان سے ایک بے گانگی سی ہوتی ہے۔ بنگلہ والوں کو گجراتی کی کچھ خبر نہیں اور مرہٹوں کو بنگلہ کی کچھ خبر نہیں ہوتی ہے۔ صوبہ جاتی ادبیات میں کیا کیا جواہر بھرے ہوئے ہیں اور روز روز پیدا ہوتے جاتے ہیں اس کی طرف کسی کی توجّہ نہیں ہے۔ "ہنس" نے یہ خدمت اپنے ذمّہ لی، اس میں تیلگو بنگلہ، کنڑی، مرہٹی، گجراتی اور ملیالم وغیرہ زبانوں کے تخلیقی کارنامے رہتے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ سبھی زبانوں کے ادیبوں سے ہم واقف ہو جائیں۔ زبان کی حدود کے باعث کسی باکمال بزرگ کی ادبیات سے فیض اُٹھانے سے ہم کیوں محروم ہوں۔ اُردو کے لیے بھی ایک حصہ وقف ہے۔
کچھ عرصے سے ملک بھر میں یہ تحریک ہو رہی تھی کہ ہندی میں، جو اب رفتہ رفتہ قومی زبان کا درجہ حاصل کرتی جا رہی ہے۔ ایک ایسا رسالہ جاری ہو جائے جو ہر صوبے کی ادبیات سے ہندی شناس اشخاص کو آشنا کر دے۔ ابھی تک

ہندستان کا کوئی قومی ادب نہیں ہے۔ ہر صوبہ فرداً فرداً اپنے ادب کی ترقّی کے لیے کوشاں ہے۔ چنانچہ ایک صوبے کے لوگ دوسرے صوبے کے کمال سے بالکل غیر متعارف ہیں۔ اُردو میں بہت کم اصحاب کو معلوم ہے کہ بنگلہ، گجراتی، مراٹھی، تمل، کنڑی وغیرہ زبانوں میں کیا ہے۔۔۔۔ ان صوبجات کی بھی اُردو سے اتنی ہی لاعلمی ہے۔ ہندستان میں صوبہ جاتی زبانوں میں کون سے باکمال پڑے ہوئے ہیں ان کی ہمیں بالکل خبر نہیں ہے۔ اسی بے گانگی کو دُور کرنے اور اُنھیں ایک دوسرے کی تصانیف سے روشناس کرانے کے لیے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جارہی ہے جس کا پہلا قدم اس رسالے کو شائع کرنا ہے۔ یہ انجمن تھی بھارتیہ ساہتیہ پریشد۔ صدر تھے مہاتما گاندھی۔ یہ طے کیا گیا کہ اکتوبر ۱۹۳۵ء سے "ہنس" کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے وقف کردیا جائے۔ ساہتیہ پریشد اُسے اپنے صدر رسالہ کی شکل میں شائع کرے۔ کنہیا لال منشی اور پریم چند اعزازی طور پر مدیر کے طور پر کام کریں۔ ہنس لمیٹڈ کا قیام اور اس کی رجسٹری کی جائے۔

میرا خیال تھا کہ "ہنس" پہلے کی طرح سرسوتی پریس میں ہی چھپا کرے گا اور مجھے پریس کی جانب سے بے فکری رہے گی۔

۱۹۳۶ء کے ابتدا میں آل انڈیا پروگریسو رائٹرس کانفرنس وجود میں آئی۔ اس کی بنیاد لندن میں کچھ ہندستانی ادیبوں نے ڈالی تھی۔ ہندستان میں اس کی شاخ کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کا افتتاحی اجلاس لکھنؤ میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سجّاد ظہیر نے اس سلسلے میں میرے سے تعلّق کیا اور صدارت کے لیے پیشکش کی۔ میں نے صلاح دی اس کام کے لیے جواہر لال نہرو یا راجندر پرشاد کو مدعو کرو۔ انھوں نے اصرار کیا۔ مجھے صدارت کرنی پڑی۔ صدارتی خطبہ پیش ہے:

حضرات! یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے سمّیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اُس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے، یہاں تک کہ اُردو اور ہندی کا ابتدائی لٹریچر جو موجود ہے اُس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا، وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرلے اُس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے پانیروں نے ہندستانی زبان کی تعمیر کرکے قوم پر جو احسان کیا ہے۔ اس کے لیے ہم اُن کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔ لیکن زبان ذریعہ ہے، منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کرلی ہے کہ ہم زبان سے گذر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیونکر پوری ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداءً باغ و بہار اور بیتال پچیسی کی تصنیف ہی معراجِ کمال تھی اب اس

قابل ہوگئی ہے کہ علم اور حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔ اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔ زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میر امّن اور للو لال کے زمانہ میں بھی موجود تھی، انھوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریر کی زبان تھی، اور وہی ادب ہے۔ ہم بول چال سے اپنے قریب کے لوگوں سے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، اپنی خوشی یا رنج کے جذبات کا نقشہ کھینچتے ہیں، ادیب وہی کام تحریر سے کرتا ہے، ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ میرا یہ منشا نہیں کہ جو کچھ سپردِ قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ ادب اُسی تحریر کو کہیں گے جس میں حقیقت کا اظہار ہو، جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو۔ اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت، کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔ طلسماتی حکایتوں یا بھوت پریت کے قصوں یا شہزادوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ہم کسی زمانہ میں متاثر ہوئے ہوں لیکن اب اُن میں ہمارے لیے بہت کم دلچسپی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرتِ انسانی کا ماہر ادیب شہزادوں کے حسن و عشق اور طلسماتی حکایتوں میں بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کرسکتا ہے اور ان میں حسن کی تخلیق کرسکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اسی حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ لٹریچر میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو۔ پھر اُسے آپ جس پس منظر میں چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ چڑے کی حکایت یا گل وبلبل کی داستان بھی اس کے لیے موزوں ثابت ہو سکتی ہیں۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقیدانہ ہے، چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ ہم جس دور سے گذرے ہیں اُسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اُس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانہ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستانِ خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے، اس میں کلام ہی نہ تھا، بلکہ وہ مسلّم تھا، قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی، دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعرا پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انھیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدّت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی

بندش، یا نئی تشبیہ، یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لیے کافی تھا۔ چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو۔ یاس اور درد کی کیفیتیں، آشیانہ اور قفس، برق اور خرمن کے تخیل میں اس خوبی سے دکھائی جاتی تھیں کہ سننے والے دل تھام لیتے تھے، اور آج بھی وہ شاعری کس قدر مقبول ہے اسے ہم اور آپ خوب جانتے ہیں۔ بیشک شعرا اور ادب کا منشا ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے، لیکن انسان کی زندگی محض جنسی نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور اُن سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہو یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو۔ ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانہ کے لیے فخر کا باعث نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔
کیا ہندی اور کیا اُردو شاعری۔ دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس وقت ادب اور شاعری کا جو مذاق تھا اُس کے اثر سے بے نیاز ہونا آسان نہ تھا۔ تحسین اور قدر دانی کی ہوس تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔ شعرا کے لیے اپنا کلام ہی ذریعۂ معاش تھا۔ اور کلام کی قدر دانی رؤسا اور اُمرا کے سوا اور کون کر سکتا۔ ہمارے شعرا کو عام زندگی کا سامنا کرنے اور اس کی حقیقتوں سے متاثر ہونے کے لیے یا تو مواقع ہی نہ تھے۔ یا ہر خاص و عام پر ایسی ذہنی پستی چھائی ہوئی تھی کہ ذہنی اور شعوری زندگی رہ ہی نہ گئی تھی۔ ہم اس وقت کے ادیبوں پر اس کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ادب اپنے زمانہ کا عکس ہوتا ہے۔ جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں، وہی ادب میں بھی اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانہ میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں یا تصوف اور ویراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی شاعری اور ادب دونوں اسی قسم کے ہیں۔ جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجیے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی ہے اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اُس نے درجاتِ عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں، اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔

مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے، وہ اب محض عشق اور عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے، وہ اب تحریک یا ابہام کے لیے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا۔ بلکہ اس کو اُن مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے

ہیں۔اس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدّت ہے جس سے وہ ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے صرف اُن کے طرز خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے ادب نے اپنے لیے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چن لیا ہے۔ ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا ہم پر جو کچھ گذرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جا کر تخلیقِ ادب کی تحریک کرتی ہیں۔شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدّتِ احساس ہوتی ہے اُتنا ہی اُس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے۔جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح نہ بیدار ہو۔روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔زمانۂ قدیم میں مذہب کے ہاتھ میں سوسائٹی کی لگام تھی۔انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی، اور وہ تخویف یا تحریص سے کام لیتا تھا، عذاب وثواب کے مسائل اُس کے آلۂ کار تھے۔اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے، اور اس کا آلۂ کار ذوقِ حسن ہے۔وہ انسان میں اسی ذوقِ حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو۔ادیب میں یہ ذوق جتنا ہی بیدار اور پُرعمل ہوتا ہے اتنی ہی اُس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوتِ احساس کے ذریعے اس میں جذبۂ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے، غیر مستحسن ہے، انسانیت سے خالی ہے، وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔یوں کہیے کہ وہ انسانیت کا علویت کا، شرافت کا علم بردار ہے۔جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت۔اُن کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔اُس کی عدالت سوسائٹی ہے۔اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے، اور عدالت کے احساسِ حق اور انصاف اور جذبۂ حسن کی تالیف کر کے اپنی کوشش کو کامیاب سمجھتا ہے۔مگر عام وکلاء کی طرح وہ اپنے مؤکل کی جانب سے جا و بیجا دعوے نہیں پیش کرتا، مبالغہ سے کام نہیں لیتا، اختراع نہیں کرتا۔وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا۔اس عدالت کی تالیف جبھی ممکن ہے جب آپ حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں، ورنہ عدالت آپ سے بدظن ہو جائے گی اور آپ کے خلاف فیصلہ سنا دے گی۔وہ افسانہ لکھتا ہے مگر واقعیت کے ساتھ۔وہ ایک مجسمہ بناتا ہے مگر اس طرح کہ اس میں حرکت بھی ہو اور قوتِ اظہار بھی ہو، وہ فطرتِ انسانی کا باریک نظروں سے مشاہدہ کرتا

ہے، نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کے کیرکٹر ہر حالت میں اور ہر موقع پر اس طرح برتاؤ کریں جیسے گوشت پوست کے انسان کرتے ہیں۔ وہ اپنی طبعی ہمدردی اور حسن پسندی سے زندگی کے اُن نکات پر جا پہنچتا ہے جہاں انسان اپنی انسانیت سے معذور ہو جاتا ہے۔ اور واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک روبہ ترقی ہے کہ آج کا افسانہ ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے تسکین نہیں پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ سبھی کیرکٹر انسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں، اور مصنف نے حتی الامکان اُن کی سوانح عمری لکھی ہے۔ کیونکہ تخیل کے انسان میں ہمارا عقیدہ نہیں۔ ہم اس کے فعلوں اور خیالوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہمیں یہ تحقیق ہو جانا چاہیے کہ مصنف نے جو تخلیق کی ہے وہ مشاہدات کی بنا پر، یا وہ خود اپنے کیرکٹروں کی زبان سے بول رہا ہے۔ اسی لیے ادب کو بعض نقادوں نے مصنف کی نفسیاتی سوانح عمری کہا ہے۔ ایک ہی واقعہ یا کیفیت سے سبھی انسان یکساں طور پر متاثر نہیں ہوتے، ہر شخص کی ذہنیت اور زاویہ نظر الگ ہے، مصنف کا کمال اسی میں ہے کہ وہ جس ذہنیت یا زاویہ سے کسی امر کو دیکھے اس میں اُس کا پڑھنے والا بھی اُس کا ہم خیال ہو جائے۔ یہی اس کی کامیابی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم ادیب سے یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیدار مغزی سے، اپنی وسعتِ خیال سے ہمیں بیدار کرے۔ ہم میں وسعت پیدا کرے۔ اس کی نگاہ اتنی باریک اتنی گہری اور اتنی وسیع ہو کہ ہمیں اُس کے کلام سے روحانی سرور اور تقویت حاصل ہو۔ بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے، ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چمٹی ہوئی ہیں جیسے جسمانی تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری، اسی طرح اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے اور ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اسی طرح مطمئن نہیں ہوتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ جیسے وہ ہمیشہ کسی طبیب کی تلاش میں رہتا ہے اسی طرح ہم بھی اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی کمزوریوں کو پرے پھینک کر بہتر انسان بن جائیں۔ اسی لیے ہم سادھو اور فقیروں کی جستجو کرتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں، بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں، علماء کی تقریریں سنتے ہیں اور ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ہماری ساری کمزوریوں کی ذمہ دار ہماری بد مذاقی اور محبت کے جذبہ سے محروم ہونا ہے۔ جس میں صحیح ذوقِ حسن ہے۔ جس میں محبت کی وسعت ہے وہاں کمزوریاں کہاں رہ سکتی ہیں، محبت ہی تو روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی غذا کے نہ ملنے سے یا مضر غذا کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ ہم میں حسن کا احساس پیدا کرتا ہے اور محبت گرمی، اس کا ایک فقرہ، ایک لفظ، ایک کنایہ اس طرح ہمارے اندر جا بیٹھتا ہے کہ

ہماری روح روشن ہو جاتی ہے، مگر جب تک آرٹسٹ خود جذبۂ حسن سے سرشار نہ ہو اور اُس کی روح خود اس نور سے منور نہ ہو تو ہمیں یہ روشنی کیونکر عطا کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ حسن کیا شے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی طرح کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع و غروب دیکھا ہے، شفق کی سُرخی دیکھی ہے، خوشنما اور خوشبودار پھول دیکھے ہیں، خوش نوا چڑیاں دیکھی ہیں، نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں، ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں، اور یہی حسن ہے۔ ان نظاروں سے ہماری روح کیوں کھل اُٹھتی ہے، اس لیے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے، سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی دلکشی کا باعث ہے۔ ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوئی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اُسی توازن، اُسی ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کی روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے۔ اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشوونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں، وہیں استحکام ہے، زندگی ہے، جہاں ان کا فقدان ہے وہیں افتراق خود پروری ہے، اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔ یہ افتراق غیر فطری زندگی کی علامتیں ہیں، جیسی بیماری غیر فطری زندگی کی، جہاں فطرت سے مناسبت اور توازن ہے وہاں تنگ خیالیوں اور خود غرضیوں کا وجود کیسے ہوگا۔ جب ہماری روح فطرت کی کھلی ہوئی فضا میں نشوونما پاتی ہے تو خباثتِ نفس کے جراثیم خود بخود ہوا اور روشنی سے مر جاتے ہیں۔ فطرت سے الگ ہو کر اپنے کو محدود کرنے سے ہی یہ ساری ذہنی اور جذباتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسی کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہی اس کا مقصدِ اولیٰ ہے۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے، ادب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقتاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو شاید وہ ادیب نہ ہوتا، وہ آئیڈیلسٹ ہوتا ہے، اُسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے اس کی روح بیقرار رہتی ہے۔ وہ اپنے تخیل میں فرد اور جماعت کو مسرت اور آزادی کی جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اُسے نظر نہیں آتی۔ اس لیے موجودہ ذہنی اور اجتماعی حالتوں سے اس کا دل بیزار ہوتا ہے۔ وہ ان ناخوشگوار حالات کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دنیا جینے اور مرنے کے لیے بہتر جگہ ہو جائے۔ یہی درد اور یہی جذبہ اُس کے دل و دماغ کو سرگرم کار رکھتا ہے، اُس کا حساس دل اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت کیوں معاشرت اور رسوم کے قیود میں

پڑ کر اذیت باقی رہے۔ کیوں نہ وہ اسباب مہیا کیے جائیں کہ وہ غلامی اور عسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بیتابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اُس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو جس تناسب سے ادا کرتا ہے وہی اس کے کمال کا راز ہے۔ مگر شاید اس تخصیص کی ضرورت اس لیے پڑتی کہ ترقی کا مفہوم ہر ایک مصنّف کے ذہن میں یکساں نہیں ہے۔ جن حالات کو ایک جماعت ترقی سمجھتی ہے اُنھیں کو دوسری جماعت عین زوال سمجھ سکتی ہے۔ اس لیے ادیب اپنے آرٹ کو کسی مقصد کے تابع نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے خیال میں آرٹ صرف جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ ان جذبات سے فرد یا جماعت پر خواہ کیسا ہی اثر پڑے ترقّی کا ہمارا مفہوم وہ صورت حالات ہے جس سے ہم میں استحکام اور قوت عمل پیدا ہو۔ جس سے ہمیں اپنی خستہ حالی کا احساس ہو، ہم دیکھیں کہ ہم کن داخلی اور خارجی اسباب کے زیرِ اثر اس جمود اور انحطاط کی حالت کو پہنچ گئے ہیں، اور انھیں دُور کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے لیے وہ شاعرانہ جذبات بے معنی ہیں جن سے دنیا کی بے ثباتی ہمارے دل پر اور زیادہ مسلّط ہو جائے، جن سے ہمارے دلوں پر مایوسی طاری ہو جائے۔ وہ حسن و عشق کی داستانیں، جن سے ہمارے رسائل بھرے ہوتے ہیں، ہمارے لیے بے معنی ہیں اگر وہ ہم میں حرکت اور حرارت نہیں پیدا کرتے۔ اگر ہم نے دو نوجوانوں کے حسن و عشق کی داستان کہہ ڈالی، مگر اس سے ہمارے ذوقِ حسن پر کوئی اثر نہ پڑا، اور پڑا بھی تو صرف اتنا کہ ہم اُن کی ہجر کی تکلیفوں پر روئے تو اس سے ہم میں کون سی ذہنی یا ذوقی حرکت پیدا ہوئی۔ ان باتوں سے کسی زمانہ میں ہم کو وجد آیا ہو مگر آج کے لیے وہ بیکار ہے۔ اس جذباتی آرٹ کا زمانہ اب نہیں رہا۔ اب تو ہمیں اُس آرٹ کی ضرورت ہے جس میں عمل کا پیغام ہو۔ اب تو حضرت اقبال کے ساتھ ہم بھی کہتے ہیں:

رمزِ حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی   در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را

بہ آشیاں نہ نشینم زلذتِ پرواز   گہے بشاخِ گلم گاہ برلبِ جوئم

چنانچہ ہمارے مشرب میں داخلیت وہ شے ہے جو جمود پستی اور سہل انگاری کی طرف لے جاتی ہے، اور ایسا آرٹ ہمارے لیے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے اور نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کے میزان پر تولتا ہوں۔ بیشک آرٹ کا مقصد ذوقِ حسن کی تقویت ہے، اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے۔ لیکن ایسی کوئی ذوقی، معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے، اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے

مسرت بھی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی شفق بیشک نہایت خوشنما نظارہ ہے، لیکن اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لیے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر ہم اس لیے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی اُمید ہوتی ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی اسی لیے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں نمو اور تقویت ملتی ہے، فطرت کا قانون نمو اور ارتقا ہے، اور جن جذبات، کیفیات یا خیالات سے ہمیں مسرت ہوتی ہے، وہ اسی نمو کے معاون ہیں۔ آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کر کے اسباب اور حالات کو بالیدگی کے لیے سازگار بناتا ہے۔

مگر حسن بھی اور چیزوں کی طرح مطلق نہیں، اس کی حیثیت بھی اضافی ہے، ایک رئیس کے لیے جو چیز مسرت کا باعث ہے وہی دوسرے کے لیے رنج کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک رئیس اپنے شگفتہ و شاداب باغیچہ میں بیٹھ کر چڑیوں کے نغمے سنتا ہے تو اُسے جنت کی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن ایک نادار لیکن باخبر انسان اس امارت کے لوازمے کو مکروہ ترین چیز سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغ دار ہو رہی ہے۔ ''اخوت اور مساوات''، تہذیب اور معاشرت کی ابتدا سے ہی آئیڈیلسٹوں کا زرّیں خواب رہی ہے۔ پیشوایان دین نے مذہبی اخلاقی اور روحانی بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ۔ حضرت عیسیٰ حضرت محمد بھی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر اس مساوات کی عمارت کھڑی کرنی چاہی مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی، اور آج اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفاوت جتنی بیدردی سے نمایاں ہو رہی ہے شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ آزمودہ را آزمودن جہل است کے مصداق اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہی ہوگی۔ کیا ہم اس خواب کو پریشاں دماغ کی خلاقی سمجھ کر اسے بھول جائیں؟ تب تو انسان کی ترقی اور تکمیل کے لیے کوئی آئیڈیل ہی باقی نہ رہ جائے گا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان کا وجود ہی مٹ جائے۔ جس آئیڈیل کو ہم نے تہذیب کے آغاز سے پالا ہے جس کے لیے انسان نے خدا جانے کتنی قربانیاں کی ہیں، جس کی تکمیل کے لیے مذاہب کا ظہور ہوا، انسانی معاشرت کی تاریخ اسی آئیڈیل کے تکمیل کی تاریخ ہے، اسے مسلمہ سمجھ کر، ایک نہ مٹنے والی حقیقت سمجھ کر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے، ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے، جہاں وہ مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے۔ ہمارے لٹریچر کو اُسی آئیڈیل کو پیش نظر رکھنا ہے۔ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اُس کا معیار امیرانہ، عیش

پروانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا، انھیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح اور تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہ محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اُٹھتی تھی، جھونپڑے اور کھنڈر۔ اس کی التفات کے قابل نہ تھے۔ انھیں وہ انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھتا تھا۔ اگر کبھی اُن کا ذکر بھی کرتا تھا تو مضحکہ اُڑانے کے لیے۔ اُس کی دہقانی وضع اور معاشرت پر ہنسنے کے لیے۔ اس کا شین قاف درست نہ ہونا یا محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا۔ وہ بھی انسان ہے، اس کے بھی دل ہے، اس میں بھی آرزوئیں ہیں۔ یہ آرٹ کے ذہن سے بعید تھا۔ آرٹ نام تھا اور اب بھی ہے، محدود صورت پرستی کا۔ الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا، اس کے لیے کوئی آئیڈیل نہیں ہے زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں ہے۔ بھگتی اور ویراگ اور تصوف اور دنیا سے کنارہ کشی اس کے بلند ترین تخیلات ہیں، اس کے نزدیک یہی معراجِ زندگی ہے، اس کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی ہے کہ وہ کشمکشِ حیات میں حسن کا معراج دیکھے۔ فاقہ و عریانی میں بھی حسن کا وجود ہوسکتا ہے۔ اسے شاید وہ تسلیم نہیں کرتا، اس کے لیے حسن حسین عورت میں ہے، اُس بچوں والی غریب بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی مینڈ پر سلائے پسینہ بہا رہی ہے، اس نے طے کرلیا ہے کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں اور ابروؤں میں فی الواقعی حسن کا باس ہے۔ اُلجھے ہوئے بالوں۔ پپڑیاں پڑے ہوئے ہونٹوں اور کملائے ہوئے رخساروں میں حسن کا گذر کہاں۔ لیکن یہ اُس کی تنگ نظری کا قصور ہے۔ اگر اُس کی نگاہِ حسن میں وسعت آجائے تو وہ دیکھے گا کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں کی آڑ میں اگر نخوت اور خود آرائی اور بے حسی ہے، تو ان مرجھائے ہونٹوں اور کملائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار اور عقیدت اور مشکل پسندی ہے۔ ہاں اس میں نفاست نہیں، نمو نہیں، لطافت نہیں۔ ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنفِ نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے۔ آئیڈیلزم کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا، اُسے تو اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا:

از دست جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

یا

چو موج ساز وجودم زسیل بے پرواست گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہِ حسن عالمگیر ہوجائے گی۔ جب ساری خلقت

اس کے دائرہ میں آجائے گی۔ وہ کسی خاص طبقے تک محدود نہ ہوگا۔ اس کی پرواز کے لیے محض باغ کی چہاردیواری نہ ہوگی، بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ تب ہم بدمذاقی کے متحمل نہ ہوں گے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کرسکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں، تب ہماری خود دار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ تبھی ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے، اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ اُن کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

ہمیں اکثر یہ شکایت ہوتی ہے کہ ادیبوں کے لیے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ یعنی ہندستان کے ادیبوں کو۔ مہذب ملکوں میں تو ادیب سوسائٹی کا معزز رکن ہے اور وزرا اور امرا اُس سے ملنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں مگر ہندستان تو ابھی تک قرونِ وسطیٰ کی حالت میں پڑا ہوا ہے مگر ادب نے جب امرا کی دریوزہ گری کو ذریعۂ حیات بنالیا ہو اور ان تحریکوں اور ہلچلوں اور انقلابوں سے بے خبر ہو جو سوسائٹی میں ہو رہے ہیں۔ اپنی ہی دنیا بنا کر اس میں روتا اور ہنستا ہو تو اس دنیا میں اس کے لیے جگہ نہ ہونا انصاف سے بعید نہیں ہے۔ جب ادیب کے لیے موزوں طبیعت کے سوا اور کوئی قید نہیں رہی یا اسی طرح جیسے مہاتماپن کے لیے کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں، اُن کی روحانی بلندی ہی کافی ہے تو جیسے مہاتما لوگ دردر پھرنے لگے اسی طرح ادیب بھی لاکھوں کی تعداد میں نکل آئے۔ اس میں شک نہیں کہ ادیب پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا، لیکن اگر ہم تعلیم اور طلب سے اس فطری عطیے میں اضافہ اور وسعت پیدا کرسکیں تو یقیناً ہم ادب کی زیادہ خدمت کرسکیں گے۔ ارسطو نے بھی اور دوسرے حکمانے بھی ادیبوں کے لیے سخت شرطیں عاید کی ہیں اور ان کی ذہنی، اخلاقی، روحانی، جذباتی تہذیب اور تربیت کے لیے اصول اور طریقے مقرر کردیے گئے ہیں۔ مگر آج تو ادیب کے لیے محض ایک رجحان کافی سمجھا جاتا ہے اور بس۔ اور کسی قسم کی تیاری کی اس کے لیے ضرورت نہیں۔ وہ سیاسیات یا معاشیات، یا نفسیات وغیرہ علوم سے بالکل بیگانہ ہو، پھر بھی وہ ادیب ہے۔ حالانکہ ادب کے سامنے آج کل جو آئیڈیل رکھا گیا ہے اُس کے مطابق یہ سبھی علوم اس کے جزوِ خاص بن گئے ہیں اور اُس کا رجحان داخلیت یا انفرادیت تک محدود نہیں رہا، وہ نفسیاتی اور معاشی ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب فرد کو جماعت سے الگ نہیں دیکھتا بلکہ فرد کو جماعت کے ایک حصہ کی شکل میں

دیکھتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ جماعت پر حکومت کرے، اُسے اپنے غرض کا آلہ بنائے، گویا جماعت میں اور اس میں ازلی دشمنی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ جماعت کی ہستی کے ساتھ اس کی ہستی بھی قائم ہے اور جماعت سے الگ وہ صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں جنھیں بہترین تعلیم اور بہترین ذہنی قویٰ ملے ہیں اُن کے اوپر سماج کی اتنی ہی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ جس طرح سرمایہ دار کو ہم غاصب اور جابر کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ عوام کی محنت سے خود زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اُسی طرح ہم اس ذہنی سرمایہ دار کو بھی پرستش کے قابل نہ سمجھیں گے جو سماج کے پیسے سے اونچی سے اونچی تعلیم پاکر اُسے خالصاً اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سماج سے ذاتی نفع حاصل کرنا ایسا فعل ہے جسے کوئی ادیب کبھی پسند نہ کرے گا۔ اس سرمایہ دار کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے فائدہ کو ذات سے زیادہ توجہ کے لائق سمجھے۔ اپنے علم و کمال سے جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے، وہ ادب کے کسی صنف میں بھی قدم کیوں نہ رکھے اُسے اس صنف پر خصوصاً اور عام حالات سے عموماً واقف ہونا چاہیے۔ اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں، تو ہم دیکھیں گے کہ ایسا کوئی علمی، معاشی، تاریخی اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر ان میں تبادلۂ خیالات نہ ہوتا ہو۔ اس کے برعکس ہم اپنے مبلغ علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبیعت اور رواں قلم ہی ادب کے لیے کافی ہے۔ مگر ہماری ادبی پستی کا باعث یہی خیال ہے۔ ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا پڑے گا تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابل قدر خدمت کر سکے تاکہ جماعت میں اُسے وہ درجہ ملے جو اُس کا حق ہے، تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبے سے بحث کر سکے، اور ہم دوسری زبانوں اور ادبوں کے دسترخوان کے جوٹھے نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ کریں، بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔ ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہیے اور اس موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا چاہیے۔ ہم جس اقتصادی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اُس میں یہ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ہمارا معیار اونچا رہنا چاہیے۔ اگر ہم پہاڑ کی چوٹی تک نہ پہنچ سکیں گے تو کمر تک تو پہنچ ہی جائیں گے۔ جو سطحِ زمین پر پڑے رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر ہمارا باطن محبت سے منور ہو اور خدمت کا معیار ہمارے پیشِ نظر ہو، جو اسی محبت کی ظاہری صورت ہے، تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پا سکیں۔ جنھیں ثروت اور دولت پیاری ہے اُن کے لیے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے۔ یہاں تو اُن اُپاسکوں کی ضرورت ہے جنھوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہو، جن کے دل میں درد کی تڑپ ہو اور محبت کا جوش ہو۔ اپنی عزت تو اپنے ہاتھ ہے۔ اگر ہم

سچّے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز اور شہرت بھی ہمارے قدم چومیں گی، پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے؟ اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں خدمت میں جو روحانی مسرّت ہے وہی ہمارا صلہ ہے، ہمیں جماعت پر اپنی حقیقت جتانے کی، اس پر رعب جمانے کی ہوس کیوں ہو؟ دوسروں سے زیادہ آرام اور آسائش سے رہنے کی خواہش بھی ہمیں کیوں ستائے؟ ہم امراء کے طبقہ میں اپنا شمار کیوں کرائیں؟ ہم تو جماعت کے علم بردار ہیں، اور سادہ زندگی کے ساتھ اونچی نگاہ ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔ جو شخص سچا آرٹسٹ ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنے قلب کے اطمینان کے لیے نمائش کی ضرورت نہیں۔ اس سے تو اُسے نفرت ہوتی ہے۔ وہ تو اقبالؔ کے ساتھ کہتا ہے:

مردم آزادم و آں گونہ غیورم کہ مرا
می تواں کشت بہ یک جام زلالِ دگراں

ہماری انجمن (مصنفین کی انجمن) نے کچھ اسی طرح کے اُصولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے، وہ ادب کو خمریات و شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ ادب کو سعی اور عمل کی پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے۔ اُسے زبان سے بحث نہیں، آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے، حسنِ معنی و آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو ادیب اُمرا کا ہے وہ اُمرا کا طرزِ بیان اختیار کرتا ہے، جو عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان میں لکھتا ہے۔ ہمارا مدّعا ملک میں ایسی فضا پیدا کر دینا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو و نما پا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں، جبھی وہ فضا تیار ہوگی، جبھی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوگا۔ ہم ہر ایک صوبہ میں، ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں کھولنا چاہتے ہیں، تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یہ ہماری ایجاد ہے، نہیں ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجزن ہیں، ہندستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالاتِ روزگار نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے۔ جابجا اس کے انکھوئے بھی نکلنے لگے ہیں، اس کی آبیاری کرنا، اُس کے آئیڈیل کو تقویت پہنچانا ہمارا مدّعا ہے۔ ہم ادیبوں میں قوتِ عمل کا فقدان ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ابھی تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا اُس کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی، فقدانِ عمل ہی اُس کا جوہر تھا، کیونکہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ تعصب اور تنگ نظری بھی لاتا ہے۔ اگر کوئی شخص پارسا ہو کر

اپنی پارسائی پر غرہ کرے تو اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسا نہ ہو کر رند ہو۔ رند کی شفاعت کی تو گنجائش ہے پارسائی کے غرور کی تو کہیں شفاعت نہیں۔ بہر حال جب تک ادب کا کام محض تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا گا کر سُلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا اُس وقت تک ادب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی، وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے، مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے، ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔ (ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس، منعقدہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء میں یہ مضمون صدارتی خطبہ کی حیثیت سے پڑھا گیا)

O

بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے صدر رسالہ کے طور پر "ہنس" قومی ادب کی خدمت کر رہا تھا۔ رسالہ سرسوتی پریس میں چھپتا تھا۔ جون ۱۹۳۶ء میں معلوم ہوا کہ "ہنس" میں ۵۰ روپے مہینہ کی کمی پڑ رہی ہے۔ آمدنی ۱۵۰ اور خرچ ۲۰۰۔

۴ جولائی کو پریشد کی وار دھا میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ پریشد "ہنس" کو آزاد شکل میں چلائے۔ اس کی چھپائی کا کام دلّی کے سستا ساہتیہ منڈل اپنے ہاتھ میں لے۔

"ہنس" سے میرا تعلق ٹوٹ گیا۔ مفت کی سرمغزی، بنیوں کے ساتھ کام کر کے شکریہ کی جگہ یہ صلہ ملا کہ تم نے "ہنس" میں زیادہ روپیہ خرچ کر دیا۔ اس کے لیے میں نے دل و جان سے کام کیا۔ اپنے وقت کا اور صحت کا کتنا خون کیا اس کا کسی نے لحاظ نہ کیا۔ میں نے "ہنس" کو ان لوگوں کو اس خیال سے دیا تھا کہ وہ میرے پریس میں چھپتا رہے گا اور مجھے پریس کی جانب سے گونا بے فکری رہے گی، لیکن اب یہ دلّی کے سستا ساہتیہ منڈل کی جانب سے نکلے گا اور اس تبادلے میں پریشد کو پچاس روپیہ ماہانہ کی بچت ہو جائے گی۔

ادھر پریشد کا یہ فیصلہ اُدھر جون اور جولائی ۱۹۳۶ء کے "ہنس" کے شمارے میں سیٹھ گوبند داس کا ایک مضمون شائع ہوا۔ عنوان تھا "سداتیندو سدھانت"۔ برٹش سرکار نے اس پر اعتراض کیا اور "ہنس" لمیٹڈ سے ایک ہزار کی ضمانت مانگی۔ گاندھی جی کو پوچھا گیا، اُنھوں نے ضمانت دینے سے انکار کرتے ہوئے "ہنس" کو بند کرنے کی پیشکش کی۔ اگست کے شمارے میں اس کی اطلاع بھی دے دی گئی۔ "ہنس" میرا تھا۔ میں نے واپس مانگا۔ گاندھی جی نے اجازت دے دی۔ اگست ۱۹۳۶ء میں ضمانت داخل کر دی اور "ہنس" شورانی دیوی کی ادارت میں شائع ہوا۔

جون ۱۹۳۶ء سے مجھے ورمِ جگر کی شکایت ہوگئی۔ دوبار منہ سے سیروں خون نکل گیا۔ بنارس میں علاج سے کوئی فائدہ نہ دیکھ کر لکھنؤ آگیا۔ ڈاکٹر گوبند سہائے کے زیرِ علاج ہوں۔ پاخانہ پیشاب خون وغیرہ کی جانچ ہوچکی ہے۔ مگر ابھی کئی دانت توڑے جائیں گے تب ڈاکٹر صاحب مرض کی تشخیص کریں گے اور علاج شروع ہوگا۔ یا تو اصلاح ہی ہوگی یا خاتمہ ہی ہوگا۔ گھل کر آدھا رہ گیا ہوں۔ زرد۔ نہ کھا سکتا ہوں نہ ہضم ہوتا ہے۔ ایک بار مشکل سے ہارلکس کھا لیتا ہوں۔ دیکھیے اس بیماری سے نجات ملتی ہے یا یہ آخری پیغام ہے۔

مجھے کام کرنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ زندگی کا معیار ہے کام، کام اور کام۔

بیماری کی حالت میں بھی منگل سوتر کی تصنیف جاری تھی، منگل سوتر پیش ہے

●

[منگل سوتر ہندی میں لکھا گیا، نامکمل ناول ہے۔ امرت رائے نے قلم کا سپاہی میں لکھا ہے، منشی جی اپنی تکلیف میں بھی بستر چھوڑ کر نیچے فرش پر بیٹھتے اور منگل سوتر اٹھا لیتے جس کے نایک (دیوکمار) وہ خود ہیں۔ شری پت کا بھی خیال ہے یہ ناول پریم چند کا سوانح ہے۔ ہندستان میں اس کا اُردو ترجمہ نہیں ہوا۔ پاکستان میں انجمن ترقی اُردو نے جناب ڈاکٹر حسن منظر کے اردو ترجمہ کو شائع کیا ہے۔ اسے یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ میں ممنون ہوں۔]

منگل سوتر

بڑے بیٹے سنت کمار کو وکیل بنا کر، چھوٹے بیٹے سادھو کمار کو بی۔اے کی ڈگری دلا کر اور چھوٹی لڑکی پنکجا کے بیاہ کے لیے بیوی کے ہاتھوں میں پانچ ہزار روپے نقد رکھ کر دیوکمار نے سمجھ لیا کہ وہ زندگی کے فرض سے سبکدوش ہوگئے ہیں اور زندگی میں جو کچھ باقی رہا ہے اسے ایشور کی فکر کے سپرد کر سکتے ہیں۔ آج چاہے کوئی ان پر اپنی جائداد کو عیاشی میں اڑا دینے کا الزام لگائے چاہے ادب کی سیوا کے عمل میں، لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کی آتما بہت بڑی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی ان سے مدد مانگے اور مایوس ہو۔ عیش و عشرت جوانی کا نشہ تھا اور زندگی بھر وہ اس نقصان کی تلافی کرتے رہے، لیکن ادب کی سیوا کے سوا انھیں اور کسی کام میں دلچسپی نہ ہوئی اور یہاں دھن کہاں؟ ہاں نام ملا اور ان کی اپنی تسلی کے لیے اتنا کافی تھا۔ پس اندازی میں انھیں یقین بھی نہ تھا۔ ممکن ہے حالات نے اس یقین کو مضبوط کیا ہو لیکن انھیں کبھی پس انداز نہ کر سکنے کا دکھ نہیں ہوا۔ عزت کے ساتھ اپنی گزر بسر ہوتی جائے اس سے زیادہ

وہ اور کچھ نہ چاہتے تھے۔ ادب کے رسیاؤں میں جو ایک اکڑ ہوتی ہے، چاہے اسے شیخی ہی کیوں نہ کہہ لو، وہ ان میں بھی تھی۔ کتنے ہی رئیس اور راجے خواہش مند تھے کہ وہ ان کے دربار میں جائیں، اپنی تحریریں پڑھ کر سنائیں، ان کی نذر کریں، لیکن دیو کمار نے عزت نفس کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا کسی نے بلایا بھی تو شکریہ کر کے ٹال گئے۔ اتنا ہی نہیں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ راجہ اور رئیس میرے دروازے پر آئیں، میری خوشامد کریں، جو انہونی بات تھی۔ اپنے کئی کج فہم، ساتھ کے پڑھے ہوؤں کو وکالت یا دوسرے صیغوں میں دھن کے ڈھیر لگاتے جائدادیں خریدتے، نئے نئے مکان بنواتے دیکھ کر کبھی کبھی انھیں اپنی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ خاص طور پر جب ان کی جیون ساتھی شیو یا گرہستی کی فکروں سے جل کر انھیں کڑوی باتیں سنانے لگتی تھی، پر اپنی لکھنے کی دھن میں قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہی وہ سب کچھ بھول کر ادب کی بہشت میں پہنچ جاتے تھے۔ اپنی قدر و قیمت جاگ اٹھتی تھی، ساری مایوسی اور نا اُمیدی شانت ہو جاتی تھی۔

مگر ادھر کچھ دنوں سے لکھنے لکھانے میں ان کی سرگرمی کچھ ٹھنڈی ہوتی جاتی تھی۔ انھیں کچھ ایسا جان پڑنے لگا تھا کہ ادب کے پرستاروں کو ان سے وہ پہلے کی سی عقیدت نہیں رہی۔ ادھر انھوں نے جو دو کتابیں بڑی محنت سے لکھی تھیں اور جن میں انھوں نے اپنی زندگی کے سارے تجربات اور فن کی ساری پختگی بھر دی تھی ان کی کچھ خاص پذیرائی نہ ہوئی۔ اس کے پہلے جو اُن کی تصانیف آئی تھیں، انھوں نے ادب کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔ ہر ایک خط میں ان کتابوں پر تفصیل سے تنقید ہوئی تھی، ادبی حلقوں نے انھیں بدھائیاں دی تھیں، ادب شناسوں نے قدر دانی سے بھرے خط لکھے تھے۔ گو ان تحریروں کا دیو کمار کی نظر میں اب اتنا وقار نہ تھا، ان کے انداز انھیں ظاہری توصیف کے مکمل بہتان لگتے تھے، طرزِ بیان میں بھی جھوٹ تصنع اور بھاری پن تھا، پر عوام کی نظروں میں وہی تصانیف اب بھی مقبول تھیں۔ ان نئی کامیابیوں سے بن بلائے مہمان کا سا سلوک کیا گیا، جیسے ادبی دنیا متحد ہو کر ان کی بے عزّتی کر رہی ہو۔ کچھ تو یوں بھی ان کی خواہش آرام کرنے کی ہو رہی تھی، اس بے رُخی نے اس خیال کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ ان کے دو چار سچے ادیب دوستوں نے اس منطق سے ان کو ڈھارس دینے کی کوشش کی کہ زور کی بھوک میں معمولی کھانا بھی جتنا اچھا لگتا ہے، بھوک کم ہو جانے پر اس سے کہیں مزے دار نفیس کھانے بھی اتنے اچھے نہیں لگتے، پر اس سے انھیں تسکین نہ ہوئی۔ ان کے خیال میں کسی ادیب کے زندہ ہونے کا یہی پیمانہ تھا کہ اس کے لکھے ہوئے کی بھوک عوام میں برابر قائم رہے جب یہ بھوک نہ رہے تو اس کو میدان سے کوچ کر جانا چاہیے۔ انھیں صرف پنکھا کے

بیاہ کی فکر تھی اور انھیں جب ایک پبلشر نے ان کی پچھلی دونوں تخلیقوں کے پانچ ہزار دے دیے تو انھوں نے اسے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور قلمدان اُٹھا کر ہمیشہ کے لیے رکھ دیا۔ مگر ان چھ مہینوں میں انھیں بار بار احساس ہوا کہ انھوں نے بانِ پرست لے کر بھی خود کو بندھنوں سے نہ چھڑا پایا۔ شیو پا کی ضد کی تو انھیں کچھ ایسی پروانہ تھی۔ وہ ان دیویوں میں سے تھی جن کا من سنسار سے کبھی نہیں چھوٹتا۔ اسے اب بھی اپنے خاندان پر حکومت کرنے کی زبردست خواہش تھی، اور جب تک ہاتھ میں پیسے بھی نہ ہوں اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکتی تھی۔ جب دیو کمار اپنے چالیس برس کے بیاہ کے جیون میں اس کی یہ پیاس نہ مٹا سکے تو اب اس کی کوشش کرنا وہ پانی پیٹنے سے کم بے حاصل نہ سمجھتے تھے۔ دُکھ انھیں ہوتا تھا سنت کمار کے خیالات اور روّیے پر جوان کو گھر کی دولت لٹا دینے کے لیے اس حالت میں بھی معاف نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دولت جو پچاس سال پہلے دس ہزار میں پھینک دی گئی، آج ہوتی تو اس سے دس ہزار سال کی نکاسی ہو سکتی تھی، ان کی جس اراضی میں دن کو سیار لوٹتے تھے وہاں اب شہر کا سب سے بارونق بازار تھا جس کی زمین سو روپے مربع فٹ کے حساب سے بک رہی تھی۔ سنت کمار کا بڑے پن کی چاہ میں ڈوبا ہوا من رہ رہ کر اپنے پتا پر کڑھتا رہتا تھا۔ باپ اور بیٹے کے مزاج میں اتنا فرق کیسے ہو گیا یہ ایک معمہ تھا۔ دیو کمار کے پاس ضرورت سے ہمیشہ کم رہا، پر ان کے ہاتھ سدا ہی کھلے رہے۔ ان کا خوبصورت، جذبات سے جاگا ہوا من کبھی زر کی پوجا کو جیون مقصد نہ بنا سکا۔ یہ نہیں کہ وہ دھن کا مول جانتے نہ ہوں، مگر ان کے من میں یہ پکی بات جم گئی تھی کہ جس راج میں تین چوتھائی متنفس بھوکے مرتے ہوں وہاں کسی ایک کو بہت سا دھن کمانے کا کوئی اخلاقی حق نہیں ہے، چاہے اس کی اس میں طاقت ہو۔ مگر سنت کمار کی ذہنیت ایسے اخلاقی آدرشوں پر ہنستی تھی۔ کبھی کبھی تو بے دھڑک ہو کر وہ یہاں تک کہہ جاتا کہ: ''جب آپ کو ادب سے پریم تھا تو گرہست بننے کا کیا حق تھا۔ آپ نے اپنا جیون تو چوپٹ کیا ہی، ہمارا جیون بھی مٹی میں ملا دیا۔ اور اب آپ بان پرستھ لے کر بیٹھے ہیں، جیسے آپ کے جیون کے سارے قرضے چک گئے۔''

جاڑوں کے دن تھے۔ آٹھ بج گئے تھے۔ سارا گھر ناشتے کے لیے جمع ہو گیا تھا۔ پنکھا تخت پر چائے اور سنگترے اور سوکھے میوے 'تشتریوں' میں رکھ کر دونوں بھائیوں کو ان کے کمروں سے بلانے گئی اور ایک پل میں آکر سادھو کمار بیٹھ گیا۔ اونچے قد کا، سجیلا، اچھے ڈیل ڈول کا خوبصورت گورا، میٹھے بچن بولنے والا شریف نوجوان تھا جسے صرف کھانے اور سیر سپاٹے سے مطلب تھا۔ جو کچھ مل جائے بھر پیٹ کھا لیتا تھا اور یار دوستوں میں نکل جاتا تھا۔

شیو پا نے پوچھا: ''سنت کہاں رہ گیا؟ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی تو کہے گا یہ تو پانی ہے۔

بلا لے تو سادھو، اسے جیسے کھانے پینے کی بھی چھٹی نہیں ملتی۔''

سادھو سر جھکا کر رہ گیا۔ سنت کمار سے بات کرتے اس کی جان نکلتی تھی۔

شیویا نے ایک لمحے بعد پھر کہا: ''اسے بھی کیوں نہیں بلا لیتا؟''

سادھو نے دبی زبان سے کہا: ''نہیں، بگڑ جائیں گے سویرے سویرے تو میرا سارا دن خراب ہو جائے گا۔''

اتنے میں سنت کمار بھی آ گیا۔ شکل صورت میں چھوٹے بھائی سے ملتا جلتا، صرف جسم اتنا گٹھا ہوا نہیں تھا۔ ہاں چہرے پر طاقت اور غرور کی جھلک تھی، اور منہ پر ایک شکایت سی بیٹھی ہوئی تھی، جیسے اسے کوئی چیز پسند نہ آئی ہو۔

تخت پر بیٹھ کر چائے منہ سے لگائی اور ناک سکیڑ کر بولا: ''تو کیوں نہیں آئی پنکجا؟ اور پشپا کہاں ہے؟ میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ ناشتہ، کھانا پینا سب کا ایک ساتھ ہونا چاہیے۔''

شیویا نے آنکھیں جما کر کہا: ''تم لوگ کھالو، یہ سب پیچھے کھالیں گی۔ دعوت کی قطار تھوڑی ہے کہ سب ایک ساتھ بیٹھیں۔''

سنت کمار نے ایک گھونٹ چائے پی کر کہا ''وہی پرانا خیال...... کتنی بار کہہ چکا کہ اس پرانے خاندانی رسم و رواج کا زمانہ نہیں رہا۔''

شیویا نے منہ بنا کر کہا: ''سب ایک ساتھ تو بیٹھیں لیکن پکائے کون اور پروسے کون؟ ایک مہاراج رکھو پکانے کے لیے، دوسرا پروسنے کے لیے، تب وہ ٹھاٹ نبھے گا۔''

''تو مہاتما جی اس کا انتظام کیوں نہیں کرتے یا بان پر ستھ لینا ہی جانتے ہیں!''

''ان کو جو کچھ کرنا تھا کر چکے۔ اب تمھیں جو کچھ کرنا ہو تم کرو۔''

''جب مرد کی زندگی کا مقصد ان کے سامنے نہیں تھا تو ہم لوگوں کو پڑھایا لکھایا کیوں؟ کسی دیہات میں لے جا کر چھوڑ دیتے۔ ہم اپنی کھیتی کرتے، مزدوری کرتے اور پڑے رہتے۔ یہ کھٹ راگ ہی کیوں پالا؟''

''تم اس وقت نہ تھے، صلاح کس سے لیتے؟''

سنت کمار نے کڑوا منہ بنائے چائے پی، کچھ میوے کھائے پھر سادھو کمار سے بولا۔

''تمھاری ٹیم کب بمبئی جا رہی ہے جی؟''

سادھو کمار نے گردن جھکائے ڈری ہوئی آواز میں کہا: ''پرسوں!''

''تم نے نیا سوٹ بنوایا؟''

''میرا پرانا سوٹ ابھی اچھی طرح کام دے سکتا ہے۔''

''کام تو سوٹ کے نہ ہونے پر بھی چل سکتا ہے۔ ہم لوگ تو ننگے پاؤں دھوتی چڑھا کر کھیلا کرتے تھے۔ مگر جب تم ایک آل انڈیا ٹیم میں کھیلنے جارہے ہوتو ویسا ٹھاٹھ بھی تو ہونا چاہیے۔ پھٹے حالوں جانے سے تو کہیں اچھا ہے نہ جانا۔ جب وہاں لوگ جانیں گے کہ تم مہاتما دیو کمار جی کے بیٹے ہوتو دل میں کیا کہیں گے؟''

سادھو کمار نے کچھ جواب نہ دیا۔ چپ چاپ ناشتہ کرکے چلا گیا۔ وہ اپنے پتا کی مالی حالت جانتا تھا اور انھیں مشکل میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر سنت کمار نئے سوٹ کی ضرورت سمجھتے ہیں تو بنوا کیوں نہیں دیتے؟ پتا کے اوپر بار ڈالنے کے لیے اسے کیوں مجبور کرتے ہیں؟

سادھو چلا گیا تو شیو یا نے زخم خوردہ گلے سے کہا: ''جب انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میرا گھر سے کوئی واسطہ نہیں اور سب کچھ تمھارے اوپر چھوڑ دیا تو تم کیوں ان پر گرہستی کا بار ڈالتے ہو۔ اپنی حیثیت اور عقل کے مطابق جیسے ہوسکا انھوں نے اپنی عمر کاٹ دی۔ جو کچھ وہ نہیں کرسکے یا ان سے چوک ہوئی ان پر فقرے کسنا تمھارے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم نے اس طرح انھیں ستایا تو مجھے ڈر ہے وہ گھر چھوڑ کر کہیں روپوش نہ ہوجائیں۔ وہ دھن نہ کما سکیں، پر اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ جہاں بھی جائیں گے لوگ انھیں سر اور آنکھوں پر لیں گے۔''

شیو یا نے اب تک ہمیشہ پتی کی برائی ہی کی تھی۔ اس وقت اسے ان کی وکالت کرتے دیکھ کر سنت کمار مسکرا پڑا، بولا: ''اگر انھوں نے ایسا ارادہ کیا تو ان سے پہلے میں روپوش ہوجاؤں گا۔ میں یہ بار اپنے سر نہیں لے سکتا انھیں اس کو سنبھالنے میں میری مدد کرنی ہوگی۔ انھیں اپنی کمائی لٹانے کا پورا حق تھا، لیکن باپ دادوں کی جائداد کو لٹانے کا انھیں کوئی حق نہ تھا۔ اس کا انھیں کفارہ ادا کرنا پڑے گا، وہ جائداد ہمیں واپس کرنی ہوگی۔ میں خود بھی کچھ قانون جانتا ہوں۔ وکیلوں مجسٹریٹوں سے بھی صلاح کرچکا ہوں۔ جائداد واپس لی جاسکتی ہے۔ اب مجھے یہی دیکھنا ہے کہ انھیں اپنی اولاد پیاری ہے یا اپنا مہاتما پن!''

سنت کمار کی بیوی پشپا بالکل پھول سی ہے، سندر، نازک، ہلکی پھلکی انتہائی شرمیلی لیکن ایک نمبر کی خود فریب ہے۔ ایک ایک بات کے لیے کئی کئی دن روٹھی رہ سکتی ہے۔ اور اس کا روٹھنا بھی ہر لحاظ سے نئے ڈزائن کا ہے۔ وہ کسی سے کچھ کہتی نہیں، لڑتی نہیں، بگڑتی نہیں، گھر کا سب کام کاج اسی انہماک سے کرتی ہے بلکہ اور بھی زیادہ توجہ سے۔ بس جس سے ناراض ہوتی ہے اس کی طرف تاکتی نہیں۔ وہ جو کچھ کہے گا وہ کرے گی، وہ جو کچھ پوچھے گا جواب دے گی، وہ جو

کچھ مانگنے کا اُٹھا کر دے دے گی مگر بنا اس کی طرف دیکھے ہوئے۔ ادھر کئی دن سے سنت کمار سے ناراض ہوگئی ہے اور اپنی بھری ہوئی آنکھوں سے اس کے سارے حملوں کا سامنا کر رہی ہے۔

سنت کمار نے محبت کے ساتھ کہا: ''آج شام کو چلنا ہے نا؟''

پشپا نے سر نیچا کر کے کہا: ''جیسی تمھاری مرضی۔''

''چلو گی نا؟''

''تم کہتے ہو تو کیوں نہ چلوں گی؟''

''تمھاری کیا مرضی ہے؟''

''میری کوئی مرضی نہیں ہے۔''

''آخر کس بات پر ناراض ہو؟''

''کسی بات پر نہیں۔''

''خیر نہ بولو، لیکن وہ مشکل یوں چپ سادھنے سے حل نہ ہوگی۔''

پشپا کے اس لاتعلقی کے ہتھیار نے سنت کمار کو بوکھلا ڈالا تھا۔ وہ خوب جھگڑ کر اس بات کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا تھا۔ معافی مانگنے پر تیار تھا، ویسی بات اب پھر منہ سے نہ نکالے گا، لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اسے چڑانے کے لیے نہیں، ایک صحیح بات کو تقویت پہنچانے کے لیے ہی کہا تھا۔ اس نے کہا تھا جو عورت مرد کی اب دست نگر ہے اسے مرد کی حکومت ماننی پڑے گی۔ وہ مانتا تھا کہ اس موقع پر یہ بات اسے منہ سے نہ نکالنی چاہیے تھی۔ اگر کہنا ضروری بھی ہوتا تو ملائم لفظوں میں کہنا تھا، لیکن جب ایک عورت اپنے حقوق کے لیے مرد سے لڑتی ہے، اس کی برابری کا دعویٰ کرتی ہے تو اسے کٹھور باتیں سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس وقت بھی وہ اسی لیے آیا تھا کہ پشپا کو قائل کرے اور سمجھائے کہ منہ پھیر لینے سے ہی کسی بات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس میدان کو جیت کر یہاں ایک جھنڈا گاڑ دینا چاہتا تھا۔ جس میں اس موضوع پر کبھی بحث نہ ہو سکے۔ تب سے کتنی ہی نئی نئی دلیلیں اس کے من میں آ گئی تھیں، مگر جب دشمن قلعے کے باہر نکلے ہی نہیں تو اس پر حملہ کیسے کیا جائے۔

ایک طریقہ ہے، دشمن کو بہلا کر، اس پر اپنے صلح کے عہد و پیمان کا اعتماد جما کر قلعے سے نکالنا ہوگا۔

اس نے پشپا کی ٹھوڑی پکڑ کر اپنی طرف پھیرتے ہوئے کہا: ''اگر یہ بات تمھیں اتنی بُری لگ رہی ہے تو میں اسے واپس لیے لیتا ہوں۔ اس کے لیے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ تم کو ایشور نے وہ شکتی دی ہے کہ تم مجھ سے دس پانچ دن بولے بنا رہ سکتی ہو۔ لیکن مجھے تو اس نے وہ شکتی

نہیں دی۔ تم روٹھ جاتی ہو تو جیسے میری رگوں میں خون کا دورہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر وہ طاقت تم مجھے بھی بخش سکو تو میری اور تمھاری برابر کی لڑائی ہو گی اور میں تمھیں چھیڑنے نہ آؤں گا۔ لیکن اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو اس ہتھیار کا بجھ پر وار نہ کرو۔"

پشپا مسکرا پڑی۔ اس نے اپنے ہتھیار سے پتی کو بالکل زیر کر دیا تھا۔ جب وہ ضرورت مند بن کر اس سے معافی مانگ رہا ہے تو اس کا دل کیوں نہ پگھل جائے۔

صلح نامے پر دستخط کی طرح پان کا ایک بیڑا لگا کر سنت کمار کو دیتے ہوئے بولی: "اب سے بھی وہ بات منہ سے نہ نکالنا۔ اگر میں تمھاری محتاج ہوں تو تم بھی میرے محتاج ہو۔ میں تمھارے گھر میں جتنا کام کرتی ہوں، اتنا ہی کام دوسروں کے گھر میں کروں تو اپنا گزارہ کر سکتی ہوں یا نہیں، بولو۔"

سنت کمار نے کڑا جواب دینے کی خواہش کو روک کر کہا: "بہت اچھی طرح۔"

"تب میں جو کچھ کماؤں گی وہ میرا ہوگا۔ یہاں میں چاہے جان بھی دے دوں پر میرا کسی چیز پر حق نہیں۔ تم جب چاہو مجھے گھر سے نکال سکتے ہو۔"

"کہتی جاؤ، مگر اس کا جواب سننے کے لیے تیار رہو۔"

"تمھارے پاس کوئی جواب نہیں ہے، صرف ہٹ دھرمی ہے۔ تم کہو گے۔ یہاں تمھارا جو احترام ہے وہ وہاں نہ رہے گا، وہاں کوئی تمھاری حفاظت کرنے والا نہ ہوگا، کوئی تمھارے دُکھ درد میں ساتھ دینے والا نہ ہوگا۔ اسی طرح کی اور بھی کتنی ہی دلیلیں تم دے سکتے ہو۔ مگر میں نے مس بٹلر کو زندگی بھر کنواری رہ کر عزت کے ساتھ زندگی کاٹتے دیکھا ہے۔ ان کا نجی جیون کیسا تھا یہ میں نہیں جانتی۔ ممکن وہ مثالی ہندو گھر والی کے مطابق نہ رہا ہو، مگر اُن کی عزت سبھی کرتے ہیں، اور انھیں اپنی حفاظت کے لیے کسی مرد کی مدد لینے کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔"

سنت کمار مس بٹلر کو جانتا تھا۔ وہ شہر کی مشہور لیڈی ڈاکٹر تھی۔ پشپا کے گھر سے اس کا تعلق سا ہو گیا تھا۔ پشپا کے پتا ڈاکٹر تھے اور ایک پیشے کے لوگوں میں کچھ قربت ہو جاتی ہے۔ پشپا نے جو مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا اس پر بیٹھے اور غیر جانبدار لفظوں میں کچھ کہنا اس کے لیے کٹھن ہو رہا تھا۔ اور چپ رہنا اس کی مردانگی کے لیے اس سے بھی کٹھن تھا۔

دبدھا میں پڑ کر بولا: "مگر سبھی عورتیں مس بٹلر تو نہیں ہو سکتیں۔"

پشپا نے جوش کے ساتھ کہا: "کیوں؟ اگر وہ ڈاکٹری پڑھ کر اپنا کام کر سکتی ہیں تو میں کیوں نہیں کر سکتی؟"

"ان کے سماج میں اور ہمارے سماج میں بڑا فرق ہے۔"

''یوں کہنا چاہیے ان کے سماج کے مرد مہذب ہیں، اور ہمارے سماج کے مرد بدچلن عیاش ہیں، خاص طور سے جو پڑھے لکھے ہیں۔''

''یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس سماج میں عورتوں میں خوداعتمادی ہے، اپنی حفاظت کرنے کی طاقت ہے اور مردوں کو قابو میں رکھنے کا آرٹ ہے۔''

''ہم بھی تو وہی خوداعتمادی اور طاقت اور آرٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن تم لوگوں کے مارے جب کچھ چلنے پائے۔ روایات اور معیار اور نہ جانے کن کن بہانوں سے ہمیں دبانے کی اور ہمارے اوپر اپنی حکومت جمائے رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔''

سنت کمار نے دیکھا کہ بحث پھر اسی راستے پر چل پڑی ہے جو آخر میں پشپا کو عدم تعاون اختیار کرنے پر تیار کر دیتا ہے، اور اس وقت وہ اسے ناراض کرنے نہیں اسے خوش کرنے آیا تھا۔

بولا: ''اچھا صاحب، سارا قصور مردوں کا ہے، اب راضی ہوئیں۔ مرد بھی حکومت کرتے کرتے تھک گیا ہے اور اب کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہے۔ تمھارے حکم کے تابع رہ کر اگر وہ اس زندگی کی کشمکش سے بچ جائے تو وہ اپنا تخت چھوڑنے کو تیار ہے۔''

پشپا نے مسکرا کر کہا: ''اچھا، آج سے گھر میں بیٹھو۔''

''بڑے شوق سے بیٹھوں گا، میرے لیے اچھے اچھے کپڑے، اچھی اچھی سواریاں لا دو۔ جیسے تم کہوگی ویسا ہی کروں گا۔ تمھاری مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بولوں گا۔''

''پھر تو نہ کہوگے کہ عورت مرد کی محتاج ہے۔ اس لیے اسے مرد کی غلامی کرنی چاہیے؟''

''کبھی نہیں، مگر ایک شرط پر......''

''کون سی شرط؟''

''تمھارے پریم پر میرا ہی حق رہے گا۔''

''عورتیں تو مردوں سے ایسی شرط کبھی نہ منوا سکیں؟''

''یہ ان کی کمزوری تھی، ایشور نے تو انھیں مردوں پر حکومت کرنے کے لیے سب ہی ہتھیار دے دیے تھے۔''

میل ہو جانے پر بھی پشپا کے من کو دلاسا نہ ہوا۔ سنت کمار کا مزاج وہ جانتی تھی۔ عورت پر حکومت کرنے کا جو طور ہے وہ اتنی جلد کیسے بدل سکتا ہے۔ اوپر کی باتوں میں سنت کمار اسے اپنے برابر کی جگہ دیتے تھے۔ لیکن اس میں ایک طرح کا احساس چھپا ہوتا تھا۔ آن بان کی باتوں میں وہ لگام اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ ایسا آدمی یکایک اپنا حق چھوڑنے پر تیار ہو جائے، اس میں کوئی بھید ضرور ہے۔

بولی: ''عورتوں نے ان ہتھیاروں سے اپنی حفاظت نہیں کی، مردوں ہی کی حفاظت کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان میں اپنی حفاظت کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔''

سنت کمار نے محبت کے جذبے سے کہا: ''یہی خیال میرے من میں کئی بار آیا پشپا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر عورت نے مرد کی حفاظت نہ کی ہوتی تو آج دنیا ویران ہو گئی ہوتی۔ اس کا سارا جیون پوجا اور تپسیا کا جیون ہے۔'' تب اس نے اس سے اپنے منصوبے کہہ سنائے۔ وہ ان مہاتماؤں سے اپنی موروثی جائداد واپس لینا چاہتا ہے، اگر پشپا اپنے پتا سے ذکر کرے اور دس ہزار روپے بھی دلا دے تو سنت کمار کو دو لاکھ کی جائداد مل سکتی ہے۔ صرف دس ہزار۔ اتنے روپے بغیر اس کے ہاتھ سے دو لاکھ کی جائداد نکلی جاتی ہے۔

پشپا نے کہا: ''مگر وہ جائداد تو بک چکی ہے۔''

سنت کمار نے سر ہلایا: ''بک نہیں چکی ہے، لُٹ چکی ہے۔ جو زمین لاکھ دو لاکھ میں بھی سستی ہے، دس ہزار میں اس کے کوڑے ہو گئے۔ کوئی بھی سمجھ دار آدمی ایسا غچا نہیں کھا سکتا اور اگر کھا جائے تو وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ دادا گرہستی میں آسودہ نہیں رہے۔ وہ تو ولی آرزوؤں کی دنیا میں رہتے تھے۔ بدمعاشوں نے انھیں چکما دیا اور جائداد نکلوا دی۔ میرا دھرم ہے کہ میں وہ جائداد واپس لوں اور تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے دس ہزار کا انتظام کر دینا کوئی کٹھن بات نہیں ہے۔''

پشپا ایک منٹ تک فکر میں ڈوبی رہی پھر شک کے جذبے سے بولی: ''مجھے تو آشا نہیں کہ دادا کے پاس اتنے روپے فالتو ہوں۔''

''ذرا کہو تو۔''

''کہوں کیسے۔ کیا میں ان کا حال جانتی نہیں؟ ان کی ڈاکٹری اچھی چلتی ہے، پر ان کے خرچ بھی تو ہیں۔ بیرو کے لیے ہر مہینے پانچ سو روپے انگلینڈ بھیجنے پڑتے ہیں۔ تلوتما کی پڑھائی کا خرچ بھی کچھ کم نہیں۔ پس انداز کرنے کی ان کی عادت نہیں ہے۔ میں انھیں مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔''

''میں ادھار مانگتا ہوں، خیرات نہیں۔''

''جہاں اتنا گاڑھا ناتا ہو وہاں اُدھار کے معنی خیرات کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم روپے نہ دے سکے تو وہ تمھارا کیا بگاڑ لیں گے؟ عدالت جا نہیں سکتے، پنچایت کر نہیں سکتے لوگ طعنے دیں گے۔''

سنت کمار نے تیکھے پن سے کہا ''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں روپے نہ دے سکوں گا؟ دنیا

ہنسے گی۔"

پشپا منہ پھیر کر بولی۔ "تمھاری جیت ہونا یقینی نہیں ہے۔ اور جیت بھی ہو جائے اور تمھارے ہاتھ میں روپے آ بھی جائیں تو یہاں کتنے زمین دار ایسے ہیں جو اپنے قرض چکا سکتے ہیں۔ روز ہی تو ریاستیں کورٹ اوف وارڈ میں آیا کرتی ہیں۔ یہ بھی مان لیں کہ تم کفایت سے رہو گے اور دھن جمع کر لو گے، لیکن آدمی کی خصلت ہے کہ وہ جس روپے کو ہضم کر سکتا ہے اسے ہضم کر جاتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کو بھول جانا اس کی ایک عام کمزوری ہے۔"

سنت نے پشپا کو کڑی آنکھوں سے دیکھا۔ پشپا کے کہنے میں جو سچ تھا وہ تیر کی طرح نشانے پر جا بیٹھا۔ اس کے من میں جو چور چھپا بیٹھا تھا اسے پشپا نے پکڑ کر سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ تلملا کر بولا: "آدمی کو تم اتنا نیچ سمجھتی ہو، تمھاری سوچ کی اس نیچ پر مجھے تعجب بھی ہے اور دکھ بھی۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی سماج پر دھرم اور انصاف ہی کا راج ہے۔ جس دن سنسار سے دھرم اور انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا اس دن سماج کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

اس نے مذہب اور انصاف کے اثر پر ایک لمبا، وضاحت کرنے والا لیکچر دے ڈالا۔ کبھی کسی گھر میں کوئی چوری ہو جاتی ہے تو کتنی ہل چل مچ جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ چوری ایک غیر معمولی بات ہے۔ اگر سماج چوروں کا ہوگا تو کسی کا مہاجن ہونا اتنی ہی ہلچل پیدا کرتا۔ آج بیماریوں کے اضافے کا بڑا چرچا ہے۔ لیکن غور سے دیکھو تو سو میں ایک آدمی سے زیادہ بیمار نہ ہوگا۔ اگر بیماری عام بات ہوتی تو تندرستی کی نمائش ہوتی۔

پشپا لاتعلق سی سنتی رہی۔ اس کے پاس جواب تو تھے، پر وہ اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے باپ سے روپے کے لیے نہ کہے گی اور کسی منطق یا مثال کا اس پر کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔

سنت کمار نے تقریر ختم کر کے جب اس سے کوئی جواب نہ پایا تو ایک لمحے کے بعد بولا:

"کیا سوچ رہی ہو؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں، میں بہت جلد روپے دے دوں گا۔"

پشپا نے نہ ٹالنے والے انداز سے کہا "تمھیں کہنا ہو جا کر خود کہو، میں تو نہیں لکھ سکتی۔"

سنت کمار نے ہونٹ چبا کر کہا: "ذرا سی بات تم سے نہیں لکھی جاتی، اس پر دعویٰ یہ ہے کہ گھر پر میرا بھی حق ہے۔"

پشپا نے جوش کے ساتھ کہا: "میرا حق تو اسی لمحے ہو گیا جب میری گانٹھ تم سے بندھی۔"

سنت کمار نے گھمنڈ کے ساتھ کہا: "ایسا حق جتنی آسانی سے مل جاتا ہے اتنی آسانی سے چھن بھی جاتا ہے۔"

پشپا کو جیسے کسی نے دھکا دے کر اس خیال کی رو میں ڈال دیا جس میں پا ڈور کھتے اسے ڈر لگتا تھا۔ اس نے یہاں آنے کے ایک دو مہینے کے بعد ہی سنت کمار کی خصلت کو پہچان لیا تھا۔ ان کے ساتھ نباہ کرنے کے لیے اسے ان کے اشاروں کی لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔ اسے اپنی انفرادیت کو ان کی ہستی میں ضم کر دینا پڑے گا۔ وہ وہی سوچے گی جو وہ سوچیں گے، وہی کرے گی جو وہ کریں گے۔ اپنی آتما کے پھلنے پھولنے کے لیے یہاں کوئی موقع نہ تھا۔ ان کے لیے دنیا یا عقبیٰ میں جو کچھ تھا وہ دولت تھی۔ یہیں سے ان کی زندگی کو تحریک ملتی تھی۔ دھن دولت کے مقابلے میں بیوی یا بیٹے کی بھی ان کی نگاہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ ایک چینی کی پلیٹ پشپا کے ہاتھ سے ٹوٹ جانے پر انھوں نے اس کے کان اینٹھ دیے تھے۔ فرش پر سیاہی گرا دینے کی سزا انھوں نے پنکجا سے سارا فرش دھلوا کر دی تھی۔ پشپا ان کے رکھے روپوں کو کبھی ہاتھ تک نہ لگاتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ دھن کو محض جمع کرنے کی چیز نہ سمجھتے تھے، دھن کام میں لانے کی چیز ہے ان کا یہ عقیدہ تھا۔ فضول خرچی یا لاپروائی برداشت نہ کرتے تھے۔ انھیں اپنے سوا کسی پر بھروسہ نہ تھا۔ پشپا نے کٹھور خود سپردگی کے ساتھ اس جیون کے لیے اپنے کو تیار کر لیا تھا۔ پر بار بار یہ یاد دلایا جانا کہ یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے، یہاں وہ صرف ایک لونڈی کی طرح ہے اسے برداشت نہ تھا۔ ابھی اس دن اسی طرح کی ایک بات سن کر اس نے کئی دن کھانا پینا چھوڑ دیا تھا، اور آج تک اس نے کسی طرح من کو سمجھا کر شانت کیا تھا کہ یہ دوسری چوٹ ہوئی۔ اس نے اس کے رہے سہے صبر کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ سنت کمار تو اسے یہ چنوتی دے کر چلے گئے وہ وہیں بیٹھی سوچنے لگی اب اس کو کیا کرنا چاہیے۔ اس حالت میں تو وہ اب نہیں رہ سکتی۔ وہ جانتی تھی کہ پتا کے گھر میں اس کے لیے شانتی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی سنت کمار کو مثالی نوجوان سمجھتے تھے اور انھیں اس بات کا یقین دلانا کٹھن تھا کہ سنت کمار کی طرف سے کوئی بے جا حرکت ہوئی ہے۔ پشپا کا بیاہ کر کے انھوں نے جیون کی ایک مشکل حل کر لی تھی۔ اس پر پھر غور کرنا ان کے لیے بے سوجھ تھا۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ اب نشچنت ہو کر دنیا کی سیر کریں۔ یہ وقت اب نزدیک آتا جاتا تھا۔ جونہی لڑکا انگلینڈ سے لوٹا اور چھوٹی لڑکی کی شادی ہوئی کہ وہ دنیا کے بندھن سے فارغ ہو جائیں گے۔ پشپا پھر ان کے سر پر پڑ کر ان کے جیون کے سب سے بڑے ارمان میں رکاوٹ نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ پھر اس کے لیے دوسری کون جگہ ہے؟ کوئی نہیں۔ تو کیا اس گھر میں رہ کر زندگی بھر بے عزتی سہتے رہنا پڑے گا؟

سادھو آ کر بیٹھ گیا۔ پشپا نے چونک کر پوچھا: ''تم بمبئی کب جا رہے ہو؟''

سادھو نے ہچکچاتے ہوئے کہا: ''جانا تو تھا کل لیکن میری جانے کی خواہش نہیں۔ آنے

جانے میں سینکڑوں کا خرچ ہے۔ گھر میں روپے نہیں ہیں، میں کسی کو ستانا نہیں چاہتا۔ بمبئی جانے کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس ملک میں دس میں نو آدمی روٹیوں کو ترستے ہوں وہاں دس بیس آدمیوں کا کرکٹ کی لت میں پڑے رہنا مورکھ پن ہے۔ میں تو نہیں جانا چاہتا۔''

پشپا نے جوش دلایا: ''تمھارے بھائی صاحب تو روپے دے رہے ہیں؟''

سادھو نے مسکرا کر کہا: ''بھائی صاحب روپے نہیں دے رہے ہیں، مجھے دادا کا گلا دبانے کو کہہ رہے ہیں۔ میں دادا کو دُکھ نہیں دینا چاہتا۔ بھائی صاحب سے کہنا مت بھابھی۔ تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔''

پشپا اس کی اس عجز بھری سچائی پر ہنس پڑی۔ بائیس سال کا خوددار نوجوان جس نے ستیہ گرہ کی لڑائی میں پڑھنا چھوڑ دیا، دو بار جیل ہو آیا، جیلر کے سخت الفاظ سن کر اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا اور اس بدتمیزی کی سزا میں تین مہینے کال کوٹھری میں رہا، وہ اپنے بھائی سے اتنا ڈرتا ہے۔ جیسے وہ ہوّا ہوں۔ بولی: ''میں تو کہہ دوں گی۔''

''تم نہیں کہہ سکتیں، اتنی بے رحم نہیں ہو۔''

پشپا خوش ہو کر بولی: ''کیسے جانتے ہو؟''

''چہرے سے۔''

''جھوٹے ہو۔''

''تو پھر اتنا اور کہے دیتا ہوں کہ آج بھائی صاحب نے تمھیں بھی کچھ کہا ہے۔''

پشپا جھینپتی ہوئی بولی: ''بالکل غلط، وہ بھلا مجھے کیا کہتے؟''

''اچھا میرے سر کی قسم کھاؤ۔''

''قسم کیوں کھاؤں؟ تم نے مجھے کبھی قسم کھاتے دیکھا ہے؟''

''بھیا نے کچھ کہا ہے ضرور نہیں تمھارا منہ اتنا اترا ہوا کیوں ہوتا، بھائی صاحب سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی ورنہ سمجھاتا آپ کیوں گڑے مردے اکھاڑ رہے ہیں۔ جو جائداد بک گئی اس کے لیے اب دادا کو کوسنا اور عدالت کرنا مجھے تو کچھ جچتا نہیں۔ غریب لوگ بھی تو دنیا میں ہیں یا سب مال دار ہی ہیں۔ میں تم سے ایمان سے کہتا ہوں بھابھی، میں جب کبھی مال دار ہونے کا تصور کرتا ہوں تو مجھے فکر ہونے لگتی ہے کہ نہ جانے میرا من کیا ہو جائے۔ اتنے غریبوں میں دولت مند ہونا مجھے تو اپنی غرض کا اندھا پن لگتا ہے۔ مجھے تو اس حالت میں بھی اپنے اوپر شرم آتی ہے، جب دیکھتا ہوں کہ میرے ہی جیسے لوگ ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ہم تو دونوں وقت چپڑی ہوئی روٹیاں اور دودھ اور سیب سنترے اُڑاتے ہیں مگر سو میں ننانوے آدمی ایسے بھی ہیں

جنھیں ان کھانے پینے کی چیزوں کے درشن بھی نہیں ہوتے۔ آخر ہم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں؟"

پشپا ان خیالات کے نہ ہونے پر بھی سادھو کی بناوٹ سے عاری سچائی کی عزت کرتی تھی، بولی: "تم اتنا پڑھتے تو نہیں، یہ خیالات تمھارے دماغ میں کہاں سے آجاتے ہیں؟"

سادھو نے اُٹھ کر کہا: "شاید اُس جنم میں بھکاری تھا۔"

پشپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا: "میری دیورانی بے چاری گہنے کپڑے کو ترس جائے گی۔"

"میں اپنا بیاہ ہی نہ کروں گا۔"

"من میں تو منا رہے ہو گے کہیں سے سندیس آئے۔"

"نہیں بھابھی، تم سے جھوٹ نہیں کہتا۔ شادی کا تو مجھے خیال بھی نہیں آتا۔ زندگی اسی کے لیے ہے کہ کسی کے کام آئے۔ جہاں سیوکوں کی اتنی ضرورت ہے وہاں کچھ لوگوں کو تو کنوارے رہنا چاہیے۔ کبھی شادی کروں گا تو ایسی لڑکی سے جو میرے ساتھ غریبی کی زندگی بسر کرنے پر راضی ہو اور میرے جیون کی تپی، چتا میں ساتھ جلنے والی بنے۔"

پشپا نے اس عہد کو بھی ہنسی میں اُڑا دیا: "پہلے سبھی نوجوان اسی طرح کی آرزو کیا کرتے ہیں۔ لیکن شادی میں دیر ہوئی تو شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔"

سادھو کمار نے جوش کے ساتھ کہا: "میں ان نوجوانوں میں نہیں ہوں بھابھی۔"

پشپا نے پھر طنز کیا: "تمھارے من میں تو بی بی (پنکجا) بسی ہوئی ہے۔"

"تم سے کوئی بات کہو تو تم بنانے لگتی ہو، اسی سے میں تمھارے پاس نہیں آتا۔"

"اچھا سچ کہنا پنکجا جیسی بیوی پاؤ تو بیاہ کرو گے یا نہیں؟"

سادھو کمار اُٹھ کر چلا گیا۔ پشپا روکتی رہی پر وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا۔ اس اصول پرست، نرم دل، خوش مزاج شرمیلے نوجوان سے مل کر پشپا کا مرجھایا ہوا من کھل اُٹھتا تھا۔ وہ بھیتر سے جتنی بھاری تھی، باہر سے اتنی ہی ہلکی تھی۔ سنت کمار سے تو اسے اپنے حقوق کی ہر لمحے حفاظت کرنی پڑتی تھی، چوکنا رہنا پڑتا تھا کہ نہ جانے کب اس کا وار ہو جائے۔ شیویا سدا ہی اس پر راج کرنا چاہتی تھی اور ایک پل بھی نہ بھولتی تھی کہ وہ گھر کی مالکن ہے اور ہر ایک آدمی کو اس کا یہ حق تسلیم کرنا چاہیے۔ دیو کمار نے سارا بار سنت کمار پر ڈال کر حقیقت میں شیویا کی گدی چھین لی تھی وہ یہ بھول جاتی تھی کہ دیو کمار کے مالک ہونے تک ہی وہ گھر کی مالکن تھی۔ اب وہ نام کی دیوی تھی جو صرف اپنے آشیر وادوں کے بل پر ہی پج سکتی تھی۔ من کا یہ کھٹکا مٹانے کے

لیے وہ سدا اپنے حقوق کا امتحان لیتی رہتی تھی۔ یہ چور کسی بیماری کی طرح اس کے اندر جڑ پکڑ چکا تھا اور اصلی غذا کو نہ پچا سکنے کے کارن اس کی عادت چٹوری ہوتی جاتی تھی۔ پشپا ان سے بولتے ڈرتی تھی۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ رہی پنکجا، اسے کام کرنے کا مرض تھا۔ اس کا کام ہی اس کی کھیل تفریح سب کچھ تھا۔ شکایت کرنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ بالکل دیو کمار کی سی عادت پائی تھی۔ کوئی چار باتیں کہہ دے، سر جھکا کر سن لے گی۔ من میں کسی طرح کی نفرت یا ملال نہ آنے دی گی۔ سویرے سے دس گیارہ بجے رات تک اسے دم مارنے کی مہلت نہ تھی۔ اگر کسی کے کرتے کے بٹن ٹوٹ جاتے ہیں تو پنکجا ٹانکے گی۔ کسی کے کپڑے کہاں رکھے ہیں یہ راز پنکجا کے سوا اور کوئی نہ جانتا تھا۔ اور اتنا کام کرنے پر بھی وہ پڑھنے اور بیل بوٹے بنانے کے لیے وقت نہ جانے کیسے نکال لیتی تھی۔ گھر میں جتنے تکیے تھے سبوں پر پنکجا کی دست کاری کے نشان بنی ہوئے تھے۔ میزوں کے میز پوش، کرسیوں کے گدے، صندوقوں کے غلاف سب اس کے تخلیقی ہنر سے رنگین تھے۔ ریشم اور مخمل کے طرح طرح کے پرندوں اور پھولوں کے چتر بنا کر اس نے فریم بنا لیے تھے جو دیوان خانے کی شوبھا بڑھا رہے تھے اور اسے گانے بجانے کا شوق بھی تھا۔ ستار بجا لیتی تھی، اور ہارمونیم تو اس کے لیے کھیل تھا۔ ہاں کسی کے سامنے گاتے بجاتے شرماتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسکول بھی جاتی تھی اور اس کا شمار اچھی لڑکیوں میں تھا۔ ۱۵ روپے مہینہ اسے وظیفہ ملتا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ پشپا کے پاس گھڑی دو گھڑی کے لیے آ بیٹھے اور ہنسی مذاق کرے۔ اسے ہنسی مذاق آتا بھی نہ تھا۔ نہ مذاق سمجھتی تھی نہ اس کا جواب دیتی تھی۔ پشپا کو اپنی زندگی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سادھو ہی مل جاتا تھا۔ پتی نے تو الٹے اس پر اور اپنا بوجھ ہی لاد دیا تھا۔

سادھو چلا گیا تو پشپا پھر اسی خیال میں ڈوب گئی: کیسے اپنا بوجھ اٹھائے۔ اسی لیے تو پتی دیو اس پر یہ رعب جماتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اسے چاہے جتنا ستاؤ۔ کہیں جا نہیں سکتی، کچھ بول نہیں سکتی۔ ہاں ان کا خیال ٹھیک ہے۔ اسے بڑی چیزوں سے شوق ہے۔ وہ اچھا کھانا چاہتی ہے، آرام سے رہنا چاہتی ہے۔ ایک بار وہ عیش کی چاہ تیاگ دے اور تیاگ کرنا سیکھ لے، پھر اس پر کون رعب جما سکے گا، پھر وہ کیوں کسی سے دبے گی۔

شام ہو گئی تھی۔ پشپا کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا بیس پچیس لڑکیوں اور عورتوں کا ایک دل ہم آواز ہو کر گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔ کسی کے جسم پر ثابت کپڑے تک نہ تھے۔ سر اور منہ پر گرد جمی ہوئی تھی۔ بال روکھے ہو رہے تھے۔ جن میں شاید مہینوں سے تیل نہ پڑا ہو۔ یہ مزدورنیں تھیں جو دن بھر اینٹ اور گارا ڈھو کر لوٹ رہی تھیں۔

سارے دن انھیں دھوپ میں تپنا پڑا ہوگا، مالک کی گھڑکیاں اور گالیاں کھانی پڑی ہوں گی۔ شاید دوپہر کو ایک ایک مٹھی چبینا کھا کر رہ گئی ہوں پھر بھی کتنی خوش تھیں، کتنی آزاد۔ ان کی اس خوشی کا کیا راز ہے؟

مسٹر سنہا ان آدمیوں میں ہیں جن کی عزت اس لیے ہوتی ہے کہ لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر سبھی آدمی آیئے آیئے کرتے ہیں، لیکن ان کے پیٹھ پھیرتے ہی کہتے ہیں بڑا ہی موذی آدمی ہے۔ اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ ان کا پیشہ ہے مقدمے بنانا۔ جیسے شاعر ایک مفروضے پر پوری شاعری کر ڈالتے ہیں اسی طرح سنہا صاحب بھی مفروضے پر مقدموں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ نہ جانے یہ شاعر کیوں نہ ہوئے۔ مگر شاعر ہو کر وہ ادب کی چاہے جتنی توقیر کر سکتے، اپنا کچھ بھلا نہ کر سکتے۔ قانون کی پوجا کر کے انھیں سبھی ڈگریاں مل گئی تھیں۔ شاندار بنگلے میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں اور حکّام سے دوستانہ تھا، شہرت بھی تھی، رُعب بھی تھا، قلم میں ایسا جادو تھا کہ مقدمے میں جان ڈالتے۔ ایسے ایسے سوال سوچ نکالتے، ایسے ایسے قصوں کو استعمال میں لاتے کہ نقل اصل ہو جاتی تھی۔ بڑے بڑے گھاگ آدمی بھی اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکتے۔ سب کچھ اتنا ضروری اتنا مقدمے سے متعلق ہوتا تھا کہ اس پر جھوٹ کا گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔ وہ سنت کمار کے ساتھ کے پڑھے ہوئے تھے، دونوں میں گہری دوستی تھی۔ سنت کمار کے من میں ایک یاد اُٹھی اور سنہا نے اس میں رنگ روپ بھر کر جیتا جاگتا پتلا کھڑا کر دیا اور آج مقدمہ دائر کرنے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔

نو بجے ہوں گے۔ وکیل اور موکل کچہری جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سنہا اپنے سجے کمرے میں میز پر ٹانگ پھیلائے لیٹے ہوئے ہیں۔ گورے چٹے آدمی، اونچا قد، اکہرا بدن، بڑے بڑے بال پیچھے کو کنگھی کیے ہوئے، مونچھیں صاف، آنکھوں پر عینک، ہونٹوں پر سگار، چہرے پر غرور کی چمک، آنکھوں میں تکبر، ایسا جان پڑتا ہے کوئی بڑا رئیس ہے۔ سنت کمار نیچی اچکن پہنے، فیلٹ کیپ لگائے، کچھ فکر مند سے بیٹھے ہیں۔

سنہا نے یقین دلایا: ''تم ناحق ڈرتے ہو۔ میں کہتا ہوں تمھاری فتح ہے۔ ایسی سینکڑوں نظیریں موجود ہیں جس میں بیٹوں پوتوں نے بیع نامے منسوخ کرائے ہیں۔ پکّی شہادت چاہیے اور اسے جمع کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

سنت کمار نے کشمکش میں پڑ کر کہا: ''لیکن فادر کو بھی تو راضی کرنا ہوگا۔ ان کی مرضی کے بنا تو کچھ نہ ہو سکے گا۔''

''انھیں سیدھا کرنا تمھارا کام ہے۔''

''لیکن ان کا سیدھا ہونا مشکل ہے۔''

''تو انھیں بھی گولی مارو۔ ہم ثابت کریں گے کہ ان کے دماغ میں خلل ہے۔''

''یہ ثابت کرنا آسان نہیں ہے، جس نے بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالیں، جو سوسائٹی کے سوشل طبقے کا لیڈر سمجھا جاتا ہے، جس کی عقل مندی کو سارا شہر مانتا ہے، اسے دیوانہ کیسے ثابت کرو گے؟''

سنہا نے مکمل یقین کے انداز سے کہا: ''یہ سب میں دیکھ لوں گا۔ کتاب لکھنا اور بات ہے ہوش حواس کو ٹھیک رکھنا اور بات۔ میں تو کہتا ہوں جتنے لکھنے والے ہیں سب ہی سنکی ہیں۔ پورے پاگل جو محض واہ واہ کے لیے یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے ہوش میں ہوں تو کتابیں نہ لکھیں دلالی کریں یا خونچے لگائیں۔ یہاں کچھ تو محنت کا معاوضہ ملے گا۔ کتابیں لکھ کر تو بدہضمی، بے خوابی، تپ دق ہی ہاتھ لگتا ہے۔ روپے کا جگاڑ تم کرتے جاؤ، باقی سارا کام مجھ پر چھوڑ دو۔ اور ہاں، آج شام کو کلب میں ضرور آنا ابھی سے کیمپین شروع کر دینا چاہیے۔ تنّی پر ڈورے ڈالنا شروع کرو۔ یہ سمجھ لو وہ سب جج صاحب کی اکیلی لڑکی ہے اور اس پر اپنا رنگ جما دو تو تمھاری گوٹی لال ہے۔ سب جج صاحب تنّی کی بات کبھی نہیں ٹال سکتے۔ میں یہ مرحلہ سر کرنے میں تم سے زیادہ ماہر ہوں۔ مگر میں ایک خون کے معاملے میں پیروی کر رہا ہوں اور سول سرجن مسٹر کات کی وہ پیلے منہ والی چھوکری آج کل میری عاشق ہے۔ سول سرجن میری اتنی آؤ بھگت کرتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔ اس چڑیل سے شادی کرنے پر آج تک کوئی راضی نہ ہوا۔ اتنے موٹے ہونٹ ہیں اور سینہ تو جیسے جھکا ہوا سائبان ہو۔ پھر بھی آپ کو دعویٰ ہے کہ مجھ سے زیادہ روپ وتی سنسار میں نہ ہوگی۔ عورتوں کو اپنے روپ کا گھمنڈ کیسے ہو جاتا ہے، یہ میں آج تک نہ سمجھ سکا۔ جو روپ دان ہیں وہ گھمنڈ کریں تو واجب ہے۔ لیکن جس کی صورت دیکھ کر قے آئے، وہ کیسے اپنے کو اپسرا سمجھ لیتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے گھومتے اور عاشقی کرتے جی تو جلتا ہے، مگر گہری رقم ہاتھ لگنے والی ہے۔ کچھ تپسیا تو کرنی ہی پڑے گی۔ تنّی تو سچ مچ اپسرا ہے اور چنچل بھی۔ ذرا مشکل سے قابو میں آئے گی۔ اپنی ساری کلا خرچ کرنی پڑے گی۔''

''یہ کلا میں خوب سیکھ چکا ہوں۔''

''تو آج شام کو آنا کلب میں۔''

''ضرور آؤں گا۔''

''روپے کا انتظام بھی کرنا۔''

''وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

اس طرح سنت کمار اور سنہا دونوں نے محاصرہ ڈالنا شروع کیا۔ سنت کمار نہ عیاش تھا نہ رسیا مگر سوانگ کرنا جانتا تھا۔ روپ وان بھی تھا، زبان کا میٹھا بھی، دہرا جسم، ہنس مکھ اور ذہین چہرہ، گورا چٹا۔ جب سوٹ پہن کر چھڑی گھماتا ہوا نکلتا تو آنکھوں میں کھب جاتا تھا۔ ٹینس برج وغیرہ فیشن ایبل کھیلوں میں ماہر تھا ہی، تتی سے راہ و رسم پیدا کرنے میں اسے دیر نہ لگی۔ تتی یونیورسٹی کے پہلے سال میں تھی۔ بہت ہی تیز، بہت ہی مغرور، بڑی حاضر جواب۔ اسے اپنی پڑھائی پڑھنے کا شوق نہ تھا، بہت تھوڑا پڑھتی تھی، مگر سنسار کی حالت سے واقف تھی، اور اپنی سطحی جانکاری کو علم کا روپ دینا جانتی تھی۔ کوئی موضوع اٹھایئے، چاہے وہ ڈرا دینے والی سائنس ہی کیوں نہ ہو، اس پر بھی وہ کچھ نہ کچھ نکتہ چینی کر سکتی تھی، بات کہنے کا اسے شوق تھا اور موزوں زبان میں۔ مزاج میں نفاست اتنی تھی کہ سلیقے یا تمیز کی ذرا بھی کمی اسے برداشت نہ تھی۔ اس کے یہاں کوئی نوکر یا نوکرانی نہ ٹھہرنے پاتی تھی۔ دوسروں پر کڑی تنقید کرنے میں اسے آنند آتا تھا۔ اور اس کی نگاہ اتنی تیز تھی کہ کسی عورت یا مرد میں ذرا بھی گری ہوئی خواہش یا بھونڈا پن دیکھ کر وہ بھنوؤں سے یا ہونٹوں سے اپنا احساس ظاہر کر دیتی تھی۔ عورتوں کی سوسائٹی میں اس کی نگاہ ان کے کپڑوں اور سنگار پر رہتی تھی اور مردوں کی سوسائٹی میں ان کی ذہنی اُڑان کی طرف۔ اسے اپنے بے مثال روپ رنگ کا علم تھا اور وہ اچھے سے پہناوے سے اسے اور بھی چمکاتی تھی۔ زیوروں سے اسے خاص دلچسپی نہ تھی گو اپنے سنگار دان میں انھیں چمکتے دیکھ کر اسے خوشی ہوتی تھی۔ دن میں کتنی بار وہ نئے نئے روپ دھارتی تھی۔ کبھی بیتالیوں کا بھیس دھارن کر لیتی تھی، کبھی گجریوں کا، کبھی اسکرٹ اور موزے پہن لیتی تھی۔ مگر اس کے من میں مردوں کو رجھانے کا ذرا بھی بھاؤ نہ تھا، وہ خود اپنے روپ میں مگن تھی۔

مگر اس کے ساتھ ہی وہ سیدھی نہ تھی اور جوانوں کے منہ سے جذبات بھری باتیں سن کر وہ ویسی ہی ٹھنڈی رہتی تھی۔ اس بیوپار میں عام طور پر روپ کی تعریف کے سوا اس کے لیے اور کوئی بڑائی نہ تھی، اور جوان کسی طرح کی حوصلہ افزائی نہ پا کر نا اُمید ہو جاتے تھے مگر سنت کمار کی جذباتیت میں اسے اندر کی دنیا سے شناسائی کی وجہ سے کچھ بھید کچھ بھلائی کی جھلک ملی۔ دوسرے جوانوں میں اس نے خود کو قابو میں رکھنے کا فقدان، اپنے کو مقدم رکھنا، اور جو اضطراب دیکھا تھا اس کا یہاں نام بھی نہ تھا۔ سنت کمار کے ہر کام میں رکھ رکھاؤ تھا، طور طریقہ تھا، چوکسی تھی۔ اس لیے وہ ان سے محتاط رہتی تھی اور ان کے دل کے بھیدوں کو پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔

سنت کمار کا محتاط پن اور دوسروں کا لحاظ رکھنا ہی اسے اپنی فطرت کی پیچیدگی کی وجہ سے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ سنت کمار نے اس کے سامنے اپنے کوان میل بیاہ کے ایک شکار کے روپ میں پیش کیا تھا اور اسے ان سے کچھ ہمدردی ہو گئی تھی۔ پشپا کے رنگ روپ کی انھوں نے اتنی تعریف کی تھی جتنی ان کو اپنے مطلب کے لیے ضروری معلوم ہوئی مگر جس کا تنی سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے صرف پشپا کے پھوہڑپن، بے وقوفی، دل سے عاری ہونے اور لہجے کی کرختگی کی شکایت کی تھی اور تنی پر اتنا اثر جما لیا تھا کہ وہ پشپا کو دیکھ پاتی تو سنت کمار کی طرف داری لے کر اس سے لڑتی۔

ایک دن اس نے سنت کمار سے کہا: ''تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

سنت کمار نے حسرت سے کہا: ''چھوڑ کیسے دوں مس ترویدی، سماج میں رہ کر سماج کے قانون تو ماننے ہی پڑیں گے۔ پھر پشپا کا اس میں کیا قصور ہے۔ اس نے تو اپنے آپ کو نہیں بنایا۔ ایشور نے یا رسم ورواج نے یا حالات نے جیسا بنایا ویسی بن گئی۔''

''مجھے ایسے آدمیوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں جو ڈھول کو اس لیے پیٹیں کہ وہ گلے پڑ گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ڈھول کو گلے سے نکال کر کسی خندق میں پھینک دیں۔ میرا بس چلے تو میں خود اسے نکال کر پھینک دوں۔''

سنت کمار نے اپنا جادو چلتے ہوئے دیکھ کر دل میں خوش ہو کر کہا: ''لیکن اس کی کیا حالت ہو گی، یہ تو سوچو۔''

تنی بے صبر ہو کر بولی: ''تمھیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اپنے گھر چلی جائے گی، یا کوئی کام کرنے لگے گی یا اپنے مزاج کے کسی آدمی سے بیاہ کر لے گی۔''

سنت کمار نے قہقہہ مارا..... تنی حقیقت اور تصنع میں فرق بھی نہیں سمجھتی، کتنی بھولی ہے۔

گہری عزت کے انداز سے بولے ''یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے کماری جی۔ سماج کا اصول اخلاق کہتا ہے کہ چاہے پشپا کو دیکھ کر روز میرا خون ہی کیوں نہ جلتا رہے اور ایک دن میں اسی صدمے میں اپنا گلا کیوں نہ کاٹ لوں لیکن اس سے کچھ نہیں ہو سکتا، چھوڑنا تو ناممکن ہے۔ صرف ایک ہی ایسا اعتراض ہے جس پر میں اسے چھوڑ سکتا ہوں، یعنی اس کی بے وفائی۔ لیکن پشپا میں اور چاہے جتنے عیب ہوں یہ عیب نہیں ہے۔''

شام ہو گئی تھی۔ تنی نے نوکر کو بلا کر باغ میں گول چبوترے پر کرسیاں رکھنے کو کہا اور باہر نکل آئی۔ نوکر نے کرسیاں نکال کر رکھ دیں اور جیسے یہ کام ختم کر کے جانے کو ہوا۔

تپّی نے ڈانٹ کر کہا: ''کرسیاں صاف کیوں نہیں کیں؟ دیکھتے نہیں ان پر کتنی گرد پڑی ہے؟ میں تجھ سے کتنی بار کہہ چکی۔ تجھے یاد ہی نہیں رہتا۔ بنا جرمانہ کیے تجھے یاد نہ آئے گی۔''

نوکر نے کرسیاں پونچھ پونچھ کر صاف کردیں اور پھر جانے کو ہوا۔

تپّی نے پھر ڈانٹا: ''تو بار بار بھاگتا کیوں ہے۔ میزیں رکھ دیں؟ ٹی ٹیبل کیوں نہیں لایا؟ چائے کیا تیرے سر پر پئیں گے؟'' اس نے بوڑھے نوکر کے دونوں کان گرما دیے اور دھکا دے کر بولی: ''بالکل گاؤدی ہے، نرا اونگا، جیسے دماغ میں گوبر بھرا ہوا ہے۔''

بوڑھا نوکر بہت دنوں کا تھا۔ مالکہ اسے بہت مانتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد گو کہ اسے کوئی خاص لالچ نہ تھا کیونکہ اس سے ایک دو روپیہ زیادہ تنخواہ پر اسے نوکری مل سکتی تھی پر مالکہ سے اسے جو عقیدت تھی وہ اسے اس گھر میں روکے ہوئے تھی اور یہاں بے عزتی اور ذلت سب کچھ سہہ کر بھی وہ چپٹا ہوا تھا۔ سب جج صاحب اسے ڈانٹتے رہتے تھے پر ان کے ڈانٹنے کا اسے دکھ نہ ہوتا تھا۔ وہ عمر میں اس کی جوڑ کے تھے۔ لیکن تروینی کو تو اس نے گودیوں میں کھلایا تھا اب وہی تپّی اسے ڈانٹتی تھی، اور مارتی بھی تھی۔ اس سے اس کے جسم کو جتنی چوٹ لگتی تھی اس سے کہیں زیادہ اس کی خودداری کو دکھ پہنچتا تھا۔ اس نے صرف دو گھروں میں نوکری کی تھی، دونوں ہی گھروں میں لڑکیاں بھی تھیں، بہوئیں بھی تھیں۔ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ بہوئیں تو اس سے شرماتی تھیں۔ اگر اس سے کوئی بات بگڑ بھی جاتی تو من میں رکھ لیتی تھیں۔ اس کی مالکہ تو مثالی عورت تھی۔ اسے کبھی کچھ نہ کہا۔ بابو جی کبھی کچھ کہتے تھے تو اس کی طرف داری لے کر ان سے لڑتی تھی۔ اور یہ لڑکی بڑے چھوٹے کا ذرا خیال نہیں کرتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ پڑھنے سے عقل آتی ہے۔ یہی ہے وہ عقل! اس کے من میں بغاوت کا جذبہ اُٹھا۔ کیوں یہ بے عزتی سہے؟ جو لڑکی اس کی اپنی لڑکی سے بھی چھوٹی ہو، اس کے ہاتھوں کیوں اپنی مونچھیں نچوائے؟ بڑھاپے میں بھی غرور ہوتا ہے جو جمع ہو ہو کر حسن کے غرور سے کم نہیں ہوتا۔ وہ عزت اور وقار کو اپنا حق سمجھتا ہے اور اس کی جگہ بے عزتی پا کر دلی دشمن ہو جاتا ہے۔

گھورے نے ٹی ٹیبل لا کر رکھ دی پر آنکھوں میں بغاوت بھرے ہوئے تھا۔

تپّی نے کہا: ''جا کر بیرے سے کہہ دو، دو پیالے دے جائے۔''

گھورے چلا گیا اور بیرے کو وہ حکم سنا کر اپنی سونی کوٹھری میں جا کر خوب رویا۔ آج مالکن ہوتی تو اس کی بے عزتی کیوں ہوتی!

بیرے نے چائے میز پر رکھ دی۔ تپّی نے پیالی سنت کمار کو دی اور شوخ انداز سے بولی:

''تو اب معلوم ہوا کہ عورتیں ہی پتی ورتا نہیں ہوتیں، مرد بھی پتنی ورت والے ہوتے ہیں۔''

سنت کمار نے ایک گھونٹ پی کر کہا: ''کم سے کم اس کا سوانگ تو کرتے ہی ہیں۔''

''میں اسے اخلاقی کمزوری کہتی ہوں۔ جسے پیارا کہو دل سے پیارا کہو، نہیں ظاہر کر دو۔ میں بیاہ کو پریم بندھن کے روپ میں دیکھ سکتی ہوں، دھرم بندھن یا رواج بندھن تو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے۔''

''اس پر بھی تو مردوں پر حملے کیے جاتے ہیں۔''

تبی چونکی۔ یہ سوال جنس سے متعلق ہوتا جا رہا ہے۔

اب اسے اپنی ذات کا بچاؤ کرنا پڑے گا: ''تو کیا آپ مجھ سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ سب ہی مرد دیوتا ہوتے ہیں؟ آپ بھی جو وفاداری کر رہے ہیں وہ دل سے نہیں ہے، صرف بدنامی کے خوف سے ہے۔ میں اسے وفاداری نہیں کہتی۔ بچھو کا ڈنک توڑ کر آپ اسے بالکل بے اثر بنا سکتے ہیں، لیکن اس سے بچھوؤں کا زہریلا پن تو نہیں جاتا۔''

سنت کمار نے اپنی ہار مانتے ہوئے کہا: ''اگر میں بھی یہی کہوں کہ زیادہ تر عورتوں کا پتی ورت بھی بدنام کا خوف ہے تو آپ کیا کہیں گی؟''

تبی نے پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا: ''اسے بھی تسلیم نہ کروں گی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ مردوں نے عورتوں کے لیے اور کوئی پناہ گاہ چھوڑی ہی نہیں۔ پتی ورت ان کے اندر اتنا کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے کہ اب اپنی انفرادیت رہی ہی نہیں۔ وہ صرف مرد کے سہارے پر جی سکتی ہیں۔ اس کا اپنا کوئی آزاد جیون ہی نہیں رہا۔ بن بیاہا مرد چین سے کھاتا ہے، سیر سپاٹے کرتا ہے اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہے۔ بن بیاہی عورت روتی ہے، کلپتی ہے اور اپنے کو سنسار کی سب سے بدنصیب ہستی سمجھتی ہے۔ یہ سارا مردوں کا جرم ہے۔ آپ بھی پشپا کو نہیں چھوڑ رہے ہیں، اسی لیے نا کہ آپ مرد ہیں جو قیدی کو آزاد نہیں کرنا چاہتا۔''

سنت کمار نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا: ''آپ میرے ساتھ بے انصافی کرتی ہیں۔ میں پشپا کو اس لیے نہیں چھوڑ رہا ہوں کہ میں اس کی جوانی برباد نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں آج اسے چھوڑ دوں تو شاید اوروں کے ساتھ آپ بھی میری مذمت کریں گی۔''

تبی مسکرائی: ''میری طرف سے آپ بے فکر رہیے۔''

مگر ایک ہی چھن کے بعد اس نے جذبات کی گہرائی کے ساتھ کہا: ''لیکن میں آپ کی تکلیفوں کا اندازہ کر سکتی ہوں۔''

''مجھے آپ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کتنا اطمینان ہوا۔ میں حقیقت میں آپ کی ہمدردی

کا مستحق ہوں اور شاید کبھی مجھے اس کی ضرورت پڑے۔"

"آپ کے اوپر مجھے سچ مچ دیا آتی ہے۔ کیوں نہ ایک دن ان سے کسی طرح میری ملاقات کرا دیجیے شاید میں انھیں راستے پر لا سکوں۔"

سنت کمار نے ایسا لمبا منہ بنایا جیسے اس تجویز سے اس کے دل پر چوٹ لگی ہے۔

"اس کا راستے پر آنا ناممکن ہے مس ترونی۔ وہ الٹے آپ ہی کے اوپر حملہ کرے گی اور آپ کے بارے میں نہ جانے کیسی غلط قیاس آرائیاں کر بیٹھے گی۔ اور میرا تو گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

تبھی کا نڈر من گرم ہو اٹھا: "تب تو میں اس سے ضرور ملوں گی۔"

"تو شاید آپ یہاں بھی میرے لیے دروازہ بند کر دیں گی۔"

"ایسا کیوں؟"

"بہت ممکن ہے وہ آپ کی ہمدردی پا جائے اور آپ اس کی حمایت کرنے لگیں۔"

"تو کیا آپ چاہتے ہیں میں آپ کو ایک طرفہ ڈگری دے دوں؟"

"میں صرف آپ کی دیا اور ہمدردی چاہتا ہوں۔ آپ سے اپنی دل کی دکھن کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اسے معلوم ہو جائے کہ میں آپ کے یہاں آتا جاتا ہوں تو ایک نیا قضیہ کھڑا کر دے۔"

تبھی نے سیدھے طعن کیا: "تو آپ اس سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ ڈرنا تو مجھے چاہیے۔"

سنت کمار نے گہرائی میں جا کر کہا: "میں آپ کے لیے ڈرتا ہوں، اپنے لیے نہیں۔"

تبھی بے خوفی سے بولی: "جی نہیں، آپ میرے لیے نہ ڈریے۔"

"میرے جیتے جی، میرے پیچھے آپ پر کوئی شبہ ہو یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"آپ کو معلوم ہے مجھے جذباتیت پسند نہیں؟"

"یہ جذباتیت نہیں، دل کے سچے جذبات ہیں۔"

"میں نے سچے جذبات والے جوان بہت کم دیکھے۔"

"دنیا میں سب ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔"

"زیادہ تر شکاری قسم کے۔ عورتوں میں تو ویشیائیں ہی شکاری ہوتی ہیں مردوں میں تو سرے سے سب ہی شکاری ہوتے ہیں۔"

"جی نہیں ان میں بدنام بھی بہت ہیں۔"

"عورت روپ نہیں دیکھتی۔ مرد جب گرے گا روپ پر۔ اسی لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا

جاسکتا۔ میرے یہاں کتنے ہی روپ کے پجاری آتے ہیں۔ شاید اس وقت بھی کوئی صاحب آرہے ہیں۔ میں روپ وتی ہوں اس میں عاجزی کا کوئی سوال نہیں۔ مگر میں نہیں چاہتی کوئی مجھے صرف روپ کے لیے چاہے۔"

سنت کمار نے دھڑ کتے ہوئے دل سے کہا: "آپ ان میں میرا تو شمار نہیں کرتیں؟"

تپی نے مہارت کے ساتھ کہا: "آپ کو تو میں اپنے چاہنے والوں میں سمجھتی ہی نہیں۔"

سنت کمار نے ماتھا جھکا کر کہا" یہ میری بدقسمتی ہے۔"

"آپ دل سے نہیں کہہ رہے ہیں، مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ میں آپ کا من نہیں پائی۔ آپ ان آدمیوں میں ہیں جو ہمیشہ ایک بھید رہتے ہیں۔"

"یہی تو میں آپ کے بارے میں سوچا کرتا ہوں۔"

"میں بھید نہیں ہوں۔ میں تو صاف کہتی ہوں، میں ایسے مرد کی کھوج میں ہوں جو میرے دل میں سوئے ہوئے پیار کو جگادے۔ ہاں، وہ بہت نیچے گہرائی میں ہے، اور اسی کو ملے گا جو گہرے پانی میں ڈوبنا جانتا ہو۔ آپ میں میں نے کبھی اس کے لیے بے چینی نہیں پائی۔ میں نے اب تک زندگی کا روشن پہلو ہی دیکھا ہے اور اس سے اُکتا گئی ہوں۔ اب زندگی کا اندھیرا پہلو دیکھنا چاہتی ہوں، جہاں تیاگ ہے، رونا ہے، سپردگی ہے۔ ممکن ہے ایسے جیون سے بہت جلد بے زاری ہو جائے، لیکن میری روح یہ نہیں تسلیم کرنا چاہتی کہ وہ کسی اونچے عہدے کی غلامی یا قانونی دھوکے دھڑے یا بیوپار کے نام سے کی جانے والی لوٹ کو اپنی زندگی کا سہارا بنائے۔ شرم اور تیاگ کا جیون ہی مجھے سچ جان پڑتا ہے۔ آج جو سماج اور دیش کی بگڑی ہوئی حالت ہے اس سے نباہ کرنا میرے لیے جنون سے کم نہیں ہے۔ میں کبھی کبھی اپنے ہی سے نفرت کرنے لگتی ہوں۔ بابوجی کو ایک ہزار روپے اپنے چھوٹے سے خاندان کے لیے لینے کا کیا حق ہے اور بے کام دھندے اتنے آرام سے رہنے کا کیا ادھیکار ہے؟ مگر سب سمجھ کر بھی مجھ میں کام کرنے کی طاقت نہیں۔ اس عیش و عشرت کی زندگی نے مجھے بھی نکما بنا ڈالا ہے۔ اور میرے مزاج میں امیری کتنی ہے یہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ میرے منہ سے بات نکلتے ہی اگر پوری نہ ہو جائے تو میں باؤلی ہو جاتی ہوں، عقل کا دل پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ جیسے شرابی بار بار کہنے پر شراب نہیں چھوڑ سکتا وہی حالت میری ہے۔ اسی کی طرح میری قوتِ ارادی بے جان ہوگئی ہے۔"

تپی کے فکرمند چہرے پر زیادہ تر چنچل پن جھلکتا رہتا تھا۔ اس سے دل کی بات کہتے لحاظ ہوتا تھا، کیونکہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ توجہ سے سننے کے بدلے پھبتیاں کسنے لگے گی۔ پر اس وقت ایسا

جان پڑا اس کی آتما بول رہی ہے۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ چہرے پر ایک بے پروا عاجزی اور تازگی کھل اٹھی تھی۔ سنت کمار نے دیکھا اس کا رکھ رکھاؤ پھسلتا جا رہا ہے۔ جیسے کسی سائل نے بہت دیر کے بعد داتا کو مائل بہ کرم دیکھ پایا ہو اور اپنا مطلب کہہ سنانے کے لیے بے چین ہو گیا ہو۔

بولا: ''کتنی ہی بار۔ بالکل یہی میرے خیالات ہیں۔ میں آپ سے اس سے بہت نزدیک ہوں، جتنا سمجھتا تھا۔''

تنی خوش ہو کر بولی: ''آپ نے مجھے کبھی بتایا نہیں۔''

''آپ بھی تو آج ہی کھلی ہیں۔''

''میں ڈرتی ہوں کہ لوگ یہی کہیں گے آپ اتنی شان سے رہتی ہیں، اور باتیں ایسی کرتی ہیں۔ اگر کوئی ایسی ترکیب ہوتی جس سے میری یہ امیرانہ عادتیں چھوٹ جاتیں تو میں اسے ضرور کام میں لاتی۔ اس موضوع پر آپ کے پاس کچھ کتابیں ہوں تو مجھے دیجیے۔ مجھے آپ اپنی شاگرد بنا لیجیے۔''

سنت کمار نے جذباتی لہجے میں کہا: ''میں تو آپ کا شاگرد ہونے جا رہا تھا'' اور اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ تنی نے آنکھیں نیچی نہیں کیں۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی: ''آپ تو دل لگی کرتے ہیں۔ مجھے ایسا بنا دیجیے کہ میں مشکلوں کا سامنا کر سکوں۔ مجھے بار بار یہ کھٹکتا ہے اگر میں عورت نہ ہوتی تو میرا دل اتنا کمزور نہ ہوتا'' اور جیسے وہ آج سنت کمار سے کچھ بھی چھپانا، کچھ بھی بچانا نہیں چاہتی۔ جیسے وہ جو سہارا بہت دنوں سے ڈھونڈھ رہی تھی یکا یک مل گیا ہے۔

سنت کمار نے روکھائی بھرے لہجے میں کہا: ''عورتیں مردوں سے زیادہ دلیر ہوتی ہیں مس تروینی!''

''اچھا آپ کا من نہیں چاہتا کہ بس ہو تو سنسار کی ساری قسمت بدل ڈالیں؟''

اس پاکیزہ دل سے نکلے ہوئے سوال کا بناوٹی جواب دیتے ہوئے سنت کمار کا دل کانپ اٹھا:

''کچھ نہ پوچھو۔ بس آدمی ایک آہ کھینچ کر رہ جاتا ہے۔''

''میں تو اکثر راتوں کو یہ سوال سوچتے سوچتے سو جاتی ہوں اور وہی سپنا دیکھتی ہوں۔ دیکھیے دنیا والے کتنے خودغرض ہیں۔ جس کوشش سے سارے سماج کی نجات ہو سکتی ہے وہ تھوڑے سے آدمیوں کے مفاد کی وجہ سے دبی پڑی ہوئی ہے۔''

سنت کمار نے اترے ہوئے چہرے سے کہا: ''اس کا وقت آرہا ہے'' اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں کی ہوا میں ان کا دم جیسے گھٹنے لگا تھا۔ ان کا کپٹی من اس بے کپٹ، سادے ماحول میں اپنی کمینگی کی آگاہی سے دبا جارہا تھا جیسے کسی دھرم کے پکّے من میں غیر مذہبی خیال گھس تو گیا ہو پر وہ کوئی پناہ گاہ نہ پا رہا ہو۔

تنی نے اصرار کیا: ''کچھ دیر اور بیٹھئے نا؟''

''آج اجازت دیجیے، پھر کبھی آؤں گا۔''

''کب آیئے گا؟''

''جلدی ہی آؤں گا۔''

''کاش میں آپ کا جیون سکھی بنا سکتی۔''

سنت کمار برآمدے سے کود کر نیچے اُترے اور تیزی سے احاطے کے باہر چلے گئے۔ تنی برآمدے میں کھڑی انھیں چاہ بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ کٹھور تھی، چنچل تھی، انوکھی تھی حسن پر مغرور تھی، عقلمند تھی، کسی کو کچھ سمجھتی نہ تھی، نہ کوئی اس سے پریم کا ڈھونگ رچا کر جیت سکتا تھا، پر جیسے کتنی ہی ویشیاؤں میں ساری لگاوٹوں کے بیچ بیچ میں عقیدت مندی چھپی رہتی ہے، اسی طرح اس کے من میں بھی ساری بے یقینی کے بیچ بیچ میں ایک نازک، سہما ہوا یقین چھپا بیٹھا تھا اور اسے چھو لینے کا فن جسے آتا ہو وہ اسے بیوقوف بنا سکتا تھا۔ اس نازک حصّے کے چھوتے ہی وہ سیدھی سادی، مخلص، اعتبار کر لینے والی، سہم جانے والی بچّی بن جاتی تھی۔ آج اتفاق سے سنت کمار نے وہ نازک حصہ پالیا تھا اور اب جس طرح چاہے اسے لے جا سکتا ہے، مانو وہ مسمرائزڈ ہو۔

اب سنت کمار میں اسے کوئی قصور نہیں نظر آتا تھا۔ بدنصیب پشپا اس بچے مرد کا جیون کیسا برباد کیے ڈالتی ہے۔ انھیں تو ایسی ساتھی چاہیے جو انھیں حوصلہ دے، ہمیشہ ان کے پیچھے پیچھے رہے۔ پشپا نہیں جانتی، وہ ان کا جیون گھٹا کر سماج کا کتنا نقصان کر رہی ہے۔ اور اتنے پر بھی سنت کمار کا اسے گلے باندھے رکھنا دیوتا پن سے کم نہیں۔ ان کی وہ کونسی سیوا کرے، کیسے ان کا جیون سکھی کرے!

سنت کمار یہاں سے چلے تو ان کا دل آسمان میں تھا۔ اتنی جلدی دیوی سے انھیں بردان ملے گا اس کی انھوں نے اُمید نہ کی تھی۔ کچھ تقدیر نے بھی زور مارا، نہیں تو جولڑکی اچھے اچھوں کو انگلیوں پر نچاتی ہے، ان سے کیوں اتنی عقیدت کا اظہار کرتی۔ اب انھیں تاخیر نہ کرنا چاہیے

کون جانے کب مخالف ہو جائے۔ اور یہ دو ہی چار ملاقاتوں میں ہونے والا ہے۔ تبھی انھیں میدانِ عمل میں آگے بڑھنے کی ترغیب دے گی اور وہ پیچھے ہٹیں گے، وہیں بھید کھل جائے گا۔ یہاں سے وہ سیدھے مسٹر سنہا کے گھر پہنچے۔ شام ہو گئی تھی، کہرا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ سنہا بجے سجائے کہیں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"کدھر سے؟"

"وہیں سے، آج تو رنگ جم گیا۔"

"سچ!"

"ہاں جی، اس پر تو جیسے میں نے جادو کی لکڑی پھیر دی ہو۔"

"پھر کیا بازی ماری ہے۔ اپنے فادر سے آج ہی ذکر چھیڑو۔"

"آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"ہاں، ہاں میں تو چلوں گا ہی، مگر تم تو بڑے خوش نصیب نکلے۔ یہ حسن کا بت تو مجھ سے سچ مچ عاشقی کرنا چاہتی ہے۔ میں تو سوانگ رچاتا ہوں اور وہ سمجھتی ہے، میں اس کا سچا پریمی ہوں، ذرا آج کل اسے دیکھو، مارے غرور کے زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتی۔ مگر ایک بات ہے عورت سمجھ دار ہے۔ اسے برابر یہ فکر رہتی ہے میں اس کے ہاتھ سے نہ نکل جاؤں۔ اسی لیے میری بڑی خاطر داری کرتی ہے، اور بناؤ سنگار سے قدرت کی کمی جتنی پوری ہو سکتی ہے، اتنی کرتی ہے۔ اور اگر کوئی اچھی رقم مل جائے تو شادی کر لینے ہی میں کیا ہرج ہے۔"

سنت کمار کو تعجب ہوا: "تم تو اس کی صورت سے بیزار تھے۔"

"ہاں اب بھی ہوں لیکن روپے کی جو شرط ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۲۰-۲۵ ہزار میری نذر کر دیں، شادی کر لوں۔ شادی کر لینے سے میں اس کے ہاتھ بکا تو نہیں جاتا۔"

دوسرے دن دونوں دوستوں نے دیو کمار کے سامنے سارے منصوبے رکھ دیے۔ دیو کمار کو ایک لمحے کو تو اپنے کانوں پر یقین نہ ہوا۔ انھوں نے با قناعت، بے طلب، دھوکے فریب سے عاری زندگی بسر کی تھی۔ فنکاروں میں ایک طرح کی جو خود فریبی ہوتی ہے اس نے سدا ہی ان کو ڈھارس دیا تھا۔ انھوں نے تکلیفیں اٹھائی تھیں، فاقے بھی کیے تھے، بے عزتیاں بھی سہی تھیں لیکن کبھی اپنی روح کو گدلا نہ کیا تھا۔ زندگی میں کبھی عدالت کے دروازے تک بھی نہیں گئے۔ بولے: "مجھے دکھ ہوتا ہے کہ تم مجھ سے یہ امید کیسے کر سکے۔ اور اس سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ ایسی گمراہ کن چال تمھارے من میں آئی کیونکر۔"

سنت کمار نے بے شرم انداز سے کہا: "ضرورت سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ حفاظت فطرت

کا پہلا قانون ہے۔ وہ جائداد جو آپ نے بیس ہزار میں دے دی، آج دو لاکھ سے کم کی نہیں ہے۔"

"وہ دو لاکھ کی نہیں، دس لاکھ کی ہو۔ میرے لیے وہ آتما کو بیچنے کا سوال ہے۔ میں تھوڑے سے روپے کے لیے اپنی آتما نہیں بیچ سکتا۔"

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ کتنی پرانی دلیل ہے۔ اور کتنی لچر۔ آتما جیسی چیز ہے کہاں؟ اور جب سارا سنسار دھوکے دھڑی پر چل رہا ہے تو آتما کہاں رہی؟ اگر سو روپے قرض دے کر ایک ہزار وصول کرنا بے ایمانی نہیں ہے، اگر ایک لاکھ نیم جان، فاقہ کش مزدوروں کی کمائی پر ایک سیٹھ کا چین کرنا بے ایمانی نہیں ہے تو ایک پرانی کاغذی کارروائی کو منسوخ کرانے کی کوشش کیوں بے ایمانی ہو؟

سنت کمار نے تیکھے انداز میں کہا: "اگر آپ اسے آتما کا بیچنا کہتے ہیں تو بیچنی پڑے گی۔ اس کے سوا دوسرا چارہ نہیں ہے۔ اور آپ اس نظر سے اس معاملے کو دیکھتے ہی کیوں ہیں؟ ایمان وہ ہے جس سے سماج کا بھلا ہو۔ بے ایمانی وہ ہے جس سے سماج کا نقصان ہو۔ اس سے سماج کا کون سا نقصان ہو جائے گا یہ آپ بتا سکتے ہیں؟"

دیو کمار نے چوکنا ہو کر کہا: "سماج اپنی روایات پر ٹکا ہوا ہے۔ روایات کو توڑ دو اور سماج کا خاتمہ ہو جائے گا۔" دونوں طرف سے دلیلیں ہونے لگیں۔ دیو کمار سماج کی روایات اور مسلمہ سچائیوں اور دھرم بندھنوں کی آڑ لے رہے تھے، پر ان دونوں نوجوانوں کی دلیلوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ وہ اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور گنجا سر کھجا کھجا کر جو مثال دیتے تھے اس کو یہ دونوں جوان چٹکی بجاتے رد کر دیتے تھے، دھنک کر اُڑا دیتے تھے۔

سنہا نے بے رحمی کے ساتھ کہا: "بابوجی، آپ نہ جانے کس زمانے کی باتیں کر رہے ہیں قانون سے ہم جتنا فائدہ اُٹھا سکیں، ہمیں اُٹھانا چاہیے۔ ان دفعوں کا منشا ہی یہ ہے کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ابھی آپ نے دیکھا زمیں داروں کی جان مہاجنوں سے بچانے کے لیے سرکار نے قانون بنا دیا ہے اور کتنی ملکیتیں زمیں داروں کو واپس مل گئیں۔ کیا آپ اسے بے ایمانی کہیں گے؟ عملی کاروبار کا مطلب یہی ہے کہ ہم ان قانونی ہتھکنڈوں سے اپنا کام نکالیں۔ مجھے لینا دینا نہیں، نہ میری کوئی اپنی غرض ہے، سنت کمار میرے دوست ہیں اور اسی واسطے میں آپ سے یہ استدعا کر رہا ہوں۔ مانیں نہ مانیں، آپ کو اختیار ہے۔"

دیو کمار نے لاچار ہو کر کہا: "تو آخر تم لوگ مجھے کیا کرنے کو کہتے ہو؟"

"کچھ نہیں، صرف اتنا ہی کہ ہم جو کچھ کریں آپ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ

کریں۔"

"میں بچ کی بتیا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

سنت کمار نے آنکھیں نکال کر مجبور کرنے والے لہجے میں کہا: "تو پھر آپ کو میری ہتیا دیکھنی پڑے گی۔"

سنہا نے سنت کمار کو ڈانٹا: "کیا فضول کی باتیں کرتے ہو سنت کمار۔ بابو جی کو دو چار دن سوچنے کا موقع دو۔ تم ابھی کسی بچے کے باپ نہیں ہو۔ تم کیا جانو باپ کو بیٹا کتنا پیارا ہوتا ہے۔ وہ ابھی کتنی ہی رکاوٹ ڈالیں، لیکن جب نالش دائر ہو جائے گی تو دیکھنا وہ کیا کرتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ یہی ہوگا کہ جس وقت آپ نے یہ بیع نامہ لکھا، آپ کے ہوش و حواس ٹھیک نہ تھے اور اب بھی آپ کو کبھی کبھی جنون کا دورہ ہو جاتا ہے۔ ہندستان جیسے گرم ملک میں یہ مرض بہتوں کو ہوتا ہے اور آپ کو بھی ہو گیا تو کوئی تعجب نہیں۔ ہم سول سرجن سے اس کی تصدیق کرا دیں گے۔"

دیو کمار نے حقارت کے ساتھ کہا: "میرے جیتے جی یہ دھاندلی نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں میں نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر اور حالات کے دباؤ سے کیا۔ مجھے اس کا بالکل افسوس نہیں۔ اگر تم نے اس طرح کا کوئی دعویٰ کیا تو اس کی سب سے بڑی مخالفت میری طرف سے ہوگی، میں کہے دیتا ہوں۔"

اور وہ طیش میں آ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

سنت کمار نے بھی کھڑے ہو کر دھمکاتے ہوئے کہا: "تو میرا بھی آپ کو چیلنج ہے یا تو آپ اپنے دھرم ہی کی حفاظت کریں گے یا میری۔ آپ پھر میری صورت نہ دیکھیں گے۔"

"مجھے اپنا دھرم، بیوی اور بیٹے سب سے پیارا ہے۔"

سنہا نے سنت کمار کو حکم دیا: "تم آج درخواست دے دو کہ ان کے ہوش و حواس میں فرق آ گیا ہے اور معلوم نہیں یہ کیا کر بیٹھیں۔ آپ کو حراست میں لے لیا جائے۔"

دیو کمار نے مٹھی تان کر غصے کے جوش میں پوچھا: "میں پاگل ہوں؟"

"جی ہاں، آپ پاگل ہیں۔ آپ کے ہوش بجا نہیں ہیں۔ ایسی باتیں پاگل ہی کیا کرتے ہیں۔ پاگل وہی نہیں ہے جو کسی کو کاٹنے دوڑے۔ عام آدمی جو برتاؤ کرتے ہوں اس کے خلاف برتاؤ کرنا بھی پاگل پن ہے۔"

"تم دونوں خود پاگل ہو۔"

"اس کا فیصلہ تو ڈاکٹر کرے گا۔"

"میں نے بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں، ہزاروں لیکچر دے ڈالے، یہ پاگلوں کا کام ہے؟"

''جی ہاں، یہ چلتے سرپھروں کا کام ہے کل ہی آپ اس گھر میں رسیّوں سے باندھ لیے جائیں گے۔''

''تم میرے گھر سے نکل جاؤ نہیں تو میں گولی ماردوں گا۔''

''بالکل پاگلوں کی سی دھمکی۔ سنت کمار اس درخواست میں یہ بھی لکھ دینا کہ آپ کی بندوق چھین لی جائے ورنہ جان کا خطرہ ہے۔''

اور دونوں دوست اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دیوکمار کبھی قانون کے جال میں نہ پھنسے تھے۔ ناشروں اور کتب فروشوں نے انھیں بار بار دھوکے دیے مگر انھوں نے کبھی قانون کی پناہ نہ لی۔ ان کی زندگی کا اصول تھا۔ آپ بھلے تو جگ بھلا، اور انھوں نے ہمیشہ اس اصول کو نباہا تھا۔ مگر وہ دبّو یا ڈرپوک نہ تھے۔ خاص کر سچائی کے معاملے میں تو وہ سمجھوتا کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ وہ اس سازش میں کبھی شریک نہ ہوں گے چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ مگر کیا یہ سب سچ مچ انھیں پاگل ثابت کردیں گے؟ جس تیقّن سے سنہا نے دھمکی دی تھی وہ توجہ دینے کے لائق نہ تھا۔ ان کے لہجے سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کے داؤں پیچوں میں نڈر ہے، اور شاید ڈاکٹروں کو ملا کر سچ مچ انھیں سنکی ثابت کردے۔ ان کی خودداری گرج اُٹھی...... نہیں، وہ جھوٹ کی آڑ نہ لیں گے چاہے اس کے لیے کچھ بھی سہنا پڑے۔ ڈاکٹر بھی کیا اندھا ہے؟ ان سے کچھ پوچھے گا، کچھ بات چیت کرے گا یا یونہی قلم اُٹھا کر انھیں پاگل لکھ دے گا؟ مگر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان کے ہوش وحواس میں فتور پڑ گیا ہو۔ ہش۔ وہ بھی ان چھوکروں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ انھیں اپنے طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ ان کی عقل سورج کی روشنی کی مانند بے داغ ہے۔ کبھی نہیں۔ وہ ان لونڈوں کی دھونس میں نہ آئیں گے۔

لیکن یہ فکر اُن کے دل کو متھ رہی تھی کہ سنت کمار کا یہ ارادہ کیسے ہو گیا۔ انھیں اپنے باپ کی یاد آتی تھی۔ وہ کتنے بھلے، کتنے سچے تھے۔ ان کے سسر وکیل ضرور تھے پر کتنے دھرماتما آدمی تھے۔ اکیلے کماتے تھے اور سارے گھرانے کو پالتے تھے۔ پانچ بھائیوں اور ان کے بال بچوں کا بوجھ خوش اسلوبی سے سنبھالے ہوئے تھے۔ کیا مجال کہ اپنے بیٹوں بیٹیوں کے ساتھ انھوں نے کسی طرح کی طرف داری کی ہو۔ جب تک بڑے بھائی کو بھوجن نہ کرا لیں خود نہ کھاتے تھے۔ ایسے خاندان میں سنت کمار جیسا دغا باز کہاں سے آن گھسا؟ انھیں کبھی ایسی کوئی بات یاد نہ آتی تھی جب انھوں نے اپنی نیت بگاڑی ہو۔ لیکن یہ بدنامی کیسے سہی جائے گی۔ وہ اپنے ہی گھر میں جب بیداری نہ لا سکے تو ایک طرح سے ان کا سارا جیون برباد ہو گیا۔ جو لوگ ان کی بلاواسطہ قربت میں تھے، جب انھیں وہ آدمی نہ بنا سکے تو زندگی بھر کی ادبی خدمت سے کس کی

نجات ہوئی؟ اور جب یہ مقدمہ دائر ہوگا اس وقت وہ کیسے منہ دکھا سکیں گے؟ انھوں نے دولت نہ کمائی، پر شہرت کا انبار تو لگایا ہی۔ کیا وہ بھی ان کے ہاتھ سے چھن جائے گا۔ ان کو اپنی تسکین کے لیے اتنا بھی نہ ملے گا؟ ایسی خود آگہی انھیں کبھی نہ ہوئی تھی۔

شیویا سے کہہ کر وہ اسے بھی کیوں دکھی کریں۔ اس کے نازک دل کو کیوں چوٹ پہنچائیں؟ وہ سب کچھ خود جھیل لیں گے۔ اور دکھی ہونے کی بات بھی کیوں ہو؟ زندگی تو احساسات کا نام ہے۔ یہ بھی ایک احساس ہوگا۔ ذرا اس کی بھی سیر کرلیں۔

یہ خیال آتے ہی ان کا دل ہلکا ہوگیا۔ گھر میں جاکر پنکجا سے چائے بنانے کو کہا۔

شیویا نے پوچھا: ''سنت کمار کیا کہتا تھا۔''

انھوں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ''کچھ نہیں، وہی پرانا خبط''

''تم نے تو حامی نہیں بھری نا؟''

دیو کمار بیوی سے ہم آہنگی کا احساس بھر کر بولے: ''کبھی نہیں۔''

''نہ جانے اس کے سر یہ بھوت کیسے سوار ہوگیا!''

''یہ سوسائٹی کے خیالات ہیں اور کیا۔''

''اس کے خیالات کیوں ایسے ہوگئے؟ سادھو بھی تو ہے۔ پنکجا بھی تو ہے، دنیا میں کیا دھرم ہی نہیں؟''

''مگر کثرت ایسے ہی آدمیوں کی ہے، یہ سمجھ لو۔''

اس دن سے دیو کمار نے سیر کرنے جانا چھوڑ دیا۔ دن رات گھر میں منہ چھپائے بیٹھے رہتے۔ جیسے سارا کلنک ان کے ماتھے پر لگا ہو۔ شہر اور فصیل کے سب ہی باعزت صاحب فکر آدمیوں سے ان کا دوستانہ تھا۔ سب ان کی شرافت کی عزت کرتے تھے۔ جیسے وہ مقدمہ دائر ہونے پر بھی شاید کچھ نہ کہیں گے۔ لیکن ان کے اندر جیسے چور سا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی خود فریبی میں اپنے کو، اپنے کنبے والوں کا بھلائی برائی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ پچھلے دنوں جب سورج گرہن کے موقع پر سادھو کمار نے بڑھی ہوئی ندی میں کود کر ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی جان بچائی تھی، اس وقت انھیں اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی تھی جتنی خود ساری ناموری پانے سے ہوتی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے ان کا سر کچھ اونچا ہوگیا ہے، جیسے چہرے پر نور آگیا ہے۔ یہی لوگ جب سنت کمار کی دورنگی پر نکتہ چینی کریں گے تو وہ کیسے سنیں گے؟

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا اور سنت کمار نے مقدمہ دائر نہ کیا۔ ادھر سول سرجن کو گانٹھنا تھا، ادھر مس ملک کو شہادتیں بھی تیار کرنی تھیں۔ انھی تیاریوں میں سارا دن گزر جاتا تھا اور

روپے کا انتظام بھی کرنا تھا، دیوکمار تعاون کرتے تو یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہٹ جاتی۔ پر ان کی مزاحمت نے مسئلہ کو اور پیچیدہ کر دیا تھا۔ سنت کمار بھی کبھی نا اُمید ہو جاتا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کیا کرے۔ دونوں دوست دیوکمار پر دانت پیس پیس کر رہ جاتے۔

سنت کمار کہتا: ''جی چاہتا ہے انھیں گولی مار دوں۔ میں انھیں اپنا باپ نہیں دشمن سمجھتا ہوں۔''

سنہا سمجھاتا: ''میرے دل میں تو بھی ان کی عزت ہوتی ہے۔ اپنے مطلب کے لیے آدمی نیچے سے نیچا کام کر بیٹھتا ہے، پر تیاگیوں اور ایمان داروں کا احترام تو دل میں ہوتا ہی ہے۔ نہ جانے تمھیں ان پر کیسے غصہ آتا ہے۔ جو شخص سچائی کے لیے بڑی سے بڑی تکلیف سہنے کو تیار ہو وہ پوجنے کے لائق ہے۔''

''ایسی باتوں سے میرا جی نہ جلاؤ سنہا۔ تم چاہتے تو وہ حضرت اب تک پاگل خانے میں ہوتے۔ میں نہ جانتا تھا تم اتنے جذباتی ہو۔''

''انھیں پاگل خانے بھیجنا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ اور اس کی کوئی ضرورت بھی تو نہیں۔ ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جس وقت بیع نامہ ہوا وہ اپنے ہوش وحواس میں نہ تھے اس کے لیے شہادتوں کی ضرورت ہے۔ وہ اب بھی اسی حالت میں ہیں اسے ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر چاہیے اور مسٹر کامت بھی یہ لکھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔''

پنڈت دیوکمار کو دھمکیوں سے جھکانا تو ناممکن تھا مگر عقلی دلائل کے سامنے گردن آپ ہی آپ جھک جاتی تھی۔ ان دنوں وہ یہی پہیلی سوچتے رہتے تھے کہ دنیا کی یہ ناانصافی کی حالت کیوں ہے۔ تقدیر اور عمل کا فلسفہ لے کر وہ کہیں نہ پہنچ پاتے تھے۔ کل میں سمانے والی روح سے بھی ان کی گتھی نہ سلجھتی تھی۔ اگر سارا کل ایک روح ہے تو پھر یہ فرق کیوں ہے؟ کیوں ایک آدمی زندگی بھر بڑی سے بڑی محنت کر کے بھی بھوکوں مرتا ہے، اور دوسرا آدمی ہاتھ پاؤں نہ ہلانے پر بھی پھولوں کی سیج پر سوتا ہے۔ یہ سب میں سمانے والی آتما ہے یا محض خود اپنی عقل کو قابو میں نہ رکھنا؟ عقل جواب دیتی۔ یہاں سب ہی خودمختار ہیں، سب ہی کو اپنی طاقت اور تپسیا کے حساب سے ترقی کرنے کا موقع ہے۔ مگر بدگمانی پوچھتی: سب کو برابر کا موقع کہاں ہے؟ بازار لگا ہوا ہے۔ جو چاہے وہاں سے اپنی مرضی کی چیز خرید سکتا ہے۔ مگر خریدے گا تو وہی جس کے پاس پیسے ہیں۔ اور جب سب کے پاس پیسے نہیں ہیں تو سب کا برابر حق کیسے مانا جائے؟ اس طرح کا خود کو متھنا (ذہنی کشمکش) ان کے جیون میں کبھی نہ ہوا تھا۔ ان کی ادیب کی عقل ایسی تقسیم کی حالت سے مطمئن تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ پر ان کے سامنے ایسی کوئی گتھی نہ پڑی تھی جو

اس سوال کو صرف ایک خاتے تک لے جاتی۔ اس وقت ان کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو روز سڑک پر اینٹیں پڑی دیکھتا ہے اور بچا کر نکل جاتا ہے۔ رات میں کتنے لوگوں کو ٹھوکر لگتی ہوگی، کتنوں کے ہاتھ پیر ٹوٹتے ہوں گے، اس کا دھیان اسے نہیں آتا۔ مگر ایک دن جب وہ خود رات کو ٹھوکر کھا کر اپنے گھٹنے پھوڑ لیتا ہے تو اس کی مخالفت کرنے والی طاقت ضد کرنے لگتی ہے اور وہ اس سارے ڈھیر کو راہ سے ہٹانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ دیوکمار کو وہی ٹھوکر لگی تھی۔ کہاں ہے انصاف؟ کہاں؟ ایک غریب آدمی کسی کھیت سے بالیں نوچ کر کھا لیتا ہے، قانون اسے سزا دیتا ہے۔ دوسرا امیر آدمی دن دہاڑے دوسروں کو لوٹتا ہے اور اسے خطاب ملتا ہے، عزت ملتی ہے۔ کچھ آدمی طرح طرح سے ہتھیار باندھ کر آتے ہیں اور بے سہارا، طاقت سے عاری مزدوروں پر رعب جما کر اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ لگان اور ٹیکس اور محصول اور کتنے ہی ناموں سے اسے لوٹنا شروع کرتے ہیں اور آپ لمبا لمبا معاوضہ اُڑاتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں، ناچتے ہیں، رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ یہی ہے ایشور کا رچا ہوا سنسار؟ یہی انصاف ہے؟

ہاں، دیوتا ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشہ رہے ہیں۔ انھیں اب بھی دنیا مذہب اور انصاف پر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی قربانی دے کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن انھیں دیوتا کیوں کہو؟ بزدل کہو، خود اپنا پجاری کہو۔ دیوتا وہ ہے جو انصاف کی حفاظت کرے اور اس کے لیے جان دے دے۔ اگر وہ جان کر انجان بنتا ہے تو دھرم سے گرتا ہے اور اگر اس کی آنکھوں میں یہ ناانصافی کی حالت کھٹکتی ہی نہیں تو وہ اندھا بھی ہے اور مورکھ بھی، دیوتا کسی طرح نہیں۔ اور یہاں دیوتا بننے کی ضرورت بھی نہیں۔ دیوتاؤں نے ہی نصیب اور ایشور اور عقیدت کے توہم پھیلا کر اس بے انصافی کو امر بنایا ہے۔ انسان نے اب تک اس کا خاتمہ کر دیا ہوتا یا سماج کا ہی خاتمہ کر دیا ہوتا جو اس حالت میں زندہ رہنے سے کہیں اچھا ہوتا۔ نہیں۔ انسانوں میں انسان بننا پڑے گا۔ درندوں کے بیچ میں، ان سے لڑنے کے لیے ہتھیار باندھنا پڑے گا۔ ان کے پنجوں کا شکار بننا دیوتا پن نہیں، بے حسی ہے۔ آج جو اتنے تعلقے دار اور راجہ ہیں وہ اپنے پُرکھوں کی لوٹ کا ہی مزہ تو اُٹھا رہے ہیں۔ اور کیا انھوں نے وہ جائداد بیچ کر پاگل پن نہیں کیا؟ باپ دادوں کو پنڈا دینے کے لیے گیا جا کر پنڈا دینا (آٹے کی بڑی لگدی جو پُرکھوں کا جسم خیال کی جاتی ہے) اور یہاں آ کر ہزاروں روپے خرچ کرنا کیا ضروری تھا؟ اور راتوں کو دوستوں کے ساتھ مجرے سننا، اور ناٹک منڈلی کھول کر ہزاروں روپے اس میں ڈبونا کیا ضروری تھا؟ وہ یقیناً پاگل پن تھا۔ انھیں کیوں اپنے بال بچوں کی فکر نہیں ہوئی، اگر انھیں مفت کی دولت ملی اور انھوں نے اڑائی تو ان کے لڑکے کیوں نہ مفت کی دولت سے لطف اندوز

ہوں؟ اگر وہ جوانی کی اُمنگوں کو نہیں روک سکے تو ان کے لڑکے کیوں عبادت کریں؟
اور آخر میں ان کی تذبذب کی حالت کو اس خیال سے تسکین ہوئی کہ اس ناانصافی سے پُر دنیا میں ایمان اور بے ایمانی کی فکر غلط ہے۔ خودکشی ہے اور جو اکھیل کر یا دوسروں کی لالچ اور دلی تعلق سے فائدہ اُٹھا کر جائداد کھڑی کرنا اتنا ہی بُرا یا اچھا ہے جتنا قانونی داؤں پیچ سے۔ بے شک وہ مہاجن کے بیس ہزار کے قرض دار ہیں۔ ایمان داری کہتی ہے کہ اس جائداد کو بیچ کر اس کے بیس ہزار دے دیے جائیں۔ باقی انھیں مل جائے گا اگر قانون قرض داروں کے ساتھ اتنا انصاف بھی نہیں کرتا تو قرض دار بھی قانون میں جتنی کھینچ تان ہو سکے کر کے مہاجن سے اپنی جائداد واپس لینے کی سعی کرنے میں کسی بے ایمانی کا قصوروار نہیں ٹھہر سکتا۔ اس فیصلے پر انھوں نے شاستر اور اخلاقیات کے ہر ایک پہلو سے غور کیا اور وہ ان کے من میں جم گیا۔ اب کسی طرح نہیں ہل سکتا۔ اور گو اس سے ان کے پرانے خیالات کو ضرب لگتی تھی، پر وہ ایسے خوش اور پھولے ہوئے تھے جیسے انھیں کوئی نیا جیون منتر مل گیا ہو۔
ایک دن انھوں نے سیٹھ گردھاری داس کے پاس جا کر صاف صاف کہہ دیا: ''اگر آپ میری جائداد واپس نہ کریں گے تو میرے لڑکے آپ کے اوپر دعویٰ کریں گے۔''
گردھاری داس نئے زمانے کے آدمی تھے، انگریزی میں ماہر، قانون میں سمجھ دار راج کے کاموں میں حصہ لینے والے، کمپنیوں میں حصہ لیتے تھے اور بازار اچھا دیکھ کر بیچ دیتے تھے، ایک شکر کی مل خود چلاتے تھے۔ سارا کاروبار انگریزی ڈھنگ سے کرتے تھے۔ ان کے پتا سیٹھ مکولال بھی یہی سب کرتے تھے، پر پوجا پاٹ، دان دکشنا سے اُتارا کرتے رہتے تھے۔ گردھاری داس پکے اصول والے آدمی تھے، ہر ایک کام بیوپار کے قاعدے سے کرتے تھے کام کرنے والوں کی تنخواہ پہلی تاریخ کو دیتے تھے، مگر بیچ میں کسی کو ضرورت پڑے تو سود پر روپے دیتے تھے۔ مکولال جی سال، سال بھر تنخواہ نہ دیتے تھے، مگر کام کرنے والوں کو برابر پیشگی دیتے رہتے تھے۔ حساب ہونے پر ان کو کچھ دینے کے بدلے کچھ مل جاتا تھا۔ مکولال سال میں دو چار بار افسروں کو سلام کرنے جاتے تھے، ڈالیاں دیتے تھے، جوتے اُتار کر کمرے میں جاتے تھے اور ہاتھ باندھے رکھتے تھے۔ چلتے وقت آدمیوں کو دو چار روپے انعام دے آتے تھے گردھاری داس میونسپل کمشنر تھے، سوٹ بوٹ پہن کر افسروں کے پاس جاتے تھے اور برابری کا برتاؤ کرتے تھے، اور آدمیوں کے ساتھ صرف اتنی رعایت کرتے تھے کہ تیوہاری دے دیتے تھے، وہ بھی خوب خوشامد کرا کے۔ اپنے حقوق کے لیے لڑنا اور بھاگ دوڑ کرنا جانتے تھے، مگر انھیں ٹھگنا ناممکن تھا۔

وہ دیوکمار کا یہ اعلان سن کر چکرا گئے۔ ان کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں پڑھی تھیں اور ان کی تحریروں کا پورا سیٹ ان کے کتاب گھر میں تھا۔ ہندی زبان کے پریمی تھے اور ہندستانی بولی کو مروّج کرنے کی کمیٹی (ناگری پرچار سبھا) کو کئی بار اچھی رقمیں دان دے چکے تھے۔ پنڈا پجاریوں کے نام سے چڑتے تھے، قابلِ ملامت بھیک دینے کی نا موری پر ایک پم فلیٹ بھی چھپوایا تھا۔ لبرل خیالوں کے لیے شہر میں ان کی شہرت تھی۔ مکولال مارے موٹاپے کے جگہ سے ہل نہ سکتے تھے گردھاری داس گٹھیلے آدمی تھے اور شہر کے جم نے زیم کے چیف ہی نہ تھے، اچھے شہسوار اور نشانے باز تھے۔

ایک لمحہ تو وہ دیوکمار کے منہ کی طرف دیکھتے رہے، ان کا مقصد کیا ہے، یہ سمجھ ہی میں نہ آیا۔ پھر خیال آیا، بے چارے مالی مشکل میں ہوں گے، اس سے عقل جاتی رہی ہے۔ بے تکی باتیں کر رہے ہیں۔ دیوکمار کے چہرے پر فتح کا غرور دیکھ کر ان کا یہ خیال اور مضبوط ہو گیا۔

سنہری عینک اُتار کر میز پر رکھ کر لطف کے انداز سے بولے: ''کہیے گھر میں سب خیریت تو ہے؟''

دیوکمار نے بغاوت کے انداز سے کہا: ''جی ہاں، سب آپ کی مہربانی ہے۔''

''بڑا لڑکا تو وکالت کر رہا ہے نا؟''

''مگر چلتی نہ ہوئی اور آپ کی کتابیں بھی آج کل کم بکتی ہوں گی۔ یہ دیش کی بدنصیبی ہے کہ آپ جیسے سرسوتی (علم و ہنر کی دیوی) کے بیٹوں کی یہ بے قدری۔ آپ یوروپ میں ہوتے تو آج لاکھوں کے مالک ہوتے۔''

''آپ جانتے ہیں، میں لکشمی (دولت کی دیوی) کے پجاریوں میں نہیں ہوں۔''

''مالی مشکل میں تو ہوں گے ہی۔ مجھ سے جو کچھ سیوا آپ کہیں اس کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تو فخر ہے کہ آپ جیسے دانشور شخص سے میرا تعارف ہے۔ آپ کی کچھ سیوا کرنا میرے لیے عزّت کی بات ہوگی۔''

دیوکمار ایسے موقعوں پر عجز کے پتلے بن جاتے تھے۔ جاں نثاری اور تعریف کے بدلے کوئی ان کا سب کچھ لے سکتا تھا۔ ایک لکھ پتی آدمی اور وہ بھی ادب کا عاشق جب ان کی اتنی عزّت کرتا ہے تو اس سے جائداد یا لین دین کی بات کرنا انھیں شرم کی بات معلوم ہوا۔ بولے: ''آپ کی فیاضی ہے جو مجھے اس لائق سمجھتے ہیں۔''

''میں نے سمجھا نہیں آپ کس جائداد کی بات کر رہے تھے۔''

دیوکمار شرماتے ہوئے بولے: ''اجی وہی، جو سیٹھ مکولال نے مجھ سے لکھوائی تھی۔''

"اچھا تو اس کے بارے میں کوئی نئی بات ہے؟"

"اسی معاملے میں لڑکے آپ کے اوپر کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں۔ میں نے بہت سمجھایا، مگر مانتے نہیں۔ آپ کے پاس اسی لیے آیا تھا کہ کچھ لے دے کر سمجھوتا کر لیجیے، معاملہ عدالت میں کیوں جائے؟ ناحق دونوں زیر بار ہوں گے۔"

گردھاری داس کا ذہین مروّت دار چہرہ کٹھور ہو گیا۔ جن مہاجنی پنجوں کو انھوں نے مروت کی نرم گدی میں چھپا رکھا تھا، وہ یہ کھٹکا پاتے ہی وحشی اور تیز ہو کر باہر نکل آئے۔

غصّے کو دباتے ہوئے بولے: "آپ کو مجھے سمجھانے کے لیے یہاں آنے کی تکلیف اُٹھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان لڑکوں ہی کو سمجھانا چاہیے تھا۔"

"انھیں تو میں سمجھا چکا۔"

"تو جا کر سکون سے بیٹھیے، میں اپنے حقوں کے لیے لڑنا جانتا ہوں۔ اگر ان لوگوں کے دماغ میں قانون کی گرمی کا اثر ہو گیا ہے تو اس کی دوا میرے پاس ہے۔"

اب دیوکمار کی ادبی عاجزی بھی غیر متزلزل نہ رہ سکی۔ جیسے لڑائی کا پیغام منظور کرتے ہوئے بولے: "مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے وہ ملکیت دو لاکھ سے کم کی نہیں ہے۔"

"دو لاکھ کی نہیں، دس لاکھ کی ہو، آپ سے سروکار نہیں۔"

"آپ نے مجھے بیس ہزار ہی تو دیے تھے۔"

"آپ کو اتنا قانون تو معلوم ہی ہوگا، حالانکہ کبھی آپ عدالت میں نہیں گئے، کہ جو چیز بک جاتی ہے وہ قانوناً کسی دام پر بھی واپس نہیں کی جاتی۔ اگر اس نئے قاعدے کو مان لیا جائے تو اس شہر میں مہاجن نہ نظر آئیں۔" کچھ دیر تک سوال جواب ہوتا رہا اور لڑنے والے کتّوں کی طرح دونوں بھلے آدمی غرّاتے، دانت نکالتے، کھونکیاتے رہے۔ آخر دونوں لڑ ہی گئے۔

گردھاری داس نے غضبناک ہو کر کہا "مجھے آپ سے ایسی اُمید نہیں تھی۔"

دیوکمار نے بھی چھڑی اُٹھا کر کہا: "مجھے بھی نہ معلوم تھا کہ آپ کی غرض کا پیٹ اتنا گہرا ہے۔"

"آپ اپنی مکمل تباہی کرنے جا رہے ہیں۔"

"کچھ پروا نہیں۔"

دیوکمار وہاں سے چلے تو ماگھ کی اس اندھیری رات کی بے رحم ٹھنڈ میں بھی انھیں پسینہ آ رہا تھا۔ فتح کا ایسا گھمنڈ اپنے جیون میں انھیں کبھی نہ ہوا تھا۔ انھوں نے عقلی دلائل میں تو بہتوں پر فتح پائی تھی۔ یہ فتح تھی زندگی میں ایک نئی نفسانی تحریک، ایک نئی طاقت کی صبح۔ اسی

www.taemeernews.com

رات کو سنہا اور سنت کمار نے ایک بار پھر دیو کمار پر زور ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں آ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ دیو کمار نے تحریک دینے والے جذبے سے کہا: "تم لوگوں نے ابھی تک مقدمہ دائر نہیں کیا۔ ناحق کیوں دیر کر رہے ہو؟"

سنت کمار کے سوکھے ہوئے نا اُمید دل میں مسرت کی آندھی سی آ گئی۔ کیا سچ کہیں ایشور ہے، جس پر اسے کبھی وشواس نہیں ہوا؟ ضرور کوئی دیوی شکتی ہے۔ بھیک مانگنے آئے تھے من چاہی مراد مل گئی۔

بولا: "آپ ہی کی اجازت کا انتظار تھا۔"

"میں بڑی خوشی سے اجازت دیتا ہوں۔ میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔"

انھوں نے گردھر داس سے جو باتیں ہوئی تھیں، وہ کہہ سنائیں۔

سنہا نے ناک پھلا کر کہا: "جب آپ کی دُعا ہے تو ہماری فتح ہے۔ انھیں اپنے دھن کا گھمنڈ ہوگا، مگر یہاں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔"

سنت کمار ایسا خوش تھا گویا آدھی منزل طے ہو گئی۔

بولا: "آپ نے نہایت مناسب جواب دیا۔"

سنہا نے تنی ہوئی ڈھول کی سی آواز میں چوٹ ماری "ایسے ایسے سیٹھوں کو انگلیوں پر نچاتے ہیں یہاں۔"

سنت کمار سپنا دیکھنے لگے۔ "یہیں ہم دونوں کے بنگلے ہوں گے دوست۔"

"یہاں کیوں، سول لائنز میں بنیں گے۔"

"اندازاً کتنے دن میں فیصلہ ہو جائے گا؟"

"چھے مہینے کے اندر۔"

"بابو جی کے نام سے سرسوتی مندر بنوائیں گے۔"

مگر دشواری تھی روپے کہاں سے آئیں۔ دیو کمار قانع آدمی تھے۔ دھن کی کبھی پوجا نہیں کی۔ کبھی اتنا زیادہ ملا ہی نہیں کہ پس انداز کرتے۔ کسی مہینے میں پچاس جمع ہوتے تو دوسرے مہینے میں خرچ ہو جاتے۔ اپنی ساری کتابوں کا کاپی رائٹ بیچ کر انھیں پانچ ہزار ملے تھے۔ وہ انھوں نے پنکجا کے بیاہ کے لیے رکھ دیے تھے۔ اب ایسی کوئی صورت نہیں تھی۔ جہاں سے کوئی بڑی رقم ملتی۔ انھوں نے سمجھا تھا سنت کمار گھر کا خرچ اُٹھالے گا اور وہ کچھ دن آرام سے بیٹھیں گے یا گھومیں گے۔ لیکن اتنا بڑا منصوبہ باندھ کر اب سکون سے کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ ان کے عقیدت مندوں کی کافی تعداد تھی۔ دو چار راجہ بھی ان کے عقیدت مندوں میں تھے جن کی یہ

www.taemeernews.com

پرانی آرزو تھی کہ دیوکمار جی ان کے گھر کو اپنے قدموں سے پاک کریں اور وہ اپنی عقیدت ان کے قدموں میں نذر گزاریں۔ مگر دیوکمار تھے کہ کبھی کسی دربار میں قدم نہیں رکھا، اب اپنے چاہنے والوں اور عقیدت مندوں سے مالی مشکل کا رونا رو رہے تھے اور کھلے لفظوں میں مدد کی بھیک مانگ رہے تھے۔ وہ عزتِ نفس جیسے کسی قبر میں سوگئی ہو۔

اور جلد ہی اس کا راستہ نکل آیا۔ ایک عقیدت مند نے تجویز کیا کہ دیوکمار جی کی ساٹھویں سالگرہ دھوم دھام سے منائی جائے اور انھیں ادب دوستوں کی طرف سے ایک تھیلی نذر کی جائے۔ کیا یہ شرم اور دکھ کی بات نہیں ہے کہ جس برگزیدہ انسان نے اپنی زندگی کے چالیس برس ادبی خدمت پر نثار کردیے، وہ اس بڑھاپے میں بھی مالی فکروں سے آزاد نہ ہو؟ ادب یوں نہیں پھل پھول سکتا۔ جب تک ہم اپنے ادب کی خدمت کرنے والوں کا ٹھوس سواگت کرنا نہیں سیکھیں گے، ادب کبھی ترقی نہ کرے گا اور دوسرے اخباروں نے کھلے گلے سے اس کی تائید کی۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ نمایاں ہستیاں بھی جن کی دیوکمار سے پرانی، ادبی، اندرونی ان بن تھی، وہ بھی اس موقع پر فیاضی سے ساتھ دینے لگیں۔ بات چل پڑی۔ ایک کمیٹی بن گئی۔ ایک راجہ صاحب اس کے صدر بن گئے۔ مسٹر سنہا نے کبھی دیوکمار کی کوئی کتاب نہ پڑھی تھی، پر وہ بھی اس تحریک میں خاص حصہ لیتے تھے۔ مس کامت اور مس ملک کی طرف سے بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ عورتوں کو مردوں سے پیچھے نہ رہنا چاہیے۔

جیٹھ میں تاریخ طے ہوئی۔ شہر کے انٹرمیڈیٹ کالج میں اس جوبلی کی تیاریاں ہونے لگیں، آخری تاریخ آ گئی۔ آج شام کو وہ جوبلی ہوگی۔ دور دور سے ادب کے عاشق آئے ہیں۔ سوراؤں کے کنور صاحب وہ تھیلی پیش کریں گے۔ توقع سے زیادہ شرفا جمع ہوگئے ہیں۔ لیکچر ہوں گے، گانا ہوگا، ڈراما کھیلا جائے گا، اس خوشی کا کھانا ہوگا، مشاعرہ ہوگا۔ شہر میں دیواروں پر پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ اجلاس سے متعلق جو سوسائٹی ہے اس میں اچھی ہلچل ہے۔ راجا صاحب صدرِ محفل ہیں۔

دیوکمار کو تماشہ بننے سے نفرت تھی۔ پبلک جلسوں میں بھی کم آتے جاتے تھے۔ لیکن آج تو برات کا دولہا بننا ہی پڑے گا۔ جیوں جیوں جلسے میں جانے کا وقت نزدیک آتا تھا ان کے دل پر ایک طرح کی اُداسی چھائی جاتی تھی۔ جس وقت تھیلی ان کی نذر کی جائے گی اور وہ ہاتھ بڑھا کر لیں گے وہ سین دیکھنے میں کیسا سبکی والا ہوگا۔ جس نے کبھی دھن کے لیے ہاتھ نہیں پھیلائے وہ اس آخری وقت میں دوسروں کا دان لے؟ یہ دان ہی ہے، اور کچھ نہیں۔ ایک لمحے

www.taemeernews.com

کے لیے ان کی خودداری باغی بن گئی۔ اس موقع پر ان کو زیب تو یہی دیتا ہے۔ وہ تھیلی پاتے ہی اسی جگہ کسی تمام انسانوں کے لیے قائم کیے ہوئے فنڈ کو دے دیں۔ ان کے جیون کے آئیڈیل کے بھی مطابق ہوگا۔ لوگ ان سے یہی اُمید رکھتے ہیں، اسی میں ان کی قدر و منزلت ہے۔

وہ پنڈال میں پہنچے تو ان کے چہرے پر خوشی کی جھلک نہ تھی، وہ کچھ کھسیانے سے لگتے تھے۔ نیک نامی کی آرزو ایک طرف کھینچتی تھی، لالچ دوسری طرف، دل کو کیسے سمجھائیں کہ یہ دان، دان نہیں ان کا حق ہے۔ لوگ ہنسیں گے، آخر پیسے پر ٹوٹ پڑا۔ ان کی زندگی عقل کی زندگی تھی، اور عقل جو کچھ کرتی ہے اصول پر کس کر کرتی ہے۔ اصول کا سہارا مل جائے تو پھر وہ دنیا کی پروا نہیں کرتی۔

وہ پہنچے تو استقبال ہوا، خوشی کا ترانہ ہوا، لیکچر ہونے لگے جن میں ان کی تعریف کی گئی تھی مگر ان کی حالت اس آدمی کی سی ہو رہی تھی جس کے سر میں درد ہو رہا ہو۔ انھیں اس وقت اس درد کی دوا چاہیے۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ سب ہی عالم ہیں، مگر ان کی تنقید کتنی اُتھلی، کتنی سطحی ہے جیسے کوئی اُن کے پیغام کو سمجھا ہی نہیں۔ جیسے یہ ساری واہ واہ اور ساری شہرت کی نغمہ سرائی اندھی عقیدت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کوئی بھی انھیں نہیں سمجھا۔ کس جذبے نے چالیس سال تک انھیں سنبھالے رکھا، وہ کون سی دھوپ تھی جس کی روشنی کبھی ماند نہیں ہوئی۔

اچانک انھیں ایک سہارا مل گیا اور ان کے فکرمند، پیلے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی، یہ دان نہیں پراویڈنٹ فنڈ ہے جو آج تک ان کی آمدنی سے کٹتا رہا ہے۔ سرکاری نوکری میں لوگ پینشن پاتے ہیں، کیا وہ خیرات ہے؟ انھوں نے جنتا کی سیوا کی ہے، تن من سے کی ہے، اس دھن سے کی ہے، جو بڑی سے بڑی تنخواہ سے بھی نہ کی جا سکتی تھی۔ پینشن لینے میں کیوں شرم آئے؟

راجا صاحب نے جب تھیلی نذر کی تو دیو کمار کے چہرے پر غرور تھا، فخر تھا، فتح تھی۔

OO

پریم چند کی آپ بیتی

مدن گوپال

مدن گوپال

ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲